ان الابرار لفی نعیم

لطائفِ سورۂ یوسف

جلد دوم

افادات

خطیب الامت حضرت مولانا ابرار احمد صاحب دھلیوی نور اللہ مرقدہٗ

سابق شیخ الحدیث جامعہ فلاح دارین، ترکیسر، سورت، گجرات

مرتّب

مولانا عبد السلام ابراہیم مارویا، لاجپوری (لندن)

خطیب مسجد قبا، اسٹامفورڈ ہل، لندن

ناشر

مکتبہ سلیمانیہ، اجمیری محلّہ، لاجپور، سورت

کتاب کا نام	:	لطائفِ سورۂ یوسف، جلد دوم
مرتب کا نام	:	مولانا عبدالسلام ابراہیم مارویا، لاجپوری (لندن)
افادات	:	حضرت مولانا ابرار احمد صاحب دھلیوی نوراللہ مرقدہ سابق شیخ الحدیث جامعہ فلاح دارین، ترکیسر، گجرات
ناشر	:	مکتبہ سلیمانیہ، اجمیری محلّہ، لاجپور، سورت
مطبع	:	بارڈولی والا پرنٹرس، سورت
ایڈیشن	:	پہلا ایڈیشن
سن طباعت	:	۱۳ جمادی الاول ۱۴۳۳ھ بمطابق ۲۵ مارچ ۲۰۱۳ء
صفحات	:	۳۰۱
تعداد	:	۵۰۰

ملنے کے پتے

(۱) مکتبہ سلیمانیہ، اجمیری محلّہ، لاجپور، سورت۔

(۲) مدرسہ اسلامیہ صوفی باغ، سورت۔

A.SALAM MARVIA
23 FLAT B SPRING FIELD GARDENS
LONDON E5 9ER.

PH:02088061051

فہرست

درس نمبر (۱۵)

درس نمبر (۱۶)

درس نمبر (۱۷)

درس نمبر (۱۸)

درس نمبر (۱۹)

درس نمبر (۲۰)

درس نمبر (۲۱)

درس نمبر (۲۲)

درس نمبر (۲۳)

درس نمبر (۲۴)

درس نمبر(۲۵)

درس نمبر (۲۶)

درس نمبر (۲۷)

درس نمبر (۲۸)

درس نمبر (۲۹)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتساب

میں اپنی اس حقیر سی کاوش کو اپنے اساتذہ نیز اپنے والدین ماجدین کے نام منسوب کرنا باعث سعادت سمجھتا ہوں جن کی آغوش تربیت میں اس ناکارہ نے پرورش پائی ،اور جن کی دعاؤں کے نتیجہ میں اللہ تعالی نے دینی خدمت میں لگنے کی سعادت بخشی ،اور جن کا سایہ عاطفت (میری والدہ) میرے لئے قیمتی سرمایہ ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ذکراس پَری وَش کا اور پھر بیان اُن کا

پورے قرآن کریم میں سورۂ یوسف ایک تنہا سورت ہے جس کے واقعات کی تمام کڑیاں یکجا طور پر جڑی ہوئی موجود ہیں۔ ورنہ قرآنی قصص و واقعات کا عام طرز و اسلوب اس سے بالکل مختلف ہے اور ہدایتِ انسانی اور عبرت و موعظت کے لئے جس جزء کی جہاں ضرورت اور مناسبت محسوس کی جاسکتی ہے وہ وہاں پوری خوبی اور معانی و بلاغت کی رعایت کے ساتھ موجود ہے۔ اس فرق کی وجہ سے عمومی طور پر قاریٔ قرآنِ کریم سورۂ یوسف کی واقعاتی دلچسپیوں اور درمیانی اجزاء کی دلفریبیوں میں کھوجاتا ہے اور ہدایتِ ربّانی کی عبرت و نصیحت پذیریوں کی بنیادی تذکیری حقیقتوں سے صرفِ نظر کر جاتا ہے جو قرآن کریم کے مقصدِ نزول سے دور کر دیتا ہے۔

لیکن حق تعالیٰ شانہ نے جس بالغ نظر شخصیت کو رموزِ شریعت اور اسرارِ طریقت کا جامع بنایا ہو اور جس کی زرف نگاہی قرآن کریم کے بحرِ ذخّار میں غوّاصی کر کے معانی کے گوہرِ آبدار نکالنا جانتی ہو وہ بلا ریب ''سورۂ یوسف،، کے واقعاتی حسن و جمال سے زیادہ اسکے معنوی پہلوؤں کی وسعت اور پہنائیوں کی سیر کر کے ہدایتِ ربّانی کے حقیقی خدّ وخال سے روشناس کرنے کا صحیح طریقہ اور سلیقہ جانتی ہے۔

حضرت اقدس مولانا ابرار احمد صاحب دھلیوی رحمہ اللہ ایک طرف محدث، مفسر، متکلم، صوفی اور واعظ تھے تو دوسری طرف حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کی نسبتِ خلافت سے حکمتِ شریعت اور رازِ طریقت سے بھرپور حصہ ملا ہوا تھا۔ وہ صرف آیاتِ کتاب کے عالم نہیں تھے بلکہ کائناتِ کتاب کے

گلزارِ معانی کے رنگ و بو کو اپنے دل ودماغ میں بسائے ہوئے تھے چنانچہ جب وہ ''سورۂ یوسف،، کے تفسیری نِکات اوراس کی معنویت اوراسکے باطنی حقائق ومعارف سے پردہ اٹھاتے تھے تو لگتا تھا کہ ''حسنِ یوسف،، اپنی جسمانی اور روحانی جلوہ آفرینیوں کے ساتھ متشکل ہوگیا ہے زلیخا کی سہیلیوں کی زبانوں سے نہیں بلکہ مجلسِ تفسیر کے فرزانوں کی زبانوں سے بے ساختہ ''ما ھذا بشرا، ان ھذا الا ملک کریم، ، کی صدائے آفریں نکل رہی ہے۔

دراصل قرآنِ کریم کے لئے حدیث شریف میں ''لکل آیۃ منھا ظھر و بطن ،، کا جو حقیقت افروز جملہ وارد ہے وہ حضرت مولانا ابراراحمد صاحب رحمہ اللہ جیسے رمز شناس۔ نکتہ آفریں اور قرآنی الفاظ ومعانی کے رازداروں اور باطنی علوم ومعارف کے شناور کے سامنے حقائق دلکش پیکر بن کر دل ونگاہ کو دعوتِ جمال دینے لگتا تھا اور فیضِ قدرت کی طرف سے یہ عطیہ خصوصی طور پر حضرت موصوف کو ملا ہوا تھا۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ شریعت وطریقت کے درمیانی ربط وتعلق اور دونوں کی جامعیت کو نبھانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، شاعرِ حکیم نے بالکل سچ کہا ہے ؎

در کفے جام شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہو سنا کے نہ داند جام و سنداں باختن

حضرت مولانا ابراراحمد صاحب رحمہ اللہ کی ''لطائف سورۂ یوسف،، کو پڑھ کر جب دل ونظر الفاظ کے حسنِ ترتیب وتنظیم اور معانی کے دلکش ودلنشیں اداؤں میں کھو جاتا ہے تو اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب حضرت کی مجلسِ تفسیر میں آمنے سامنے بیٹھ کر حضرت کی زبان و بیان کی شیرینی اور واقعۂ یوسف و زلیخا کی معنی آفرینی حضرت کی شخصیت کے جمال وکمال اوران کے مخصوص طبعی مزاج میں ڈھل کر سامعین پر کیسا سحر

انگیز منظر پیش کرتا ہوگا اس کو صرف دیکھنے والوں نے دیکھا ہوگا بیان کرنے والے اس کی پوری کیفیت کو بیان نہیں کر سکتے اس لئے کہ کیفیاتِ باطنی کی وسعت و پہنائی لفظوں کی تنگنائیوں میں نہیں سما سکتی۔

میرا دل چاہتا ہے کہ حضرت مولانا عبد السلام صاحب مارویا مدّ ظلہم کو دلی مبارکباد پیش کروں کہ وہ لطائف یوسفی کے موتیوں کو اپنے حسنِ جامعیت اور ترتیب کی لڑی میں بڑی خوبی اور سلیقے سے پرونے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

حضرت مولانا عبد السلام صاحب دام مجدہم حضرت اقدس مولانا ابرار احمد صاحب دھلیوی رحمہ اللہ کے علوم و معارف اور احسان وسلوک کے گنج گرانمایہ کو عام و تام کرنے کی انتہائی قابلِ قدر خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اور مجھے لگتا ہے کہ جیسے اقبال و غالب کی شاعرانہ خصوصیات کے آشکارا کرنے پر کچھ شارحین کو ''ماہرِ اقبالیات،، اور ''ماہرِ غالبیات،، کہا جاتا ہے اسی طرح مولانا عبد السلام صاحب مارویا کو ''ماہرِ ابراریات،، کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

تفسیر سورۂ یوسف بہت سے علماء وفضلاء کی دلچسپیوں کا مرکز رہا ہے انگلینڈ اور کناڈا وغیرہ ملکوں میں وہاں کے دینی حلقوں میں کچھ خاص اہل علم کا رمضان المبارک کے سلسلۂ بیانات میں شامل رہنے اور سامعین کی خصوصی شرکتوں کو دیکھنے کا موقع ملا ہے مگر حضرت مولانا ابرار احمد صاحب رحمہ اللہ کی مجلس تفسیر سورۂ یوسف میں ان کے جلوۂ جمال، رنگِ کمال، باطنی حال وقال اور ظاہری خدّ وخال کا حسین امتزاج کچھ اس طرح نکھر کر سامنے آجاتا تھا کہ غالب کے لفظوں میں کہنا پڑتا ہے۔

ذکر اُس پری وَش کا اور پھر بیان اُن کا
بن گیا رقیب آخر جو تھا رازدار اُن کا

جن کج فہموں اور حقیقت نا شناس روشن خیالوں کو سورۂ یوسف کی معنویت نظر نہیں آتی وہ آئیں اور حضرت مولانا ابرار احمد صاحب رحمہ اللہ کی ''لطائف سورۂ یوسف،، کا مطالعہ کریں تو ان کی آنکھیں خود بخود کھل جائیں گی اور وہ بھی یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ۔

بہارِ عالم حُسنش دل و جان تازہ می دارد
برنگ اصحابِ صورت را ببو اربابِ معنی را

میری دعا ہے کہ اللہ تعالی اپنے لطف و کرم سے حضرت مولانا عبد السلام صاحب مارویا مدّ ظلہم کی اس سعیٔ بلیغ کو مقبول و مشکور فرمائے۔

(حضرت مولانا) محفوظ الرحمٰن شاہین جمالی
(شیخ الحدیث) مدرسہ امداد الاسلام صدر بازار میرٹھ، یوپی
نزیل مدینہ مسجد کلیپٹن، لندن
۲۰ رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ بمطابق ۸/اگست ۲۰۱۲ء

پیش لفظ

الحمد لله رب العلمين ، والصلوٰة والسلام على رسوله سيدنا محمد، خاتم النبيين وعلىٰ آلهِ واصحابه اجمعين. اما بعد!

محترم قارئین! قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے اور علم وحکمت کا بے پایاں خزانہ ہے، علماء نے لکھا ہے کہ نوعِ انسانی جس حد تک اس کے قریب ہوگی اسی قدر اس کے لئے سعادت وفلاح کے دروازے کھلیں گے اور قرآنِ کریم یہ واحد کتاب ہے جس کا پڑھنا، پڑھانا، سننا، سنانا، دیکھنا، سمجھنا، سمجھانا عبادت ہے اور چونکہ قرآنِ کریم کو سمجھنا اور سمجھانا اور اس کی تعلیمات کے مطابق فکر وعمل کی اصلاح کرنا ایک مسلمان کیلئے از حد ضروری ہے، اسی لئے علماءِ کرام، سلفِ صالحین کے طریقہ پر عمل کرتے ہوئے قرآنِ کریم کی تشریح وتفسیر عوام الناس کے سامنے کرتے رہے ہیں اور اس سلسلہ کی بعض درسی تقریریں چھپ بھی چکی ہیں، یہ بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

حضرت مولانا سید ابرار احمد صاحب دھلیوی رحمہ اللہ سابق شیخ الحدیث جامعہ فلاحِ دارین، ترکیسر، گجرات وخلیفۂ اجل حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ وداماد فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی سید عبد الرحیم صاحب لاجپوری رحمہ اللہ نے رمضان المبارک ۱۹۸۹ء میں مدینہ مسجد، کلپٹن، لندن میں قیام فرمایا تھا، اور ''سورۂ یوسف کی تفسیر'' بیان فرمائی تھی، الحمد للہ اسکی پہلی جلد منظرِ عام پر آچکی ہے، اب اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور توفیق وعنایت سے اسکی دوسری اور آخری جلد ''جلد دوم'' حاضرِ خدمت ہیں، جلد اول میں کل چودہ دروس تھے، اس جلد میں کل پندرہ دروس ہیں۔

شروع میں چوبیس دروس ہی مجھے دستیاب ہوئے تھے بعد میں الحمد للہ مزید پانچ دروس حضرت مفتی یوسف ساچا صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی طرف سے موصول ہوئے اللہ تعالیٰ انہیں اس کا بہترین صلہ دارین میں نصیب فرمائیں، اس طرح یہ کل

انتیس دروس ہو گئے۔

میں نے اپنی حد تک پوری کوشش کی ہے کہ اس میں کوئی غلطی نہ رہ جائے، مگر بہر حال انسان انسان ہے اور بقول حضرت مولانا ابرار احمد صاحب دھلیوی رحمہ اللہ نسیان کا مادہ خود انسان میں موجود ہے، لہٰذا اگر کوئی غلطی قارئین کو نظر آئے تو اس سے احقر کو مطلع فرمائے، تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح کر لی جائے۔ اور ہاں! اس غلطی کو میری کوتاہی سمجھا جائے کہ مجھ سے اسے قلمبند کرنے میں کوتاہی ہوگئی ہو، نہ کہ حضرت مولانا رحمہ اللہ کی ذات کی طرف اسے منسوب کیا جائے اور ان باتوں سے جن حضرات کو نفع پہنچے وہ خاص طور سے کچھ ایصالِ ثواب حضرت رحمہ اللہ کی روح کو پہنچا دیں اور احقر کے لیے دین پر استقامت کی دعا فرمائیں۔

اخیر میں میں حضرت مولانا اسماعیل صاحب سیتپونی دامت برکاتہم العالیہ اور حضرت مولانا قاری ناظر حسین صاحب ہتھوڑوی مدظلہ ہر دو حضرات کا بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے کئی اعذار کے باوجود میرے اصرار پر اپنا قیمتی وقت صرف کر کے اس پر نظرِ ثانی فرمائی اور جہاں کہیں حذف و اضافہ کی ضرورت محسوس ہوئی وہاں حذف و اضافہ کیا اور حق بات یہ ہے کہ ان کی محنت ہی کی وجہ سے یہ دروس منظرِ عام پر آ سکے اللہ تعالیٰ انہیں اس کا بہترین صلہ دارین میں نصیب فرمائیں۔ آمین۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

محتاجِ دعا

عبدالسلام ابراہیم مارویالا جپوری
کلپٹن، لندن، یو، کے

۲۰/ شعبان ۱۴۳۳ھ بمطابق ۱۰/ جولائی ۲۰۱۲ء

درس نمبر (۱۵)

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم،امابعد!

فاعوذ بالله من الشیطن الرجیم ، بسم الله الرحمن الرحیم☆

لقد کان فی یوسف واخوته آیٰت للسائلین☆

جہاں اندھیرا ہوتا ہے وہاں چراغ کی ضرورت پڑتی ہے

محترم حضرات! بات یہ چل رہی تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے برائی کا پلان بنایا اور یہ بات یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی آدمی اس عالم میں کرتا ہے اوپر کے عالم میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کر سکتے ، اگر کوئی کام اوپر کے عالم میں اللہ تعالیٰ کی منشا کے خلاف ہوتا ہے تو پھر اس کا ثمرہ بھی اس کے مطابق مرتب ہوتا ہے، چنانچہ ابلیس نے اوپر کے عالم میں تکبر کیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کی تو اسے مردود کر دیا گیا، امّاں حوّا اور حضرت آدم علیہ السلام سے ایک بات ہوئی تو انہیں بھی وہاں سے رخصت کر دیا گیا،تو معلوم ہوا کہ اوپر کے عالم میں نافرمانی حکم عدولی اور اللہ تعالیٰ کی منشا کے خلاف کوئی کام کر کے آدمی نہیں رہ سکتا۔اور یہ عالم ظلمانی ہے اس عالم میں گناہ،معصیت ،نافرمانی،شہوت اور نفس کے تقاضوں کے ساتھ انسانوں کی زندگیاں گذرتی ہیں اور یہ چیزیں اس عالم میں قابلِ برداشت ہیں اور آپ یہ جانتے ہیں کہ جہاں اندھیرا ہوتا ہے وہیں چراغ کی ضرورت ہوتی ہے، جہاں تاریکی اور ظلمت ہوتی ہے وہیں روشنی کی ضرورت ہوتی ہے،تو اوپر کے عالم میں اطاعت ہے اور فرمانبرداری کا نور موجود ہے اور اس عالم میں ظلمتیں اور تاریکیاں ہیں اس لئے اس عالم میں اطاعت کے نور کی ضرورت تھی اس لئے خلیفہ کا بسایا جانا یہیں مناسب تھا، چنانچہ اس لئے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجا تا کہ یہاں کی ظلمتیں نور سے بدل جائے اور یہاں پر

پاکیزہ اثرات پیدا ہوں۔

علم کی برکتیں

حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کا علم عطا فرما کر دنیا میں بھیجا اور اس کے نتیجہ میں تاجِ خلافت مرحمت فرمایا، امام رازی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ جل شانہ نے منطقِ طیر کا علم عطا فرمایا تھا وہ پرندوں کی بولی جانتے تھے اور یہی نہیں بلکہ ان کے صاحبزادے حضرت سلیمان علیہ السلام بھی پرندوں کی بولی جانتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی شان کہ ہوا کو اللہ تعالیٰ نے لطیف بنایا ہے اور لوہے کو ثقیل بنایا ہے، حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے اللہ تعالیٰ نے لوہے کو موم بنا دیا جو نہایت وزنی چیز ہے اور صاحبزادے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایسی حکومت دی کہ ان کے لئے ہوا مسخر کی گئی جب کہ ہوا نہایت لطیف اور نہایت ہلکی پھلکی شئ ہے، تو حق تعالیٰ نے ان دونوں پیغمبروں کو جو علم عطا فرمایا تھا اس کا اثر مادی طور پر یہ ظاہر ہوا کہ ایک کیلئے لوہا موم کر دیا گیا اور دوسرے کیلئے ہوا کو مسخر اور تابع کر دیا گیا، گویا لطیف اور ثقیل یعنی ہلکی اور وزنی دونوں قسم کی مخلوق ان کے تابع تھیں، حضرت سلیمان علیہ السلام ہوا کو حکم دیتے تو تخت اوپر چلتا تھا اور نیچے آنے کا حکم دیتے تو تخت نیچے آجاتا تھا، بلقیس کے پاس پہنچنے کیلئے ایک مہینہ کی مسافت تھی مگر آپ صبح چلتے تھے تو دوپہر تک آرام سے وہاں پہنچ جاتے تھے، تو یہ علمِ نبوت کی برکت تھی کہ حق تعالیٰ نے حسّی طور پر بھی یہ چیزیں انہیں نصیب فرمائی تھیں، یہاں ایک بات یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ جو بار بار اپنے علم وحکمت کا ذکر فرماتے ہیں وہ اس لئے تا کہ دنیا اس واقعہ کو سننے سے پہلے یہ بات اپنے ذہن میں بٹھالے کہ یہ واقعہ جو بیان کیا جا رہا ہے یہ صرف اندازے یا خیال وگمان کی بنیاد پر بیان کیا گیا ہو، یا اس کو حقیقت سے مطابقت نہ ہو اور وہ واقعہ پرفٹ نہ ہوتا ہو ایسی بات نہیں ہے، بلکہ یہ واقعہ علم

وحکمت کے کانٹے پہ تلا ہوا ہے اور اپنے اندر سچائی کو لئے ہوئے ہے اس لئے یہ صفت بیان کی گئی اور اللہ تعالیٰ کے کلام کا یہ ایک خاص طرز ہے کہ رب العلمین نے جہاں کہیں کوئی مضمون بیان کیا وہاں اس کے مناسب صفت کا تذکرہ فرمایا ہے، اس واقعہ کے بارے میں کسی کو یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ آپ ﷺ نے اپنی طرف سے اس میں کوئی بات کہی ہے، یا یہ واقعہ خیال وانداز ے سے بیان کیا ہے، اس لئے فرمایا کہ آپ کا رب علم وحکمت سے متصف ہے، ان کے خبر دینے کے نتیجہ میں آپ یہ واقعہ لوگوں کو بتا رہے ہے اور یہ واقعہ اپنے اندر بہت سے علوم وحِکم لئے ہوئے ہیں اور اس میں بڑے اسرار ورموز ہیں۔

قصۂ یوسف میں سائلین کیلئے بڑی عبرتیں ہیں

اسی لئے فرمایا کہ ”لقد کان فی یوسف واخوته آیت للسائلین“ بیشک یوسف علیہ السلام کی ذاتِ گرامی میں اور ان کے بھائیوں میں سوال کرنے والوں کیلئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں، جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا تھا کہ ایک قول کے مطابق سائلین سے مراد یہود ہیں اور ایک قول کے اعتبار سے مشرکین تھے اور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ نے بھی سوال کیا تھا اور تمام روایتوں میں تطبیق ممکن ہے، تو گویا اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ جو لوگ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات کو دریافت کررہے ہیں ایسے تمام پوچھنے والوں کے حق میں اس واقعہ میں بڑی عبرتیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے آیات کا لفظ ذکر فرمایا ہے یعنی اس میں بڑی بڑی نشانیاں ہیں جن کو ہم جب اصل واقعہ شروع ہوگا تب ذکر کریں گے انشاء اللہ اور بتائیں گے کہ اس واقعہ سے کیسے کیسے نتائج اور کیسی کیسی عبرتیں نکلتی ہیں۔

جوہری ہی جوہر کی حقیقت کو پہچانتا ہے

اللہ تعالیٰ قصہ شروع فرمارہے ہیں، چنانچہ فرمایا ”اذقالوا لیوسف واخوہ

احب الی ابینا منا ونحن عصبة ''حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادوں میں بنیا مین اور یوسف علیہ السلام یہ دونوں ماں شریک اور باپ شریک یعنی حقیقی بھائی تھے اور حضرت یوسف علیہ السلام سے حضرت یعقوب علیہ السلام کو بڑی محبت تھی اور دوسرے دس بیٹوں کی ماں الگ تھی باپ تو سب کے حضرت یعقوب علیہ السلام تھے ہی، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی فراست سے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں ان کے خواب کے ذریعہ یہ محسوس فرمالیا تھا کہ یوسف میں رشدو ہدایت اور خوبیوں کے آثار ہیں اور بعد میں چل کر انشاء اللہ ان کا ظہور ہوگا، اس لئے حضرت یعقوب علیہ السلام کی توجہ ان پر بہت زیادہ تھی، آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ جوہری جو ہوتا ہے وہ جوہر کی قدرو قیمت پہچان لیتا ہے، کسی صرّاف یا کسی جوہری کے پاس جو ماہر ہو آپ ایک خوبصورت شیشہ لے جائیں جو بہت چمکدار ہو اور آپ خوش ہوتے ہوں اور سمجھتے ہوں کہ بہت قیمتی ہے اس کی قیمت بہت ملے گی، مگر جوہری جس کی نظر حقیقت پر ہے وہ دیکھتے ہی یہ کہہ دے گا کہ یہ بہت معمولی قیمت کا ہے۔ اور اگر آپ بیش قیمت یاقوت لے جائیں جس میں بظاہر زیادہ چمک نہ ہو مگر جوہری اس کو دیکھ کر فوراً سمجھ لے گا کہ یہ لاکھوں کروڑوں کا ہیرا ہے اگرچہ ایک عام آدمی اسے زیادہ قیمتی نہ سمجھے مگر نظر رکھنے والا اور تاڑنے والا حقیقت کو جان لیتا ہے۔

تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

یا جیسے کسی نے کہا ہے۔

خط کا مضمون بھانپ لیتا ہوں لفافہ دیکھ کر

پھر پیغمبر کی فراست کا کیا پوچھنا؟ بہر حال حضرت یوسف علیہ السلام میں موجود خوبیوں کی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی توجہ ان کی طرف زیادہ تھی جس کے نتیجہ

میں بھائیوں میں حسد کی ایک کیفیت پیدا ہوئی، نیز حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری حسن بھی دیا تھا اور باطنی حسن بھی دیا تھا۔

حسنِ یوسف کی ایک جھلک

ظاہری حسن کے باب میں نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا کہ سارے عالم میں جتنا حسن ہے اس میں شطرِ حسن اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو عطا فرمایا ہے (خطبات حکیم الاسلام ج ۳ ص ۳۱۴) شطرِ حسن کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں ایک مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک تہائی (حوالہ بالا) اور شطرِ حسن کا دوسرا مطلب ہے دو تہائی، تو اللہ تعالیٰ نے اتنا حسن اکیلے حضرت یوسف علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا اور بقیہ حسن پورے عالم میں تقسیم فرمایا یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر قیامت کی صبح تک جتنے لوگ پیدا ہوں گے اور ان میں جتنے باجمال اور حسین وجمیل پیدا ہوں گے ان تمام حسینوں اور جمیلوں میں حق تعالیٰ نے آدھا حسن حضرت یوسف علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا اس کا اثر یہ تھا کہ روح المعانی میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اندھیری گلیوں سے گذرتے تھے تو ان کے رخسار کی چمک سے گلیوں کے دونوں کونے روشن ہو جاتے تھے اور لکھا ہے کہ اگر تاریک مکان میں سوئی گری ہوتی اور حضرت یوسف علیہ السلام جھک جاتے تو وہ سوئی نظر آجاتی تھی (روح المعانی) بہر حال آپ انتہائی حسین وجمیل تھے اور یہ کیفیت تھی کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کھانا نگلتے تھے تو وہ کھانا حلق سے اترتا ہوا محسوس ہوتا تھا (حوالہ بالا)۔

بڑوں کا مسئلہ بڑا ہوتا ہے

بچپن میں ایک مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام نے آئینہ دیکھا تو چونکہ اس زمانہ میں غلام فروخت ہوتے تھے اس لئے آئینہ دیکھ کر آپ کے منہ سے یہ جملہ نکلا کہ اگر مجھے فروخت کیا جائے تو میری قیمت شاید ہی کوئی ادا کر سکے، کسی سلطانِ وقت

کے بس کی بات نہ ہوگی کہ میری قیمت ادا کرے، یہ جملہ چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے منہ سے نکلا تھا اور بڑوں کا مسئلہ بڑا ہوتا ہے اس وجہ سے جب بھائیوں نے انہیں قافلہ والوں کو فروخت کیا تو بائیس (۲۲) چونّیوں میں انہیں فروخت کیا ہے (قرآن کریم انسائیکلوپیڈیا ص۶۹۸) ''وشروہ بثمن بخس دراھم معدودۃ، وکانوا فیہ من الزاھدین' (یوسف، آیت: ۲۰) گویا حضرت یوسف علیہ السلام کے منہ سے ایک بات نکلی اس کا نتیجہ یہ ہوا، بہر حال کہنے کا منشا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بہت جمال عطا فرمایا تھا۔

متکلم مستثنیٰ ہوتا ہے

اب یہاں سوال یہ ہے کہ آدھا حسن سارے عالم کو اور آدھا حسن حضرت یوسف علیہ السلام کو تو جنابِ نبیٔ کریم ﷺ کا حسن کہاں جائے گا؟

اس کا جواب شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ نے یہ دیا ہے کہ متکلم مستثنیٰ ہوتا ہے یعنی جو کلام کرتا ہے وہ بحث سے خارج ہوتا ہے اس لئے کہ وہ ایک جج مینٹ اور فیصلہ دیتا ہے، نبیٔ کریم ﷺ اپنے حسن کے باب میں ابھی بحث نہیں کر رہے ہیں بس یہ بتلانا مقصود ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن کی یہ شان ہے اور دوسرے انسانوں کے حسن کی یہ کیفیت ہے۔

برادرانِ یوسف کے دیر سے آنے کی وجہ

بہر حال بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالا اور عشاء کے وقت واپس آکر اپنے والد سے یہ بات کہی کہ یوسف کو بھیڑیے نے کھالیا اور بھائیوں کا عام معمول یہ تھا کہ مغرب سے پہلے آجاتے تھے مگر اس روز عشاء کے وقت آئے تا کہ چہرے پر جو جھوٹ اور تصنّع کے آثار ہیں وہ چھپے رہے اور دیر سے اس لئے بھی آئے

تاکہ والد صاحب پہلے ہی سمجھ لیں کہ کوئی حادثہ ہوا ہوگا۔(تفسیر مظہری ج۴ص۱۴۶) خیر آنے کے بعد انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کا کرتہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے پیش کیا اور انہوں نے یہ کیا تھا کہ ایک بکری ذبح کر کے اس کا خون اس کرتہ پر لگا دیا تھا(معارف القرآن ج۵ص۲۵) بہر حال آکر کہا کہ ابا جان! یوسف کو بھیڑیئے نے کھالیا، جب بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے حضرت یعقوب علیہ السلام سے اجازت حاصل کر رہے تھے تو اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں سے کہا تھا کہ تم اسکو جنگل لے جانا تو چاہتے ہو مگر مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں بھیڑیا اس کو نہ کھالے، اس لئے بھائیوں نے آکر یہی کہا کہ ابا جان! ہم لگے کھیلنے اور مسابقت کرنے اسکا ترجمہ بعض لوگوں نے کبڈّی کیا ہے مگر وہ صحیح نہیں ہے، مسابقت کے معنی آتے ہیں ریس کرنا، ایک دوسرے سے آگے بڑھنا(تفسیر مظہری ج۶ص۸۷) تو بھائی کہنے لگے کہ ہم لگے دوڑنے اور یوسف کو چھوڑ دیا سامان کے پاس اور بھیڑیے نے اسے کھالیا اور علامت اس پر یہ ہے کہ ان کا یہ خون آلود کرتہ موجود ہے۔

جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے

حضرت یعقوب علیہ السلام پیغمبر تھے اور مثل مشہور ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، تو آپ نے کرتہ لیا اور کرتہ لینے کے بعد اسے دیکھا، اس سے پہلے ایک لطیفہ سن لیں۔ سارود بھروچ ضلع میں ایک بستی ہے وہاں ایک صاحب تھے ان کو مائک میں اذان دینے کا بہت شوق تھا اور موذن صاحب اس کو موقع نہیں دیتے تھے ایک روز انہوں نے سوچا کہ صبح کے وقت اذان دی جائے یہ اچھا موقع ہے، تو رات میں تین بجے اٹھے اور ٹیبل اٹھا کر گھڑی کے پاس پہنچ گئے اور گھڑی میں اذان کا وقت کر دیا مگر ٹیبل وہیں بھول گئے اور اس کے بعد مائک چلا کر اذان شروع کر دی، موذن صاحب جلالی

تھے وہ آئے اور اس پر بگڑنے لگے تو وہ کہنے لگا کہ گھڑی میں جا کر ٹائم دیکھ لو وقت ہو گیا تھا اس لئے میں نے اذان دے دی، اب جو انہوں نے گھڑی دیکھی تو واقعی گھڑی میں تو وقت ہو گیا تھا مگر گھڑی کے نیچے جو علامت کھڑی تھی وہ پتہ دے رہی تھی کہ یہ کسی صاحب کی چھیڑ خانی ہے، خیر ان کا جھوٹ کھل گیا اور وہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے کرتہ کی تاثیریں

تو یہاں بھی یہی شکل ہوئی کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے کرتہ دیکھا تو فرمایا کہ بڑا سمجھدار بھیڑیا تھا کہ اس نے یوسف کو تو پھاڑ کھایا مگر کرتہ بالکل صحیح سالم ہے اس پر صرف خون کا نشان ہے وہ پھٹا نہیں۔ (معارف القرآن ج۵ص۲۵) بھیڑیئے کی دانائی اور اس کے سلیقہ کی داد دینی پڑتی ہے کہ جس کو کھانا تھا اس کو کھایا اور جسے پھاڑنا تھا اسے پھاڑا اور کرتہ بالکل صحیح سالم رہا، بھائیوں کو یہ یاد نہیں رہا تھا کہ کرتہ کا کچھ حصہ پھاڑ بھی دیا جائے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ عجیب کرتہ تھا جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے پیش کیا گیا تو حضرت یوسف علیہ السلام کی مظلومیت ثابت ہوئی اور بھائیوں کا جھوٹ پکڑا گیا۔ اور یہی وہ کرتہ تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام پر جب زلیخا نے گناہ کا بہتان باندھا تو اللہ تعالیٰ نے ایک چھوٹے سے بچے کو قوتِ گویائی عطا فرمائی اور اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے ایک ججمینٹ دیا، شیر خوار بچہ کہنے لگا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا کرتہ اگر سامنے سے پھٹا ہے تو یوسف قصوروار ہیں اور اگر پیچھے سے پھٹا ہے تو زلیخا کا قصور ہے (معارف القرآن ادریسی ج۴ص۱۱۷) چنانچہ دیکھا گیا تو کرتہ پیچھے سے پھٹا تھا، کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام بھاگے تھے اور زلیخا نے پیچھے سے کرتہ کھینچا تھا تو وہ کرتہ اس شان کا تھا کہ جب بھائیوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام

کے سامنے پیش کیا تو ان کا جھوٹ چل نہ سکا اور زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام پر جھوٹا الزام لگایا تو اس کا جھوٹ چل نہ سکا اور وہی کرتہ جب بھائی مصر سے لائے ہیں اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں پر ڈالا ہے تو ان کی گئی ہوئی بینائی واپس لوٹ آئی (معارف القرآن ج۵ص۲۶) اور حضرت یعقوب علیہ السلام بینا ہوگئے، کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے فراق میں رو رو کر انکی بینائی جا چکی تھی، تو گویا کرتہ ایسا تھا کہ اس سے حقیقتیں کھلتی تھیں کہ ادھر بھائیوں کا جھوٹ کھل گیا اور ادھر زلیخا کا جھوٹ چل نہ سکا اور جب حقیقت کھلتی ہے تو اس کو انسان اپنی نظروں سے دیکھتا ہے، لہٰذا اس کرتہ سے نظریں بھی کھلی ہیں۔

اجتہادی خطا

بہر حال حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے لختِ جگر، نورِ نظر اور فرزندِ ارجمند، دلبند جگر پیوند کے ساتھ بے انتہا محبت تھی جس کی وجہ سے بھائیوں کو حسد ہوا اور انہوں نے بیٹھ کر آپس میں ایک گفتگو کی، خدا تعالی اس کا تذکرہ فرمارہے ہیں اور واقعہ شروع فرمارہے ہیں، فرمایا کہ ''اذ قالو لیوسف واخوہ'' اس وقت کو یاد کرو جب بھائیوں نے یہ بات کہی کہ یوسف اور اس کا بھائی بنیامین ہمارے والد کے نزدیک ہم سے زیادہ محبوب ہیں حالانکہ ہم ایک بڑی جماعت ہیں اور ہم ضرورت کے موقعے پر کام آنے والے ہیں، مصیبت پیش آجائے تو دفاع کرنے والے ہیں یہ سب چیزیں ہم سے متعلق ہیں، ان ننھے بچوں سے یہ چیزیں ممکن نہیں ہیں''ان ابانا لفی ضلٰل مبین''اس معاملۂ خاص میں ہمارے والد بزرگوار کھلی غلطی پر معلوم ہوتے ہیں، یہاں ''ضلٰل مبین'' سے اجتہادی خطا مراد ہے (تفسیر ماجدی ج۲ص۵۸۰) کیونکہ اگر پیغمبر کے بارے میں کسی کا یہ عقیدہ ہو کہ پیغمبر گمراہ ہے تو جس کا یہ عقیدہ ہو اس کا ایمان گیا، یہاں مراد یہ ہے کہ اس معاملۂ

خاص میں اور اس بابِ خاص میں ہمارے والد کا جو خیال ہے وہ صحیح نہیں ہے، انہیں چاہئے کہ ہماری جانب چشمِ التفات کرے اور ہماری جانب نظرِ کرم زیادہ فرمائیں بہ نسبت ان دونوں بچوں کے، اس خاص معاملے میں والدِ بزرگوار سے اجتہادی خطا ہو رہی ہے، تو گویا وہ اس جہت سے کہہ رہے ہیں، اگر عقیدے کے لحاظ سے اپنے باپ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں جو کہ پیغمبر ہیں یہ خیال ہو کہ وہ گمراہی اور خطا پر ہیں تب تو ظاہر ہے کہ ان کو ایمان سے ہاتھ دھونا پڑے گا (معارف القرآن ج۵ ص۱۸) حالانکہ برادرانِ یوسف مؤمن تھے (حوالہ بالا) ان کے ایمان میں کوئی گفتگو نہیں ہے، اس لئے اس مقام پر ''ضلٰل'' سے مراد اجتہادی خطا ہے۔

تین گناہ سے خاص طور سے بچو

بہر حال بھائیوں کو حضرت یوسف علیہ السلام پر حسد ہوا، حسد بہت بڑا گناہ ہے ایک حدیث میں نبیٔ کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ تین گناہوں سے خاص طور سے بچو (۱) حسد (۲) کبر و غرور اور تیسرے حرص سے، وجہ اس کی یہ ہے کہ سب سے پہلے ابلیس نے غرور و تکبر کیا تو وہ مردود بنا، ماں حوّا اور آدمؑ نے اس دانہ کی حرص اور رغبت کی جس سے ان کو روکا گیا تھا تو ان سے جنت چھوٹی اور قابیل کو ہابیل پر حسد ہوا تو اس کے نتیجہ میں قتل کا گناہ وجود میں آیا (تلبیس ابلیس ص۳۸) تو ابلیس کا تکبر مردودیت کا باعث بنا، حضرت آدم علیہ السلام اور ماں حوّا کی دانہ کھانے کی رغبت جنت کے چھوٹنے کا باعث بنی اور قابیل کا اپنے بھائی ہابیل پر حسد قتل کا باعث بنا، تو یہ تین چیزیں تباہی کا باعث ہیں، اسی لئے کتابوں میں لکھا ہے کہ حسد میں تین حروف ہیں ایک ''حاء'' دوسرے ''سین'' تیسرے ''دال'' اور حاء پر کوئی نقطہ نہیں، نہ اوپر، نہ نیچے، سین پر بھی کوئی نقطہ نہیں، نہ اوپر نہ نیچے اور دال پر بھی کوئی نقطہ نہیں نہ اوپر اور نہ نیچے، گویا حاسد کے ہاتھ بالکل خالی ہے اس کے

ہاتھ میں کوئی چیز نہیں آتی سوائے جلنے کے اور پریشان ہونے کے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حاسد جیتے جی عذاب الٰہی میں مبتلا رہتا ہے۔

حاسدین کو ابن العربی کا مشورہ

شیخ محی الدین ابنِ عربیؒ نے حسد کا ایک نفسیاتی علاج لکھا ہے کہ اگر آدمی کو کسی کے بارے میں حسد ہو تو وہ اپنے اندر کوئی کمال پیدا کرنے کی کوشش کرے اور کمال پیدا ہونے پر یہ سوچے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے فلاں کو فلاں خوبی دی ہے تو مجھے بھی فلاں خوبی عطا فرمائی ہے، تاکہ خدا کا شکر ادا کرنے کی توفیق ہو اور اپنے بھائی پر حسد سے حفاظت ہو۔ (سبق آموز بیانات ص ۴۰۱) اور حاسد در حقیقت خدا کی تقدیر پر اعتراض کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اُسے یہ چیز کیوں دی اور مجھے کیوں نہیں دی؟ (سبق آموز بیانات ص ۴۰۲)

حسد کی بیماری ان الذین آمنوا میں زیادہ ہے

اور بڑے افسوس کی بات ہے کہ یہ بیماری ”ان الذین آمنوا،، میں بہت زیادہ ہے، ہم نے ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر بھی دیکھا کہ کوئی مسلمان بھائی خوشحال ہوتا ہے تو ہمارے پیٹ میں جلن شروع ہو جاتی ہے، حالانکہ اگر ایک مسلمان خوشحال ہو، اس کی پوزیشن اور کنڈیشن اچھی ہو تو دوسرے مسلمان کو خوش ہونا چاہئے، مگر یہ حسد کی بیماری اور بلا ایسی لگی ہوئی ہے کہ بس جسے دیکھئے وہ اسمیں مبتلا ہے، چھوٹا ہو، بڑا ہو، عالم ہو، غیر عالم ہو کسی میں کم کسی میں زیادہ، باقی ایک عام بیماری ہے۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

سبھی اس مرض کے گرفتار ہیں اس لئے اس سے بچنے کا خاص اہتمام ہونا چاہئے۔

حسد کا وبال

حدیث شریف میں ہے کہ ’’ان الحسد یاکل الحسنات کماتاکل النار الحطب ‘‘(ترجمان الحدیث ص ۱۰۱ بحوالہ ابوداؤد) حسد نیکیوں کو اس طریقہ سے کھالیتا ہے جس طریقہ سے آگ لکڑی کو کھالیتی ہے، تو اس سے بچنے کی کوشش کی جائے، اللہ پاک ہم سب کی حسد سے اور تمام ہی روحانی بیماریوں سے حفاظت فرمائیں اور آپس میں محبت ومودت نصیب فرمائیں اور صحیح معنی میں قرآن فہمی نصیب فرمائیں، آمین۔

۞۞۞۞۞

درس نمبر پندرہ سے حاصل ہونے والی چار اہم ہدایات

(۱) اللہ تعالی کی نافرمانی آدمی اس عالم میں کرتا ہے اوپر کا جو عالم ہے وہاں اللہ تعالی کی نافرمانی نہیں کرسکتے، اگر کوئی کام اوپر کے عالم میں اللہ تعالی کی منشا کے خلاف ہوتا ہے تو اس کا ثمرہ بھی اس کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔

چنانچہ ابلیس نے اوپر کے عالم میں تکبر کیا اور اللہ تعالی کے حکم کی نافرمانی کی تو اسے مردود کردیا گیا، امّاں حوّا اور حضرت آدمؑ سے ایک بات ہوئی تو انہیں بھی وہاں سے رخصت کردیا گیا۔

(۲) حسد کا وبال بہت خطرناک ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھالیتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھالیتی ہے، اس لئے ہمیشہ اس سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(۳) تین گناہوں سے خاص طور سے بچنا چاہیے (۱) حسد (۲) کبر وغرور اور تیسرے حرص۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ سب سے پہلے ابلیس نے غرور وتکبر کیا تو وہ مردود بنا، ماں

حوّا اور آدمؑ نے اس دانہ کی خواہش اور حرص کی جس سے ان کو روکا گیا تھا تو جنت چھوٹی اور قابیل کو ہابیل پر حسد ہوا تو اس کے نتیجہ میں قتل کا گناہ وجود میں آیا۔

اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو ان تینوں گناہوں سے بچنے کی توفیق نصیب فرمائیں۔

(۴) حسد کا ایک نفسیاتی علاج یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر کوئی کمال پیدا کرلے اور یہ سوچے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے فلاں کو فلاں خوبی دی ہے تو مجھے بھی یہ خوبی عطا فرمائی ہے۔
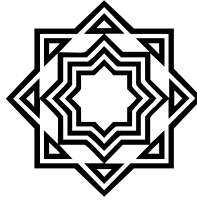
درس نمبر (۱۶)

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم،امابعد!

فاعوذ بالله من الشیطن الرجیم ، بسم الله الرحمن الرحیم☆

اقتلوا یوسف اواطرحوه ارضا یخل لکم وجه ابیکم وتکونوا من بعده قوما صالحین☆قال قائل منهم لا تقتلوا یوسف والقوه فی غیبت الجب یلتقطه بعض السیارة ان کنتم فعلین☆ .(یوسف ،آیت: ۹/ ۱۰).

حاسد حسد کی وجہ سے ہرنا کردنی کرگذرتا ہے

بزرگانِ محترم! گذشتہ کل یہ بات عرض کی تھی کہ بھائیوں کوحضرت یوسف علیہ السلام کے باب میں یہ ناگواری تھی کہ والد بزرگواران کوزیادہ کیوں چاہتے ہیں؟ اوراس کی وجہ سے ان میں ایک قسم کی کیفیتِ حسد پیدا ہوگئی (معارف القرآن ادریسی ج۴ص۱۰۲) اور انہوں نے آپس میں ایک مجلس کی اور ملکرایک نظام بنایا کہ ہمیں کوشش یہ کرنی چاہئے کہ کسی طریقہ سے یوسف باپ سے علحدہ اور جدا ہوجائے، تاکہ باپ کی ساری توجہ بجائے یوسف کے ہماری طرف رہے (حوالہ بالاص۱۰۱) اور پھر نتیجۃً ہم صالح اور نیکوکار بن جائیں گے، توان کی آپس کی نشست کا خلاصہ یہ تھا کہ یوسف (علیہ السلام) کوباپ سے دور کیا جائے، مگرسوال یہ پیدا ہوا کہ اس کے لئے کیا شکل اختیار کی جائے اورکون سی تدبیر اختیار کی جائے کہ جس کے نتیجہ میں باپ بیٹے میں جدائی ہو، چونکہ طبیعت میں کیفیتِ حسد پیدا ہوچکی تھی اس لئے انہوں نے کہا کہ ایسا کروکہ "اقتلوا یوسف" یوسف کوختم کردوکہ" نہ رہے بانس نہ بجے بانسری،، جب وہ نہیں رہیں گے تووالد بزرگوار چند روز رودھوکر اور صدمہ کرکے خاموش ہوجائیں گے پھران کی ساری توجہ ہماری طرف رہے گی اور یہ بیچ کا کانٹا اور بیچ کا روڑا دور ہوجائے گا، یا پھرایسی شکل کی جائے کہ

''اوطرحوہ ارضا'' ان کوکسی دور دراز مقام پرڈالدیاجائے تاکہ والد کا رخ ہماری طرف خالص ہوجائے اور بعد میں پھر ہم صالحین میں سے ہوجائیں گے، گویاانہوں نے آپس میں دو چیزیں طے کیں، ایک کا تعلق تھا قتل سے کہ کسی طرح ان کی جان لے لی جائے اور ان کو ختم کردیاجائے، دوسری صورت یہ تھی کہ انہیں کسی دور دراز مقام پر ڈالدیاجائے، حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں میں ایک بھائی روبیل نامی تھے۔ (معارف القرآن ج۵ص۱۹) اورایک قول یہ ہے کہ یہ شمعون تھے اور مشہور قول یہ ہے کہ یہ یہودا تھے۔ (معارف القرآن ج۵ص۱۹) ان کو حضرت یوسف علیہ السلام سے بہ نسبت اور بھائیوں کے زیادہ تعلق تھا، انہوں نے مجلس کی گفتگو سننے کے بعد کہا ''لاتقتلوا یوسف'' یہ قتل کا پروگرام ٹھیک اور مناسب نہیں ہے، یوسف کو قتل مت کرو، اتنا بڑا بوجھ اور گناہ اپنے سر اٹھاؤ یہ بہت نامناسب بات ہے ''والقوہ فی غیٰبت الجب''، قتل کے بجائے یوسف کو کسی گمنام کنویں میں ڈال دو ''غیابہ''، ہراس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو چھپالے اور غائب کردے اسی لئے قبر کو بھی غیاب کہا جاتا ہے اور ''جب'' ایسے کنویں کو کہتے ہیں جس کی مَن بنی ہوئی نہ ہو۔ (معارف القرآن ج۵ص۱۹) ''یلتقطہ بعض السیارۃ'' ہوسکتا ہے کوئی قافلہ آئے اور اسے اٹھالے'' ان کنتم فعلین''، اگر تم کرنے ہی کے درپے ہو اور چاہتے ہی ہو کہ یوسف کو باپ سے جدا کرو تو یہ کام کرو، یہ بات بھائیوں کی سمجھ میں بھی آگئی کہ والد ماجد حضرت یعقوب علیہ السلام پیغمبر ہیں ان کا دل دکھانا کوئی معمولی بات نہیں ہے، حافظ ابنِ کثیرؒ لکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام پر بھی پیغمبری کے آثار تھے اس لئے انہوں نے سوچا کہ اس معصوم کو بھی اتنی تکلیف پہنچانا مناسب نہیں ہے، پھر ظلم کی ایسی شکل کہ اس میں قرابت اور رشتہ داری کالحاظ بھی باقی نہیں رہتا (تفسیر مظہری ج۶ص۳۸) اورانسانی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بھی بڑی بے مروتی کی بات ہے کہ

باپ بیٹے کے درمیان بھائی اس قسم کا معاملہ انجام دیں، پھر جب تدبیر وحکمت سے کام نکل سکتا ہے تو نکال لینا چاہئے جیسا کہ مشہور ہے کہ ”اگر گُڑ دینے سے کام نکلتا ہو تو زہر دینے کی ضرورت نہیں ہے“ بہر حال بھائیوں نے سوچا کہ جب مناسب حیلہ اور تدبیر سے کام چل سکتا ہے اور باپ سے یوسف کی جدائی ہوسکتی ہے تو پھر کیا ضرورت ہے کہ ہم یوسف کو قتل کریں، خلاصہ یہ کہ حسد کے نتیجہ میں بھائیوں نے یہ نظام بنایا اور یہ اسکیم رچی اس سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ حسد ایک ایسی بلا ہے جس کے نتیجہ میں آدمی ہر ایسی ناکردنی کر گذرتا ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا چنانچہ اگر ایک مسلمان اپنے حقیقی یا غیر حقیقی بھائی کو حسد کی وجہ سے کوشش کر کے جیل بھیج دے، یا وطن سے بے وطن کر دے، یا کسی ملک سے ڈپورٹ کرادے، یا اسے کسی مصیبت میں مبتلا کرادے تو یہ کچھ بعید نہیں ہے یہ سب حسد کی نحوستیں ہیں جن کو ہم رات دن دنیا میں دیکھتے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، جب یہ مصیبت اور فتنہ یعنی حسد قلب میں آتا ہے تو پھر اس کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔

حسد کی وجہ سے آدمی کو محسود کے کمالات عیب نظر آتے ہیں

اس لئے جنابِ نبی کریم ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ حسد سے بچو اس لئے کہ دنیا میں سب سے پہلا قتل حسد کی وجہ سے ہی ہوا ہے کہ قابیل کو اپنے بھائی ہابیل پر حسد ہوا اور پھر قتل کا واقعہ پیش آیا، دوسری بات یہ ہے کہ حسد بعض مرتبہ انسان کی صلاحیتوں پر بھی غالب آجاتا ہے، فی نفسہ نیک اور صالح قسم کی استعداد اور صلاحیت ہے مگر حسد کی وجہ سے آنکھوں پہ پٹی بندھ جاتی ہے اور کمالات عیب نظر آتے ہیں اور آدمی اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر دیتا ہے، اسلئے اس بلا سے بچانے کی انبیاء کرام علیہم السلام نے اور بالخصوص نبی کریم ﷺ نے سعی بلیغ فرمائی اور مختلف تدبیروں سے، مختلف ارشادات

سے اس کی قباحت اور مذمت لوگوں پر واضح کی ہے۔

ابلیس کے پانچ مہلک خزائن

مشہور قصہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ابلیس کو دیکھا کہ پانچ گدھوں پر کچھ سامان لیکر جا رہا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ابلیس سے پوچھا کہ ان پر کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ ایک پر خیانت ہے، دوسرے پر تکبر ہے، تیسرے پر ظلم ہے، چوتھے پر مکّاری ہے اور پانچویں پر حسد ہے (تلبیس ابلیس) حضرت عیسی علیہ السلام نے پوچھا کہ اس کو تم کس مارکیٹ میں لے جا رہے ہو؟ کون اس کا خریدار ہے؟ اس نے بتایا کہ مکّاری کو میں عورتوں میں تقسیم کروں گا عورتوں کا مکر بہت خطرناک ہوتا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ناخن دبائیں تو آنکھوں سے آنسو نکلنا شروع ہو جاتے ہیں اور اس وقت بھی ہم دنیا میں دیکھ رہے ہیں کہ عورتوں کی مکّاری نے کروڑوں لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے، یہ بالکل ابلیس کی خالہ ہوتی ہے۔

حضرت شاہ عبد العزیز صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ایک واعظ بیان کر رہے تھے کہ جب آدمی صدقہ کرنا چاہتا ہے تو ستر (۷۰) کے قریب شیاطین یعنی ابلیس کی ذریت اسے صدقہ سے روکتی ہیں اور بہکاتی ہیں کہ عسرت آئے گی، تنگی آئے گی، پریشانی آئے گی''الشیطٰن یعدکم الفقر ویامرکم بالفحشاء'' (بقرۃ، آیت: ۲۶۸) ایک جذباتی آدمی محفلِ وعظ میں بیٹھا ہوا یہ سن رہا تھا وہ اٹھا اور مارے جذبہ کے گھر پہنچا اور دل میں کہنے لگا کہ آج مجھے ستر شیاطین کا مقابلہ کرنا ہے، گھر جانے کے بعد ایک چادر اٹھائی اور کوٹھی سے اناج نکال کر چادر پر ڈالنا شروع کیا اور جب اس کا ڈھیر ہو گیا تو اسے باندھ کر باہر سائل کو دینے کے لئے جانے لگا تو پیچھے سے اس کی بیوی آئی اور کہنے لگی کہ یہ تم کیا کر رہے ہو؟ اس نے کہا سخاوت اور صدقہ کر رہا ہوں، تو بیوی کہنے لگی کہ کیا بچوں

کو بھوکا مارنا ہے؟ بڑے آئے سخاوت کرنے والے، چلو رکھو، وہ بہت زیادہ خفا ہوئی کیونکہ گھر کی سپر پاور تو وہی ہوتی ہے، خیر اس نے اتنا دباؤ ڈالا کہ اس کے نتیجہ میں اس بیچارے نے اناج رکھ دیا اور محفلِ وعظ میں آ کر کہنے لگا کہ حضرت! آپ نے جو فرمایا وہ بالکل صحیح ہے کہ آدمی صدقہ کا ارادہ کرتا ہے تو ستّر کے قریب شیاطین اسے صدقہ سے روکتے ہیں ستر شیاطین نے وسوسہ ڈالا میں نے ان سب کا تو مقابلہ کیا مگر پیچھے سے ان کی خالہ آئی تو میں اس کے سامنے شکست کھا گیا (جواہر پارے ص۱۴۲ بحوالہ تفسیر کبیر ج ۱ ص ۹۵) تو بہر حال مکر عورتوں میں ہوتا ہے اور ویسے ان میں بعض صالحہ اور عفیفہ بھی ہوتی ہیں۔

اور رہی خیانت تو اس کو تاجروں میں تقسیم کروں گا عموماً تجارت کے ساتھ خیانت ہوتی ہی ہے اسی لئے جناب نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا ''التاجر الصدوق الامین مع الانبیاء والصدیقین '' (اللہ سے شرم کیجئے ص ۳۶۵ بحوالہ بخاری و مسلم) اس سے معلوم ہوا کہ اگر تجارت درست طریقہ پر کی جائے تو وہ بہت بڑی عبادت ہے ہم لوگ عموماً صرف نفل نماز ہی کو عبادت سمجھتے ہیں، حالانکہ بچوں اور گھر والوں کیلئے حلال تجارت کرنا بہت بڑی عبادت اور بڑا ثواب کا کام ہے بشرطیکہ اصولوں کے ساتھ ہو، اگڑم بگڑم نہ ہو کہ سامنے والے کو دھوکا دیا جائے کہ چیز خریدی ہو پچاس روپیہ میں اور بتائے دوسو روپیہ کی، چونکہ جھوٹ عموماً تجارت میں ہوتا ہے اس لئے تاجر کی صفت میں سچائی کا ذکر حدیث شریف میں فرمایا گیا۔

اور رہا تکبر تو اس کو دیہات والوں میں تقسیم کروں گا اسی لئے کھیتی اچھی پکے اور کسان کے پاس چار پیسے آجائیں تو پھر دیکھئے مونچھوں کا تاؤ اور ٹوپی اور باتوں کی کیفیت اگر بیڑی بھی پیئیں گے تو چہرہ ٹیڑھا کر کے غرض یہ کہ ہر چیز میں ٹیڑھا پن پیدا ہو جاتا ہے اور اب تو کیا شہری اور کیا دیہاتی کیا پڑھا لکھا اور کیا ان پڑھ سب ہی اس

بلا میں مبتلا ہیں۔

چوتھی چیز حسد ہے اس کو میں سمجھدار اور پڑھے لکھے لوگوں میں تقسیم کروں گا تو جاننے والے بھی اس بلا میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

اور پانچویں چیز ظلم ہے اس کو میں سلاطین اور بادشاہوں میں تقسیم کروں گا ۔بہر حال حسد کے نتیجہ میں بھائیوں نے یہ اسکیم بنائی۔

توبہ کی بنیاد پر گناہ کرنا بہت بڑی نادانی ہے

قرآنِ کریم نے اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے ’اقتلوا یوسف او طرحوہ ارضا یخل لکم وجہ ابیکم وتکونوا من بعدہ قوما صالحین ‘‘ یہاں دو چیزیں ہیں ایک ہے حضرت یوسف علیہ السلام کو باپ سے علحدہ کرنا، ظاہر ہے اس سے باپ کا بھی دل دکھے گا اور بیٹے کا بھی دل دکھے گا، اور وہ کہہ رہے ہیں ’’وتکونوا من بعدہ قوما صالحین ‘، اب یہاں سوال یہ ہے کہ وہ کام ایسا کر رہے ہیں کہ جس کے نتیجہ میں باپ بیٹے میں جدائی ہوگی جو حسد کا اثر ہے، پھر ان کے صالح بننے کا کیا مطلب؟

اس کا جواب دو طریقہ سے دیا گیا ہے اور اسکے دو مفہوم ہیں (معارف القرآن ج ۵) اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ یہ گناہ جو تم سے وجود میں آ رہا ہے کہ تم باپ بیٹے میں اور ایسے اعلی رتبہ باپ اور پیارے بیٹے میں جدائی کا کام کر رہے ہو جس سے قرابت کا حق بھی مارا جا رہا ہے یہ بہت عظیم گناہ ہے اس گناہ کے بعد توبہ کر لینا اور جب توبہ کر لو گے تو اللہ تعالی معاف کر دے گا (تفسیر مظہری ج۶ ص۸۳) پس تم صالحین میں سے بن جاؤ گے اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے، اسی لئے محققین نے لکھا ہے کہ بہت دفعہ شیطان انسان کو اس طرح بہکاتا ہے کہ اللہ تعالی نے توبہ اسی لئے رکھی ہے کہ ہم گناہ کر لیں اور بعد میں پھر توبہ کر لیں تو یہ بات ذہن میں رہے کہ توبہ کی بنیاد پر گناہ کرنا بڑی نادانی ہے، اس کی ایسی مثال ہے

کہ آپ کے گھر میں مرہم رکھا ہو کہ اگر ہاتھ جل جائے یا کٹ جائے تو اسے لگا لیا جائے، گھر میں رکھا ہوا مرہم اس لئے نہیں ہے کہ جان بوجھ کر ہاتھ کو کاٹا یا جلایا جائے۔(تسہیل المواعظ ص ۱۵۸/۱۵۹) دنیا کا کوئی عقلمند مرہم کے گھر میں موجود ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں لیتا شریعت نے جو توبہ رکھی ہے تو وہ اس لئے کہ اگر گناہ نادانی سے ہو جائے تو توبہ کر کے آدمی اپنے گناہ کو معاف کروالے، یہ مقصد نہیں ہے کہ توبہ کو بنیاد بنا کر آدمی گناہ پر جری ہو جائے کہ توبہ تو کرنی ہی ہے لہٰذا یہ بھی کرو اور وہ بھی کرو اور وجہ اس کی یہ ہے کہ گناہ کرنے سے پہلے جو توبہ کا جذبہ آدمی میں موجود ہے اس کی کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ گناہ اور اللہ تعالی کی نافرمانی کرنے کے بعد توبہ کا جذبہ باقی رہے گا، ہوسکتا ہے کہ گناہ کی نحوست کی وجہ سے اور خدا تعالی سے دوری ہونے کی وجہ سے توبہ کا وہ جذبہ باقی نہ رہے، ہوسکتا ہے کہ اس کی وجہ سے توبہ کی توفیق چھین جائے، کیونکہ توبہ کی توفیق بھی تو حق تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت ہے جو بندے کو نصیب ہوتی ہے اور گناہ کی وجہ سے ایسی ظلمت اور حق تعالیٰ سے دوری ہوتی ہے کہ بہت سی مرتبہ توبہ کی توفیق رخصت ہو جاتی ہے، بہر حال توبہ اس لئے ہے کہ گناہ ہو جائے تو توبہ کی جائے، یہ نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر گناہ کیا جائے، اب اس مقام پر آپ دیکھیں کہ چونکہ وہ نبی زادے تھے اس لئے وہ کہہ رہے ہیں کہ ''وتکونوا من بعدہ قوما صالحین ''اس گناہِ عظیم کے بعد تم تائب ہو جانا اور جب تم توبہ کر لو گے تو تم صالحین میں سے ہو جاؤ گے، تو ان کو ان کے نفس نے ایک پٹی تو یہ پڑھائی، دوسری بات یہ ہے کہ جب تم یوسف کو ابا جان کے پاس سے ہٹا دو گے اور وہ جب ان سے الگ ہو جائیں گے تو باپ کی ساری نگاہِ کرم اور ساری توجہ تمہاری طرف ہو جائے گی (تفسیر مظہری ج۶ ص ۸۳) اور یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ صالح اور بزرگ آدمی کسی کی طرف متوجہ ہو تو اس کے اثرات ہوتے ہیں، حتی کہ اس کے پاس بیٹھو تو اثر ہوتا ہے، کلام سنو تو اس کا اثر

ہوتا ہے اور آج کی سائنس نے تو ان مسائل کو بہت آسان کر دیا ہے کہ کسی چیز کو ہاتھ لگاؤ
تو اس پر اثر ہوتا ہے، کسی چیز کے پاس سے گذرو تو اس کا اثر ہوتا ہے، ہر ہر شئ پر اثرات
ہوتے ہیں اگر آدمی راستہ سے گذرے تو کتے جیسا جانور اسکی بو محسوس کر لیتا ہے جب
ظاہری اور مادی عالم میں یہ اثرات ہیں تو معنوی اور روحانی عالم میں انسان کی نیکیوں اور
بدیوں کے اثرات کیوں نہ ہوں گے، چنانچہ صالح آدمی کی صحبت کا اثر ہوتا ہے اور برے
آدمی کی صحبت کا اثر بھی ہوتا ہے، خیر بھائی کہنے لگے کہ جب باپ کا صدمہ ختم ہو جائے گا
تو وہ یقیناً تمہاری طرف متوجہ ہوں گے اور جب وہ تمہاری طرف متوجہ ہوں گے تو پیغمبر کی
توجہ یقیناً تمہیں نیک بنا دے گی لہذا یقیناً تم نیک ہو جاؤ گے، تو پہلے مفہوم کا حاصل یہ ہے
کہ یہ گناہِ عظیم ہے توبہ کر کے تم قومِ صالحین میں سے ہو جاؤ گے۔ اور دوسرا مفہوم آیتِ
کریمہ کا یہ ہے کہ باپ کی توجہ کا مرکز بننے کے نتیجہ میں تم پر صلاح مرتب ہوگا اور تم قومِ
صالحین میں سے بن جاؤ گے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان کے یہ دونوں خیالات
اپنی جگہ صحیح تھے۔

آدمی کام غلط کرنا چاہتا ہے اور عنوان اچھا دیتا ہے

بہر حال بھائیوں کے پیشِ نظر یہ تھا کہ بعد میں ہمیں صالح بننا ہے، چاہے توبہ
کے واسطے سے صالح بنیں چاہے باپ کی توجہ کی وجہ سے صالح بنیں لیکن انہوں نے جو
طریق اختیار کیا وہ شرعی نقطۂ نظر سے بالکل صحیح نہیں تھا، تو اس سے ایک مسئلہ یہ نکلتا ہے
اور قرآنِ کریم انسانوں کو یہ سبق دے رہا ہے کہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے
سامنے ایک عنوان اور ہیڈنگ بہت اچھا رکھتا ہے مگر اس کے پیچھے اس کی طبیعت اور اسکے
جذبات کام کرتے ہیں، جیسے مثال کے طور پر ایک آدمی کو کوئی غلط کام کرنا ہے تو وہ اس کو
کوئی اچھا عنوان دیدیتا ہے کہ اس میں فلاں فلاں فائدہ ہے، وہ بظاہر اچھا عنوان دیتا

ہے مگر در حقیقت اس کے اندر نفس کے جذبات کام کر رہے ہوتے ہیں، مثال کے طور پر ٹیلی ویژن کو لیجئے ٹیلی ویژن کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ مولانا صاحب! اس سے جنرل نالیج ملتا ہے اور یہ ملتا ہے اور وہ ملتا ہے فوائد کی ایک فہرست ہے جو یار لوگ شمار کروا دیتے ہیں اور اس کے نیچے واقع میں نفس کے جذبات کارفرما ہوتے ہیں، ہم یہ پوچھتے ہیں کہ اگر آپ کو فوائد اور علوم ہی حاصل کرنا ہے تو قرآنِ کریم جو سارے علوم کا حامل ہے اس میں آپ نے کتنی دفعہ غور فرمایا، حدیث شریف میں کتنی دفعہ غور فرمالیا، جب یہ یقینی بات ہے کہ ساری دنیا کے انسانوں کا علم قرآن وحدیث کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا ، تو اس کے باوجود آدمی نہ قرآنِ کریم کی طرف متوجہ ہو نہ حدیث شریف کی طرف متوجہ ہو، نہ اسلامی تاریخ کی طرف متوجہ ہو، تو یہ متوجہ نہ ہونا کس بات کی غمّازی کرتا ہے؟ یہی کہ اس میں صرف ننگی تصویریں دیکھنے کا شوق اور جذبہ کارفرما ہے، جو لوگ عنوان اچھا اختیار کر کے اپنے جذبات کی تسکین چاہتے ہیں قرآنِ کریم اس واقعہ سے ایسے سارے لوگوں کو متنبہ کرنا چاہتا ہے کہ بہت دفعہ عنوان اور ہیڈنگ جاذب ہوتا ہے مگر اندر چور چھپا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی تو دلوں کی کھٹک پر بھی مطلع اور واقف ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ کس کی نیت کیا ہے، باقی اکثریت کا حال یہ ہے، باقی کسی نے کسی واقعی ضرورت کے تحت کوئی کام کیا ہو تو وہ اس سے مستثنیٰ ہے البتہ دلوں کا حال خدا تعالیٰ خوب جانتا ہے، دیکھئے بھائیوں نے اپنے فعل کی انتہا صلاح بتلایا ہے کہ ’’وتکونوا من بعدہ قوما صلحین ‘‘ مگر صلاح کیلئے کیا طریقہ اختیار کیا، باپ بیٹے میں جدائی، ظلم کی شکلیں، حقوقِ قرابت پر زد تو انہوں نے اس جذبہ کے تحت یہ ساری شکلیں اختیار کیں ، بہر حال اس واقعہ میں ہمارے لئے بڑا سبق ہے کہ ہم اپنے ہر کام میں جس کا عنوان اچھا ہو سوچیں کہ کہیں اسکے اندر کوئی نفسانی یا شیطانی جذبہ تو کام نہیں کر رہا ہے اگر ہم

اپنے باب میں حسنِ ظن نہ رکھتے ہو اور اپنی ذات پر تنقیدی نظر ڈالیں تو ہمیں پتہ چل جائے گا کہ واقعی اس میں ہم سے کوتاہی ہو رہی ہے، الاّ ماشاء اللہ۔

اللہ تعالیٰ کی بندے سے رضامندی اور ناراضگی کی علامت

اسی لئے امامِ غزالیؒ اور حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے لکھا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے خوش ہوتے ہیں تو اس کی ایک علامت یہ ہے کہ اس کو اپنے اندر کی برائیاں سُجائی دیتی ہیں کہ مجھ میں یہ برائی، مجھ میں یہ کمی، مجھ میں یہ کوتاہی مجھ میں یہ نقص، مجھ میں یہ عیب، مجھ میں یہ کمزوری یہ ساری چیزیں اس پر کھلنا شروع ہوتی ہیں۔ اور لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس بندے سے ناراض ہوتے ہیں اس کو اپنی برائیاں نظر نہیں آتی اسے دنیا بھر کے انسانوں کی برائیاں نظر آتی ہیں کہ فلاں میں یہ برائی، فلاں میں یہ نقص، فلاں میں یہ عیب تو دنیا بھر کی اَلا بلا سب جو نظر آتی ہیں وہ غیروں کی اپنی ذات کی نہیں، تو بزرگوں نے لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ جس بندے سے خوش ہوتے ہیں اس کو اپنے نفس کی برائیاں نظر آنے لگتی ہیں اپنے نفس کے عیب نظر آنے لگتے ہیں اور خدا تعالیٰ جس بندے سے ناراض ہوتے ہیں اسے اپنی برائی نظر نہیں آتی پرایوں کی برائیاں نظر آتی ہیں، تو اس سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ انسان اپنے معاملے میں ہمیشہ ایک اچھا عنوان اختیار کرتا ہے۔

انسان بہت سی مرتبہ خود اپنی صلاحیت کو ختم کر دیتا ہے

تو آپ دیکھئے کہ قرآنِ کریم کا اسلوب کتنا پیارا ہے کہ ایک آیت ذکر کی اور اس سے یہ ساری چیزیں گویا نکل رہی ہیں، اس سے ایک مسئلہ اور مستنبط ہوا وہ یہ کہ انہوں نے پہلے یہ پلان بنایا کہ یوسف کو قتل کر دیا جائے، ایک۔ اور دوسری چیز یہ ذکر کی کہ یوسف کو دور کسی زمین پر ڈال دیا جائے، تو عارفین لکھتے ہیں کہ ہر انسان کو حق تعالیٰ نے ایک صلاحیت عطا فرمائی ہے، ایک استعداد عطا فرمائی ہے، مگر اس آسمان کی چھت کے

نیچے کتنے ایسے لوگ ہیں کہ شیطان اور نفس کی چالبازیوں سے متاثر ہوکر وہ اس روش اور طریقے پر جارہے ہیں کہ اپنی صلاحیتوں کو ختم کردیں اپنی استعداد کا گلا گھونٹ کے رکھدیں کہ جس کے ذریعہ سے وہ ترقی کرسکتے تھے اور روحانی پرواز کرسکتے تھے، یا اگر اپنی استعداد کا گلا گھونٹنا نہیں چاہتے تو کم از کم یہ شکل اختیار کرتے ہیں کہ رب العلمین اور اپنی ذات کے درمیان بُعد پیدا ہوجائے تو یہ نفس وشیطان کی کوشش ہوتی ہے کہ آدمی خدا تعالی سے دور ہوجائے، جیسے اس مقام پر بھائیوں نے یہ چاہا تھا کہ یوسف کی باپ سے دوری ہوجائے جو مقبول ہے، تو یہ نفس و شیطان کی کوششیں ہوتی ہے کہ یا تو وہ صلاحیت کا گلا گھونٹ دے جیسے بھائیوں نے یوسف کا گلا گھونٹنا چاہا تھا، یا یہ کہ اس کو رب العالمین سے دور کردے جیسا کہ بھائیوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے حضرت یوسف علیہ السلام کی دوری چاہی۔

خیر وشر کی دعوت کا ایک نظام اندر بھی ہے اور ایک نظام باہر بھی ہے

اور اس سے ایک مفہوم یہ بھی نکلا کہ جو یہودا تھے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی وہ آپ کے خیر خواہ تھے انہوں نے کہا کہ ”لاتقتلوا یوسف“ یوسفؑ کو قتل مت کرو، تو اربابِ معرفت لکھتے ہیں کہ انسان کی داہنی جانب ایک فرشتہ ہے جو اس کو خیر کی تلقین کرتا ہے (تلبیس ابلیس) تو اس فرشتہ کی اور باہر جو صالحین ہیں جو خیر خواہی کی تلقین کرتے ہیں ان کی پکار یہ ہے کہ اپنی صلاحیت کا گلا مت گھونٹو، اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہ نے دو نظام اندر چلائے ہیں اور دو نظام باہر چلائے ہیں، اندر خیر کا نظام یہ ہے کہ داہنی جانب جو فرشتہ ہے وہ ”اَقْبِل،، اور ”بادِیَ الخیر،، کہہ کر خیر کی دعوت دیتا ہے اور بائیں جانب شیطان ہے جو شر کی طرف بلاتا ہے (تلبیس ابلیس) تو برائی کا داعی بھی اندر موجود جو شیطان ہے اور نیکی کی دعوت دینے والا بھی اندر موجود جو فرشتہ ہے، باہر بھی اسی

طریقہ سے انبیاء کرام علیہم السلام اور اگر وہ نہ ہوتو ان کے متبعین ونائبین وہ نیکی کی دعوت دیتے ہیں اور جتنے شیطان کی اتباع کرنے والے ہیں کافرین ومشرکین اور جتنے غیر اللہ کی طرف بلانے والے ہیں وہ سب شر کی دعوت دے رہے ہیں، تو خیر وشر کی دعوت کا ایک نظام اندر بھی ہے اور خیر وشر کی دعوت کا ایک نظام باہر بھی ہے۔

درس نمبر سولہ سے حاصل ہونے والی تین اہم ہدایات

(۱) حاسد حسد کی وجہ سے ہر ناکردنی کر گذرتا ہے اسکی ایک مثال برادرانِ یوسف کا حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ سلوک ہے۔

اس سے ہمیں یہ سبق ملا کہ ہمیں اس بیماری سے اپنے دل کو بالکل پاک صاف رکھنا چاہئے۔

(۲) حسد ایک ایسی چیز ہے کہ بعض مرتبہ وہ انسان کی صلاحیتوں پر بھی غالب آجاتی ہے، نیک اور صالح قسم کی استعداد وصلاحیت ہے مگر حسد کی وجہ سے آنکھوں پہ پٹی بندھتی ہے اور کمالات عیب نظر آتے ہیں اور پھر آدمی صلاحیتوں کو ضائع کر دیتا ہے۔

اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہم سب کو چاہئے کہ ہم اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھے کہ کہیں ہم بھی تو اسکے شکار نہیں ہو گئے ہیں۔

(۳) بہت دفعہ شیطان انسان کو اس طرح بہکاتا ہے کہ توبہ اللہ تعالی نے رکھی ہی اس لئے ہے کہ ہم گناہ کر لے بعد میں توبہ کر لیں گے، تو توبہ کی بنیاد پر گناہ کرنا یہ بڑی نادانی ہے۔

درس نمبر (۱۷)

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم. امابعد!

فاعوذ بالله من الشیطن الرجیم. بسم الله الرحمن الرحیم

قالوا یا ابانا مالک لا تامنا علی یوسف وانا له لناصحون ☆

مالک لاتامنا علی یوسف

بزرگانِ محترم! گذشتہ کل میں یہ عرض کررہا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں میں سے ایک بھائی جس کو حضرت یوسف علیہ السلام سے کچھ لگاؤ تھا وہ کہنے لگا کہ یوسف کو قتل کرنے کے بجائے کسی اندھیرے کنویں میں ڈالدو تا کہ ہمارا جو مقصد ہے کہ یوسف والدِ محترم سے دور ہوجائے وہ ہمیں حاصل ہوجائے گا یہ بات بھائیوں کی سمجھ میں آگئی اس کے بعد انہوں نے والد بزرگوار کے پاس حاضر ہوکر عرض کیا کہ "یابانا مالک لاتامنا علی یوسف واناله لنا صحون" (یوسف، آیت: ۱۱) ابا جان! آپ یوسف کے معاملہ میں ہم پر مامون نہیں ہیں، ہم پر آپ کو اعتماد واطمینان نہیں ہے" وانا له لناصحون "اور بیشک البتہ ہم اس کے خیر خواہ ہیں، عربی گرامر کے اعتبار سے "اِنَّ" تاکید کیلئے آتا ہے، جملہ اسمیہ تاکید کیلئے آتا ہے، لام تاکید کیلئے آتا ہے، پھر جمع کے صیغہ سے بھی تاکید نکل رہی ہے، اس طرح انہوں نے بہت زیادہ پاور اور قوت والا کلام استعمال کیا اور یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ ہم یوسف کے خیر خواہ اور ہمدرد ہیں مگر تعجب ہے کہ آپ ہم پر یوسف کے باب میں اعتماد نہیں کرتے، یہاں اربابِ تفسیر لکھتے ہیں کہ انہوں نے اس سے پہلے بھی چاہا تھا کہ یوسف کو والد سے حاصل کرے مگر حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی نگاہوں سے اوجھل اور دور نہیں ہونے دیتے تھے، ان کے اس حال کی وجہ سے بھائیوں نے یہ بات کہی کہ گویا آپ کو ہم پر اعتماد

ہی نہیں ہے، اسی طرح انہوں نے یوسف علیہ السلام سے مل کران کا بھی ذہن بنایا تھا کہ ہم اباجان سے آپ کے باب میں چھٹی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ تیار ہیں یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ بچہ تو چاہتا ہی ہے کہ کسی طریقہ سے کوئی ایسا موقعہ ملے کہ باہر نکلے کھائے پیئے اور تازہ ہوا میں اچھل کود کرے، تو انہوں نے اولاً یوسف علیہ السلام کو تیار کیا اور اس طرح راستہ ہموار کرنے کے بعد والد بزرگوار کے پاس پہنچ کر ساری گفتگو کی، جس کا خلاصہ قرآن کریم نے چند جملوں میں بیان کیا کہ والد بزرگوار سے آکر انہوں نے کہا ''مالک لاتامنا علی یوسف'' اباجان! کیا وجہ ہے کہ آپ ہماری طرف سے یوسف کے بارے میں مطمئن نہیں ہیں۔

نام کا اثر

جن لوگوں نے یوسف کو عربی کا لفظ کہا ہے وہ کہتے ہیں کہ یوسف ''اسف'' سے مشتق ہے جو غم کے معنی میں ہے (امداد الباری شرح بخاری ج۲ص۴۴۹) اور ''تفسیر نسفی'' میں لکھا ہے کہ چونکہ یوسف کا مادہ اسف یعنی غم ہے لہذا وہ اپنے والد کے حزن وغم کا سبب بنے ہیں، گویا ان کے نام سے یہ چیز نکل رہی ہے، پھر خود حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی بہت زیادہ غم برداشت کیا ہے۔

میں اپنے اس خیال سے توبہ کرتا ہوں

ایک واقعہ یاد آیا اس امت میں ایک بزرگ گذرے ہیں حضرت جنید بغدادیؒ کے دور سے ان کا دور کچھ قریب ہے ان کو ایک روز یہ خیال پیدا ہوا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام پیغمبر تھے اور حضرت یوسف علیہ السلام میں چاہے کتنے ہی کمالات وخوبیاں ہوں بہر حال وہ مخلوق ہی تھے اور نبی کا قلب تو اللہ تعالی کی ذاتِ عالی ہی سے متعلق ہوتا ہے نہ کہ مخلوق سے تو اولاد کی محبت میں اتنا رونا اتنا رونا کہ آنکھیں سفید ہوگئیں، بینائی جاتی

رہی نابینا ہوگئے، گویا دل میں یہ ایک کھٹک پیدا ہوئی اور غیر اختیاری طور پر یہ خیال آیا، تو تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب وہ رات کوسوئے تو خواب میں حضرت یوسف علیہ السلام تشریف لائے اور حضرت یوسف علیہ السلام کوانہوں نے جو دیکھا تو ان پر بے ہوشی طاری ہوگئی اور اتنے گھنٹے بیہوش رہے کہ اس دوران ان کی تیرہ نمازیں قضا ہوگئیں، تیرہ نمازیں قضا ہونے کے بعد جب ہوش آیا تو انہوں نے اپنے اس خیال سے استغفار کیا اور کہنے لگے کہ اے پرودگار! میں اپنے اس خیال سے توبہ کرتا ہوں، چونکہ بڑے درجہ کے شخص تھے اسلئے تنبیہ کی گئی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے صالحین کی تنبیہ بھی عجیب ہوتی ہے۔

جنیداب تو وعظ کہوں گے؟

ضمناً ایک بات یاد آئی حضرت جنید بغدادیؒ وعظ نہیں کہتے تھے ان کے شیخ حضرت سرّی سقطیؒ ان سے کہتے تھے کہ تم وعظ کیا کرو، یہ انکار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ جب حضور ﷺ کی طرف سے اشارہ ہوگا اس وقت وعظ کروں گا، حضرت جنید نے بڑی ریاضتیں کی ہیں، تیس سال کا عرصہ ایسا گذرا ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد سے فجر کی نماز تک اسم ذات ''الله، الله'' کا ذکر کیا ہے، بہر حال ایک روز خواب میں آپ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا کہ جنید تم وعظ کہا کرو، صبح اٹھے تو اپنے شیخ کے گھر کی طرف روانہ ہوئے اور بہت خوش تھے کہ اطلاع کروں گا کہ نبیٔ کریم ﷺ کی طرف سے حکم ہوا ہے اس لئے اب میں وعظ کہا کروں گا اور آپ بھی چاہتے ہیں کہ میں وعظ کہا کروں اس لئے اب میں وعظ کہوں گا، جب شیخ کے گھر کے پاس پہنچے تو شیخ اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے تھے حضرت جنید کو دیکھ کر کہنے لگے کہ جنید! اب تو وعظ کہو گے حضرت جنید کو بڑا تعجب ہوا، پوچھا کہ حضرت! آپ کو کیسے خبر ہوئی؟ حضرت نے فرمایا کہ رات مجھ پر حق تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندوں کو اِس عالَم میں عجیب عجیب حالات سے گذارا ہے

تو کہنے کا منشا یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرتِ یوسف علیہ السلام سے جو لگاؤ تھا اس کی وجہ سے ان کے تعلق مع اللہ میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اس قسم کے واقعات جو انبیاء کرام علیہم السلام کو پیش آئے ہیں وہ در حقیقت ادھر ہی سے ان کی ترقی کیلئے پیش آئے ہیں حق تعالیٰ شانہ نے اپنے محبوب بندوں کو اس عالم میں عجیب عجیب حالات سے گذارا ہے اور یہ اللہ تعالی کا ایک نظام ہے کیونکہ اگر اس عالم میں سارے معاملات ہاتھ در ہاتھ ہوتے اور آزمائش نہ ہوتی تو پھر کوئی نافرمانی کی جرأت ہی نہ کرتا، مثلاً جب بھی کوئی آدمی فجر کی نماز نہ پڑھے اور اس کے بستر میں یا اس کی لنگی میں یا اس کی رضائی میں بچھو آجائے تو کیا کوئی بے نمازی رہے گا؟ نہیں، اگر آدمی بدنگاہی کرے اور غیب سے فوراً اس کو ایک طمانچہ پڑے اور اس کی بینائی چلی جائے تو کیا کوئی بد نگاہی کر سکتا ہے؟ نہیں، اگر کوئی شخص حرام لقمہ منہ کے پاس لے جائے اور اس کا ہاتھ اکڑ جائے تو کیا کوئی حرام لقمہ کھا سکتا ہے؟ نہیں۔

ایک ہے مشیت اور ایک ہے اللہ تعالی کی رضا

یہاں ایک کام کی بات سن لیں، مجھ سے بڑودہ میں ایک شخص نے سوال کیا اور کہا کہ یہ سوال میں کئی لوگوں سے پوچھ چکا ہوں آج آپ سے بھی پوچھتا ہوں وہ میرے پڑھنے کا زمانہ تھا اللہ تعالی نے دو چار باتیں مجھ سے بلوادیں (کہلوادیں) اس سے اس کو اطمینان ہو گیا، اس کا سوال یہ تھا کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالی کی مرضی کے بغیر پتہ بھی نہیں ہلتا پھر زانی کے زنا سے حمل کیوں قرار پاتا ہے؟۔

میں نے کہا کہ میں آپ کا سوال اور مضبوط کر دوں؟ اس نے کہا بہت شوق سے، میں نے کہا کہ دیکھو کافر کفر کرتا ہے وہ بھی ہو جاتا ہے حالانکہ کفر زنا سے زیادہ شدید ہے اس کے باوجود کوئی آدمی بت کے سامنے جھکتا ہے تو اس کا سر بت تک پہنچتا ہے یہ نہیں کہ وہ اکڑ جاتا ہو، اسی طرح یہ بھی نہیں ہوتا کہ کوئی آدمی حرام لقمہ کھائے اور اس کا ہاتھ سخت ہو جائے، اسی طرح خنزیر کا گوشت کھانا، شراب پینا، زنا کرنا اور جتنی بھی برائیاں ہیں ان تمام کو سمجھنے کیلئے ایک قاعدۂ کلّی سمجھ لیں اور آپ لوگ بھی ذرا غور سے سنے ممکن ہے بعض لوگوں کو پلّے نہ پڑے۔

دیکھئے! دو چیزیں ہیں، ایک ہے مشیت اور ایک ہے اللہ تعالیٰ کی رضا، رضا کا مطلب یہ ہے کہ اس عمل سے اللہ تعالیٰ خوش ہیں اور مشیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی حکمت کی وجہ سے اس چیز کو ہونے دے اسکے لئے خوش ہونا ضروری نہیں، اتنی بات تو سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ ایک تو ہے اللہ تعالیٰ کا خوش اور راضی ہونا اور ایک ہے کسی مصلحت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کا چاہنا، دونوں چیزوں میں یہ فرق ہے، دنیا میں اس آسمان کی چھت کے نیچے جتنے گناہ ہوتے ہیں، کفر، شرک، زنا، چوری ڈکیتی وغیرہ وغیرہ یہ تمام کے تمام گناہ وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ زنا سے، چوری سے اور جھوٹ سے خوش نہیں ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ خنزیر کا گوشت کھانے اور بت پرستی سے خوش نہیں ہے اتنا تو آپ کو سمجھ میں آ گیا ہوگا، اب سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ راضی اور خوش نہیں ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ ان چیزوں کو وجود میں کیوں لاتے ہیں؟ گویا ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ آدمی جھوٹ بولنے لگے اور زبان اکڑ جائے آدمی زنا کرنے لگے اور عضو سکڑ جائے، کوئی آدمی بت کی طرف جھکنے لگے اور اس کی پیٹھ تختہ کی طرح ہو جائے، مگر ایسا نہیں ہوتا، ایسا کیوں؟۔

اب اس کو سمجھنے کیلئے ایک بات سنئے! وہ یہ کہ اختیار ہمیشہ دو چیزوں سے تعلق رکھتا ہے اور اضطرار میں ایک چیز متعین ہوتی ہے اختیار کا مطلب یہ ہے کہ جیسے ایک شخص آپ کا غلام ہے آپ نے اس کو شوپنگ کیلئے بازار بھیجا اور یہ کہا کہ تم بازار سے گوشت یا سبزی لے آؤ، آپ نے اسکو دو میں سے ایک بات کی اجازت دیدی (ایک بات کا اختیار دیدیا) کہ گوشت لاؤ یا سبزی لاؤ یہ تو ہوا اختیار اور اگر آپ نے کہا کہ گوشت ہی لانا تو ظاہر ہے کہ اب اس کو سبزی لانے کا اختیار نہیں ہوگا یہ ایک موٹی سی حقیقت ہے، تو اختیار ہمیشہ دو یا دو سے زیادہ چیزیں چاہتا ہے اور اگر ایک چیز آپ نے متعین کردی تو اس صورت میں اس کو اختیار نہیں رہے گا، اب آپ دیکھئے کہ اللہ جل جلالہ وعم نوالہ یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی آدمی نیک کام کرے تو اپنے اختیار کے ساتھ کرے اور برائی سے بچے تو اپنے اختیار سے بچے مجبور ہو کر نہیں جیسے مثلاً اللہ تعالی چاہتے ہیں کہ میرے بندے نماز پڑھیں لیکن اللہ تعالی کی یہ چاہت اس شان کے ساتھ ہے کہ بندہ کو مکمل اختیار ہے اگر وہ نہ پڑھنا چاہے تب بھی اس کو مکمل اختیار ہے اور نہ پڑھنے پر یہاں کچھ عذاب نہیں البتہ آخرت میں خبر لی جائے گی، چونکہ اگر ایسا ہوتا کہ نماز نہ پڑھنے پر بچھو کاٹنے لگتا تو ظاہر بات ہے کہ پھر تو ہر آدمی مسجد کا رخ کرلیتا، اسی طرح اللہ تعالی چاہتے ہیں کہ میرے بندے سچ بولیں چنانچہ اگر کوئی سچ کو چھوڑ کر جھوٹ بولنا چاہے تو اس کو اختیار ہے، اسی طرح اگر کوئی مسجد میں جانے کے بجائے کلب میں جانا چاہے تو اس کو اختیار ہے، اور اگر ایسا ہوتا کہ مسجد کے بجائے کسی گناہ کے مقام پر جانا چاہتا اور پیر اکڑ جاتے یا فوراً زلزلہ آجاتا اور اس وجہ سے آدمی اس سے بچتا تو ظاہر بات ہے کہ وہ مجبوراً بچتا نہ کہ اپنے اختیار سے، اسی طریقہ سے نیکی کا حال ہے مثلاً آپ چاہیں تو تلاوت کریں اور اگر نہ چاہیں نہ کریں اور اگر ایسا ہوتا کہ مثلاً اگر لوگ دن میں دس بجے تلاوت نہ کریں تو ان کو

ایک سو چھ ڈگری بخار آجائے، یا کپکپی آجائے، یا سانس اکھڑ جائے تو ساری مسجد تلاوت کرنے والوں سے بھر جائے گی سارے لوگ گھر میں تلاوت کرنے بیٹھ جائیں گے یا کام پر لوگ تلاوت کرنے بیٹھ جائیں گے، یا تو یٰس شریف کی تلاوت زبانی شروع کردیں گے یٰس شریف بھی لوگوں نے مُردوں کے لئے رکھی ہے اور یہ سمجھ رکھا ہے کہ جو نہ مرتا ہو وہ اس سے مرجاتا ہے حالانکہ قرآنِ کریم تو مُردوں میں جان ڈالنے کیلئے آیا ہے اور ہم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جس کی جان نہ نکلتی ہو اس کے سامنے قرآن شریف پڑھا جائے تاکہ جان جلدی نکل جائے حالانکہ قرآنِ کریم تو اسلئے آیا ہے کہ جن میں جان نہیں ہے ان میں جان پڑ جائے، بہرحال میں نے ان کے سامنے اس بات کی وضاحت کی کہ جب آپ یہ حقیقت سمجھ گئے تو اب آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ خدا تعالیٰ انہیں کاموں سے راضی ہے جن کے کرنے کا اس نے حکم دیا ہے اور جن کاموں کے کرنے سے منع کیا ہے ان میں خدا تعالیٰ کی خوشی نہیں ہے، جیسے زنا سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے اگر کوئی زنا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس عمل سے خوش نہیں ہے مگر پھر بھی زنا کا وجود اس لئے ہوتا ہے کہ اس کی چاہت مصلحت والی ہے، خوشی والی نہیں، اگر اللہ تعالیٰ کی چاہت نہ ہوتی تو زانی زنا سے مجبور ہوکر بچتا اور خدا تعالیٰ چاہتے ہیں کہ بندہ اپنے اختیار سے بچے، اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہتے تو زنا کا وجود ہی نہ ہوتا اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ڈھیل دے رکھی ہے کہ اگر زانی زنا کرنا چاہے تو کرسکتا ہے اور اگر بچنا چاہے تو اپنے اختیار سے بچ سکتا ہے اور یہی کمال کی بات ہے، اگر کوئی بدنظری کرنا چاہے تو کرے خوب گھور گھور کر نامحرم کو دیکھے اس کو اختیار ہے شریعت چاہتی ہے کہ آدمی اپنے ختیار سے اپنے آپ پر کنٹرول اور قابو کرے یہ اصل ہے اس بات کو میں نے ان کے سامنے ذرا وضاحت سے بیان کیا تو انہوں نے کہا کہ الحمدللہ بہت اطمینان ہوا سارے اشکالات

دور ہو گئے۔

آپ کے اوپر سے تو نہیں چلی گئی؟

معلوم نہیں یہ بات آپ لوگوں کے پلّے پڑی یا نہیں (سمجھ میں آیا یا نہیں) یا میں کرسی پر بیٹھا ہوں تو یہ بات آپ کے اوپر سے چلی گئی؟ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ اور آواز سائنسی اعتبار سے بھی اوپر کی طرف جاتی ہے آواز کا رخ اوپر کی طرف ہوتا ہے اس لئے مائک بھی اوپر ہونا چاہئے، یہ خدائی نظام ہے۔

اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ بندے اپنے اختیار سے نیک بنیں

بہر حال اللہ تعالیٰ جیسے حکیم مطلق ہے ویسے حاکمِ مطلق بھی ہے اس لئے اس نے یہ چاہا کہ بندے اپنے اختیار سے نیک بنیں ورنہ مجبوراً کی ہوئی نیکی بھلا کوئی نیکی ہے؟ مثلاً ایک آدمی کی نظر غلط اٹھی اور اس کو فرشتہ نے فوراً تھپڑ مارا اور اس نے بدنظری بالکل چھوڑ دی، ایک آدمی نے ڈاڑھی منڈانا شروع کیا اور وہیں میکائیل علیہ السلام نے زور سے ایک چپت لگائی کہ حضور ﷺ کے چہرے کے خلاف چہرہ بناتا ہے اور وہ سنت کا پابند ہو گیا، تو یہ سنت کا پابند ہونا ڈنڈے کے زور سے ہوا یہ قابل اعتبار نہیں اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ بندہ کا ہر کام اختیار سے ہو، تاکہ اس کو اس پر جزا اور سزا دی جاسکے۔

جب کام کرنے میں اختیار ہے تو چھوڑنے میں بھی اختیار ہے

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے نام ایک خط آیا اس میں سائل نے گناہوں کی ایک فہرست لکھی تھی کہ مجھ سے یہ یہ گناہ ہوتے ہیں اور گناہ چھوٹتے نہیں، وہ تو حکیم الامت تھے، حضرت نے اس فہرست کے سامنے ایک جملہ لکھا کہ اپنے ہر ہر گناہ کے سامنے یہ لکھدو کہ آپ نے یہ گناہ اپنے اختیار سے کیا ہے یا بلا اختیار وہ شخص منصف اور معتدل مزاج تھا اس نے لکھا کہ فلاں فلاں گناہ میرے اختیار

سے ہوا، حضرتؒ نے فرمایا کہ آپ کو جب گناہ کرنے میں اختیار ہے تو یقیناً گناہ چھوڑنے میں بھی اختیار ہوگا اور معاملہ بھی یہی ہے، اگر آپ پچھلی تفصیل سمجھ گئے ہوں تو یہ واقعہ یقیناً سمجھ میں آ گیا ہوگا۔

بڑی ذات کے سامنے درخواست رکھنے سے پہلے کوئی تمہید ہونی چاہئے

تو خیر میں یہ عرض کہہ رہا تھا کہ بھائیوں نے کہا ''مالک لاتامنا علی یوسف'' کیا بات ہے کہ آپ یوسف کے باب میں ہم سے مطمئن نہیں ہے ''وانا لہ لنصحون'' اور ہم تو اس کے حق میں بڑے خیر خواہ ہیں، یہ تمہید ہے، قرآن کریم سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ کوئی آدمی کسی مقام پر کسی بڑی ذات کے سامنے کوئی درخواست رکھے تو اس کے لئے کوئی تمہید ہونی چاہئے، مثلاً آپ بادشاہ کے پاس کوئی چیز لینے کے لئے جائے تو اس کی ایک شکل یہ ہے کہ آپ بادشاہ کے پاس جا کر کہیں کہ کچھ دو اور دوسری شکل یہ ہے کہ آپ جا کر کہیں کہ آپ کی سخاوت کا دنیا میں چرچا ہے اور آپ کے کمالات کا غلغلہ عالم میں بلند ہے اس کے بعد پھر آپ اصل بات عرض کریں، تو دونوں شکلوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، تو قرآنِ کریم کا یہ اسلوب بھی درخواست پیش کرنے کا طریقہ بتلا رہا ہے۔

اسلوب کا بڑا فرق پڑتا ہے

تصور کیجئے کہ کسی لڑکے سے اس کے والد کے متعلق کوئی پوچھے کہ یہ کون ہے، تو جواب کا ایک اسلوب تو یہ ہے کہ وہ کہے کہ یہ میرے قبلہ والد بزرگوار ہیں، تو اس سے باپ کا بھی جی خوش ہو جائے گا اور اگر وہ کہے کہ یہ میرے والد صاحب ہیں تو اس سے بھی باپ کا جی خوش ہوگا لیکن پہلے کی بہ نسبت کم اور اگر وہ کہتا ہے کہ میرے والد ہیں اس سے بھی جی خوش ہوگا لیکن اور کم اور اگر وہ کہے کہ میری والدہ کے شوہر ہیں تو بتائیے! کیا اس

سے باپ کا دل خوش ہوگا؟ نہیں، حالانکہ بات تو اس نے بالکل صحیح کہی ہے کہ میری والدہ کے شوہر ہیں، لیکن پہلے جوابات اور اس جواب میں زمین وآسمان کا فرق ہے، بہر حال اسلوب کا بڑا فرق ہوتا ہے، تو بھائیوں نے جا کر ڈائریکٹ یہ بات نہیں کہی بلکہ اولاً انہوں نے کہا ''یـــا ابـــانـــا'' اے ہمارے والد بزرگوار! اس سے معلوم ہوا کہ ان کے یہاں تہذیب بھی تھی اور ادب بھی تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو انہوں نے والد کہا۔

بھائیوں نے عنوان بڑا شائستہ اختیار کیا

تو بھائیوں نے کہا کہ 'یاابانا '' اے ہمارے والد بزرگوار!'' مالک لاتامنا '' کیا بات ہے کہ آپ یوسف کے باب میں ہم سے مطمئن نہیں '' وانـالـه لـنـاصحون '' حالانکہ ہم تو اس کے حق میں خیر خواہ ہیں، انہوں نے یہ تمہید اختیار کی، مقصد ان کا حضرت یوسف علیہ السلام کو باپ سے جدا کرنا تھا مگر انہوں نے عنوان بڑا شائستہ اختیار کیا ہے اس کلام سے ان کی تہذیب کا پتہ چلتا ہے، بقیہ تفصیل انشاء اللہ آئندہ مجلس میں عرض کریں گے، دعا کیجئے اللہ پاک ہمیں قرآن فہمی نصیب فرمائیں اور اس پر عمل کی توفیق نصیب فرمائیں۔ آمین۔

۞۞۞۞۞

درس نمبر سترہ سے حاصل ہونے والی دو اہم ہدایات

(۱) نام کا بھی اثر پڑتا ہے جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں گذرا اس سے ہمیں یہ سبق ملا کہ نام بھی سوچ سمجھ کر اچھا رکھنا چاہیئے۔

(۲) بھائیوں نے اپنے والد سے کہا ''مـالک لاتـامنا علے یوسف '' کیا بات ہے کہ آپ یوسف کے باب میں ہم پر مطمئن نہیں ہیں 'وانـا لـه لنصحون،' اور ہم تو اس کے حق میں بڑے خیر خواہ ہیں۔

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ کوئی آدمی کسی مقام پر کسی بڑے شخص کے سامنے کوئی درخواست رکھے تو اس کے لئے کوئی تمہید ہونی چاہیے۔

حضرت خطیب الامتؒ کے بارے میں کہی گئی تعزیتی نظم کے چند اشعار

از: نادر لاجپوری (حال مقیم، باٹلی انگلینڈ)

چل بسا جو صاحب ارشاد تھا مفتی گجرات کا داماد تھا
تھا مجاز طیب ذی شان جو صاحب دل صاحب عرفان جو
چل بسا جو تھا طریقت کا امام چل بسا وہ لائق صد احترام
وقت کا جو تھا غزالی چل بسا تھا خطیب اک بے مثالی چل بسا
وقت کا تھا ایک رازی چل بسا لے کے شان امتیازی چل بسا
چل بسا فخر زماں وہ چل بسا علم کا بحر رواں وہ چل بسا
چل بسا تفسیر داں وہ چل بسا خواب کی تعبیر داں وہ چل بسا
چل بسا جو زاہد و خو د دار تھا عالم اسلام کا شہکار تھا
چل بسا جو تھا بڑا ہی ذی وقار پارسا ہمدرد مخلص غم گسار
چل بسا جو تھا کمال شخصیت چل بسا جو تھا سراپا عبدیت
چل بسا جو متقی تھا نیک تھا اور نادر لاکھ میں جو ایک تھا

دے خدا اس کو دعا صبح و شام
جنت الفردوس میں اعلی مقام

درس نمبر (١٨)

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم امابعد!

فاعوذ بالله من الشیطن الرجیم ، بسم الله الرحمن الرحیم

ارسله معنا غدا یرتع ویلعب وانا له لحافظون☆قال انی لیحزننی ان تذهبوا به واخاف ان یاکله الذئب وانتم عنه غٰفلون☆(یوسف ،آیت: ١٢/١٣)☆ صدق الله العظیم.

آپ ہم سے یوسف کے باب میں مطمئن کیوں نہیں ہیں؟

بزرگانِ محترم! بات یہ چل رہی تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے یہ بات رکھی کہ آپ ہم سے یوسف کے باب میں مامون اور مطمئن کیوں نہیں ہیں؟ ہم تو ان کے خیر خواہ ہیں بدخواہ نہیں ہیں (معارف القرآن ج۵ص۲۱) یہ بات بطورِ تمہید کے حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے ان کے صاحبزادوں نے پیش کی، اگر نیت کو دیکھا جائے تو اس بات میں صداقت اور سچائی نہیں تھی اور یہی وہ سب باتیں ہیں جن کی بنیاد پر اربابِ تحقیق کا خیال ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادے نبی نہیں تھے، اگر نبی ہوتے تو ان سے اس قسم کی باتیں سرزد نہ ہوتیں (معارف القرآن ج۵ص۱۸،۱۹) مگر میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ ان حضرات کے صحابی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے اور بعد میں انہوں نے خود بھی استغفار کیا اور حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی ان کا قصور معاف کیا اور ان کے والد بزرگوار حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی ان کا قصور معاف کیا اور ان کیلئے استغفار بھی کیا اور اس سے متعلق کچھ باتیں عصر کے بعد کی مجلس میں ہوچکی ہیں، یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ بھائیوں نے یہ بات بڑے عمدہ پیرایہ میں کہی اور انہوں نے اپنا مدّعا، اپنا مقصود،

اور اپنی مراد اچھے انداز میں پیش کی ، حضرت یعقوب علیہ السلام سے انہوں نے کہا کہ ''ارسله معنا غدا '' یوسف کو ہمارے ساتھ آئندہ کل بھیجئے ، وہ لوگ جنگل میں جاتے تھے اور اپنی ضروریات پوری کرتے تھے اور کبھی تفریح اور دوڑ بھی لگاتے تھے اور مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام سے مل کر ان کا ذہن بھی ہموار کیا تھا اور ان کو اس کے لئے پہلے سے تیار کرلیا تھا (معارف القرآن ادریسی ج ۴ ص ۱۰۲) کہ ہماری رغبت یہ ہے کہ آپ ہمارے ساتھ جنگل کی کھلی فضا اور نشاط انگیز ماحول میں چلیں اس سے طبیعت میں تازگی پیدا ہوجائے گی کچھ گھوم پھر لیں گے اور آج کی زبان میں فریش (FRESH) ہوجائیں گے ، تو بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے بھی یہ بات رکھی تھی چونکہ وہ نوعمر اور کمسن تھے اور ان چیزوں کی طرف طبعی طور پر بچہ کو رغبت ہوتی ہے ویسے انبیاء کرام علیہم السلام کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں یہ بات اپنی جگہ پر ہے چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام تو راضی ہو گئے اب مسئلہ تھا حضرت یعقوب علیہ السلام کا وہ اپنی نگاہوں سے یوسف کو اوجھل کرنا نہیں چاہتے تھے ، تو ان کے سامنے ایک تمہید رکھی اور اس کے بعد اپنا مدعا اور مقصود رکھا کہ ''ارسله معنا غدا یرتع ویلعب'' آئندہ کل یوسف کو ہمارے ساتھ بھیجئے کہ وہ کھائیں اور کھیلیں اور اگر آپ کو کسی قسم کا خدشہ اور اندیشہ ہو تو ''وانا له لحافظون '' بیشک ہم ان کے حق میں محافظ ہیں ہم ان کی پوری حفاظت کریں گے ، آپ مطمئن رہیں اور اطمینان رکھیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کو غم میں ڈالنے والی بات

چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب ان کا مدعا اور مقصود وضاحت اور صراحت کے ساتھ سن لیا تو انہوں نے بھی اپنے پیغمبرانہ اور معصومانہ انداز میں اپنے دل کی بات کہدی ۔ فرمایا ' انی لیحزننی ان تذهبوا به '' میرے لئے غمناک بات ،

مجھے کڑھن اور غم میں ڈالنے والی بات اور تکلیف دینے والی بات یہ ہے کہ تم یوسف کو میری نگاہوں سے اوجھل کردو، تم انہیں لے جاؤ اور میرے اور اس کے درمیان فراق ہوجائے، میں نہیں چاہتا کہ میرا لختِ جگر میری نگاہوں سے ہٹے، جی یہی چاہتا ہے کہ وہ ہمیشہ میری نگاہوں کے سامنے رہے اور پھر فرمایا ''واخاف ان یاکلہ الذئب'' اور مجھے دوسرا خدشہ اور خطرہ یہ ہے کہ کہیں بھیڑیا ان کو نہ کھالے اور تم یہ خیال کرو کہ تم کئی ہو اور تم نگرانی کروگے جیسا کہ تم نے حفاظت کا وعدہ کیا ہے ''وانتم عنہ غٰفلون'' ممکن ہے کہ تم اپنے کام میں ایسے مشغول ہوجاؤ کہ تم سے غفلت ہوجائے اور یوسف کو بھیڑیا کھالے۔

کہیں اسے بھیڑیا نہ کھالے

تو بیٹوں سے حضرت یعقوب علیہ السلام نے دو باتیں کہیں (۱) یہ کہ یوسف کی جدائی اور فراق میرے لئے تکلیف دہ ہے (۲) اور مجھے یہ خوف ہے کہ کوئی بھیڑیا اسے نہ کھالے اس کی وجہ تاریخ اور تفسیر کی کتابوں سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہاں کی زمین میں بھیڑیئے بہت تھے (معارف القرآن ج ۵ ص ۲۱) اس پر بھائیوں نے کہا کہ ''لئن اکلہ الذئب'' اگر بھیڑیا یوسف کو کھالے حالانکہ ہم ایک جتھہ اور ایک پوری کی پوری جماعت ہیں ''انا اذا لخاسرون'' تب تو ہم بڑے نکمے اور ناکارہ ثابت ہوں گے، ہم جیسے تن ومند، توانا، قوی ہیکل اچھے خاصے جوان اور اتنی بڑی جماعت کے ہوتے ہوئے یوسف جیسے ننھے منھے کو بھیڑیا کھا جائے یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوا تب تو یہ بڑے خسارے اور بڑے ٹوٹے کی بات ہوگی اور ہمارا ناکارہ پن اور نکماپن ثابت ہوگا اس لئے آپ اطمینانِ خاطر رکھے کہ ایسا نہیں ہوگا۔

بہت سی جدائیاں مقدمہ ہوتی ہیں کسی اچھے نتیجہ کا

اور بہت سی جدائیاں اس عالم میں پیش خیمہ، مقدمہ اور عنوان ہوتی ہیں کسی

اچھے نتیجہ کا، حضرت یعقوب علیہ السلام بھی یہ نہیں جانتے تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ تکلیف دہ جدائی بعد کی اس ملاقات کا سبب بنے گی جس میں بے پناہ شادمانی اور مسرت ہوگی اور ایسا ہوتا ہے، چنانچہ کتابوں میں لکھا ہے کہ جب روح اُس عالم سے اِس عالم میں لائی گئی اور خاص طور سے اس بدن میں بند کر دی گئی تو اس کو اور زیادہ گھٹن محسوس ہوئی، یہی وجہ ہے کہ بعض عارفین نے تہجد کے وقت اخیری شب میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کے باب میں ایک عجیب وغریب بات لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ بدن میں بند ہونے والا یہ پرندہ یعنی یہ روح جس کو اُس عالم سے لاکر اِس بدن میں بند کر دیا گیا اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام سے جدا کر کے کنویں میں بند کر دیا گیا مگر جیسے اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کیلئے ترقی کی شکلیں تھیں ویسے ہی روح کیلئے بھی اِس عالم میں ترقی کی شکلیں ہیں۔

بوالہوس نے دونوں کی مٹی خراب کی

اس کو آپ ایک مثال سے سمجھیں کہ ایک آدمی ہو ہندوستان کا یا پاکستان کا اور وہ کسی پر عاشق ہو اور عشق بھی سڑک چھاپ نہیں، ایک عشق ہوتا ہے سڑک چھاپ کہ صبح نیا معشوق، دوپہر کو دوسرا معشوق، شام کو تیسرا معشوق، غرض جو سامنے آ گیا وہ معشوق بقول شخصے ؎

خواہش کا نام عشق رکھ دیا اور بناوٹ کا نام حسن
کیا بوالہوس نے دونوں کی مٹی پلید کی

من بچشمِ خود دیدم

تو وہ عاشقِ صادق ہو، اس کو سچا تعلق ہو اور سچا تعلق بھی ایسا جس کی ایک مثال میں آپ کو بتاؤں، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کا نام تو آپ نے سنا ہوگا ان

کے انتقال کوتقریباً ڈیڑھ صدی گذر رہی ہے آپ ہندوستان کے مایہ ناز محدث، مایۂ ناز مفسر اور برِصغیر کی گردن پر آپ کا بہت بڑا علمی، روحانی اور عرفانی احسان ہے، ان کے بھائی شاہ اہل اللہ کا بیان کردہ یہ واقعہ ہے اور بعضوں نے اس کو ان کے خاندان کے دوسرے افراد کی جانب بھی منسوب کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ دہلی میں ایک طالب علم تھا وہ مارواڑی کی لڑکی پر عاشق ہوگیا اور یہ ذہن میں رہے کہ پہلے میلان ہوتا ہے پھر رجحان ہوتا ہے رجحان کے بعد محبت ہوتی ہے اور محبت کے بعد عشق ہوتا ہے عشق کے بعد جنون ہوتا ہے اور جنون کے بعد فنون یعنی فنا ہونا ہوتا ہے، تو یہ درجات ہیں عشق کے (مجالسِ خطیب الامت ص۱۰۳) جیسے کورس میں درجات ہوتے ہیں ویسے یہ دنیائے محبت کا کورس اور اس کے درجات ہیں، بہر حال ایک طالب علم ایک مارواڑی کی لڑکی پر عاشق تھا اور وہ لوگوں میں نیک طینت سمجھا جاتا تھا اس زمانہ میں طبیعتوں میں شر نہیں تھا اس لئے باپ نے کہا کہ اگر تم چاہو تو لڑکی مسلمان ہوجائے اور تم اس سے شادی کرلو یا تم ہمارے مذہب کو قبول کرلو اور پھر شادی ہوجائے مگر اس طالب علم نے انکار کیا اور کہا کہ ہمارا یہ رشتہ ہے ہی نہیں، خیر کچھ دن گذرے اس لڑکی کا پیمانۂ حیات بھر چکا تھا اس کا انتقال ہوگیا انتقال کے بعد ہندوؤں کی رسم کے مطابق اس لڑکی کو ان کے شمسان میں لے گئے وہاں اسے جلایا گیا اور جو کچھ ان کو کرنا تھا انہوں نے کیا، یہ طالب علم درخت کی ٹہنی پکڑے ہوئے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا، جب اسے جلا کر لوگ لوٹے ہیں تو ایک شخص نے کہا میاں! جو کچھ ہونا تھا ہو چکا جسے جانا تھا وہ جاچکا اب صدمہ سے کیا فائدہ؟ چلو اپنا کام کرو، وہ بھنے ہوئے تو تھے ہی بس انہوں نے ایک آہ بھری اور اندر سے ایک شعلہ اٹھا اور سارا کا سارا بدن جل کر خاک کا ڈھیر ہوگیا، شاہ اہل اللہ لکھتے ہیں کہ ’’من بچشمِ خود دیدم‘‘ میں نے یہ واقعہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

ایک عجیب وصیت

اورنگ آباد میں ایک بزرگ تھے وہ سوختہ صاحب کہلاتے تھے بڑے پایہ کے شخص تھے انہوں نے مرنے سے پہلے وصیت کی کہ مجھے انتقال کے بعد غسل نہ دیا جائے، اب بھی ان کا مزار ہے، ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے سوچا کہ جو وصیت خلافِ شرع ہو اس پر عمل نہیں ہوتا، یہ ایسی وصیت ہے جو نا قابلِ عمل ہے مگر پھر لوگوں کو خیال ہوا کہ اتنے بڑے درجہ کے شخص تھے، ان کی پرہیز گاری اور ان کا تقویٰ مسلم ہے ممکن ہے کہ اس وصیت میں کوئی راز ہو اور ان کا کوئی خاص معاملہ ہو تو ایک شخص نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ ایسا ہو کہ ہم پہلے ان کے پاؤں کے انگوٹھے پر پانی ڈالے اور دیکھیں کیا ہوتا ہے، چنانچہ پانی جو ڈالا تو جیسے راکھ ہوتی ہے اس طرح وہ انگوٹھا بہہ گیا اور پانی کچھ آگے بڑھا تو آگے کا بدن بھی بہہ گیا جیسے راکھ ہو یہ کیفیت تھی، چنانچہ انہیں اسی طرح دفنا دیا گیا۔

عارف رومیؒ کی ایک عجیب تحقیق

کہنے کا منشا یہ ہے کہ یہ ایک مستقل دنیا ہے، تو بہر حال جب روح اُس عالم سے لاکر اس بدن میں بندھ کردی گئی تو اس پر اس کا بڑا بوجھ تھا مگر اسے کیا پتہ تھا کہ یہ اسکے لئے ترقی کا سامان اور تمہید ہے، جیسے عارف رومی رحمہ اللہ بانسری کی سریلی آواز کا راز واشگاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بانسری درخت کی شاخ سے کاٹ کر بنائی جاتی ہے چونکہ اسے اپنی اصل سے کاٹا گیا ہے تو اصل سے بُعد اور فراق کے نتیجہ میں اس کے سینہ سے یہ سُریلی آواز نکل رہی ہے، یہ تعبیر ہے عارفِ رومیؒ کی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی ساری مشکلات کا سبب دو چیزیں بنیں یرتع ویلعب

تو کہنے کا منشا یہ ہے کہ یہاں بھی روح کے باب میں یہی حقیقت ہے کہ وہ لاکر

اس بدن میں بند کی گئی، تو عارفین لکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے اپنے باپ سے اجازت لیکر لے جانا چاہا تو پہلی بات تو یہ کہی ''ارسلہ معنا غدا یرتع ویلعب '' آپ انہیں ہمارے ساتھ بھیجئے یہ خوب کھائیں گے اور کھیلیں گے اس میں ایک بات یہ ذہن نشین رہے کہ یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادوں کی نیت ٹھیک نہیں تھی، وہ ان کو باپ سے جدا کرنا چاہتے تھے مگر جدائی کیلئے دو چیزیں عنوان بنی ہیں بھائیوں نے کہا کہ انہیں آئندہ کل ہمارے ساتھ بھیجئے کہ خوب کھائیں اور کھیلیں، ''یرتع ویلعب ''ارباب تحقیق نے لکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی تمام مشکلات کا سبب دو چیزیں بنی ہیں، کھانا اور کھیلنا، گوان کیلئے اس کی شرعاً اجازت تھی کہ وہ بچہ تھے اور وہ کھیل خلافِ شرع نہیں تھا وہ کوئی ایسا کھیل نہیں تھا جس میں نمازیں فوت ہوں وہ کوئی ایسا کھیل نہیں تھا جس میں ہزاروں سینکڑوں روپیئے خرچ ہوں موجودہ دور کے کھیلوں کی طرح کوئی ناجائز کھیل نہیں تھا وہ تو دوڑ بھاگ کی ایک شکل تھی، تو بھائیوں نے دو لفظ ذکر کئے'' یرتع و یلعب،، کہ کھائیں اور کھیلیں۔

انسان کے مبتلائے آلام ومصائب کی دو بنیادیں

تفسیر مواہب الرحمٰن میں مولانا امیر علی صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہی دو بنیادیں ایسی ہیں کہ ان کی وجہ سے انسان مبتلائے آلام ومصائب ہوتا ہے گویا خواہشات کی بنیادیں ان دو لفظوں میں چھپی پڑی ہیں ایک کھانا دوسرا کھیلنا اور رہا پینا تو وہ کھانے کا نتیجہ ہے اور کھیلنا بھی اگر بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کھانے کا اثر ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کسی بچہ کا کھانا بند کر دیا جائے تو اس کا سارا کھیل تماشہ ختم ہو جاتا ہے اور بچہ کا کیا یہ سارے بڑے بڑے جو بیٹھے ہوئے ہیں اگر ان کا بھی کھانا بند ہو جائے تو ان کے سارے تماشے ہی ختم ہو جائیں اور سارا لطفِ زندگی ہی رخصت ہو جائے تو خواہشات

کی دو بنیادیں ہیں، ایک کھانا اور دوسرا کھیلنا ''یرتع ویلعب '' اور کہا '' وانا لہ لحافظون '' اور ہم ان کے حق میں محافظ ہیں، یہ کہکر باپ سے یوسف کو لینا چاہا۔

کبھی جائز خواہشات بھی آلام ومصائب کا سبب بن جاتی ہے

حضرت یوسف علیہ السلام تو خوش تھے کہ بھائیوں نے دلچسپی کا سامان اور ایک دلچسپی کا پروگرام ہمارے لئے طے کیا ہے، مگر ننھے منھے یوسف کو کیا خبر تھی کہ اسکے پیچھے کیا کیا مصائب ہیں جن سے دوچار ہونا ہے اس سے یہ نتیجہ بھی نکلا کہ نفس کبھی اپنی جائز خواہشات کی طرف قدم بڑھاتا ہے لیکن بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہی چیز اس کے مبتلائے آلام وآفات ہونے کا سبب بھی بن جاتی ہے اور اگر نہ سمجھ میں آتا ہو تو میں آپ کو ایک مثال دوں۔

سمندر میں ایک بڑی مچھلی تھی اس نے اور مچھلیوں سے کہا کہ اگر تمہیں کہیں کوئی گل (مچھلی شکار کرنے کا کانٹا جس میں روٹی یا بوٹی لگا دی جاتی ہے) نظر آئے، یہ گل (گرل) لڑکی کے معنی میں نہیں ہے یہ تو وہ گل ہے جس میں کچھ کھانے کی چیزیں اٹکا دی جاتی ہیں، ویسے یہ گرل بھی یورپ کا ایک مستقل گل ہے جس میں ہزاروں لوگ پھنستے ہیں، اُس گل میں مچھلیاں پھنستی ہیں اِس گرل میں خشکی کے جانور پھنستے ہیں تو بڑی مچھلی نے کہا کہ اگر کہیں کوئی گل نظر آئے اور اس میں کھانے کی چیز ہو تو اس کو کھانے سے احتیاط اور پرہیز کیا جائے ورنہ انجام ٹھیک نہیں ہوگا، مچھلیوں نے سنا اور سن کر اَن سنی کر دی کہ ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے نکال دیا، اتفاق سے ایک مچھلی نے دیکھا کہ ایک گل ہے اور اس میں کوئی کھانے کی چیز ہے تو وہ آگے بڑھی اور اسے نگلنا چاہا مگر اسے کیا پتہ تھا کہ تھوڑی دیر میں وہ تری سے خشکی کی طرف اور اندر سے باہر کی طرف آجائے گی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کانٹا گلے میں پھنسا اور صیاد نے اسے کھینچا اور وہ تری سے خشکی کی

طرف آ گئی اس طرح وہ بے چین و بیقرار ہاتھوں سے پکڑی گئی اور پھر تلی گئی، بھنی گئی، چبائی گئی، کھائی گئی یہ سارا قصہ اسکے ساتھ ہوا اس وقت اسے یاد آیا کہ کسی کہنے والے نے صحیح بات کہی تھی۔

ابا جان اوپر سے نیچے آئے اس کا سبب بھی کھانا ہی تھا

تو پانی میں رہنے والی مچھلی اوپر یعنی پانی سے باہر آئی اور پانی اس سے چھوٹا یہ اس کی خواہش کی بنیاد پر ہوا اور ہم سب کے ابا جان حضرت آدم علیہ السلام اوپر سے نیچے آئے اس کی بنیاد بھی کھانا ہی تھا، نہ کہ نماز روزہ چھوڑنا، تو نیچے سے اوپر آنا اور اوپر سے نیچے آنا عالم میں یہ سارا انقلاب اسی خواہش کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

تقیدات وانقلابات کا سبب بھی یرتع ویلعب ہی ہے

اور اب بھی آپ کو یقین نہ آتا ہو تو کسی جیل خانہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر آپ قیدیوں سے قید خانہ میں آنے کا سبب پوچھیں تو پتہ چلے گا کہ کوئی اس لئے گرفتار ہے کہ اس نے کسی کی جیب پر دستِ اقدس ڈالا تھا یا کسی کی آبرو پر نگاہیں ڈالی تھیں، یا کوئی ایسا ہی کام کیا تھا جس میں اس کے نفس کا جذبہ اور خواہش کارفرما تھی جس کے نتیجہ میں آزادانہ زندگی گذارنے والا انسان بند ڈبے میں اور قید خانہ میں آ کر محبوس و مقید ہو گیا، تو معلوم ہوا کہ یہ تقیدات اور انقلابات اسی حرص کی بنیاد پر وجود میں آتے ہیں، تو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا کہ "یرتع ویلعب" اب حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کے جواب میں جو بات کہی وہ بھی عجیب ہے، آپ ذرا غور فرمایئے کہ بھائی یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ (یوسف علیہ السلام) کھائیں گے اور ابا جان یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں بھیڑیا اسے نہ کھالے، تو بیٹے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یوسف کھانے والے بنیں اور باپ اندیشہ جتا رہے ہیں کہ کہیں یوسف ماکول نہ بن جائیں یعنی

انہیں خود نہ کھالیا جائے، یہ ایک بات ہوئی اور اس سے پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے فراق کا تذکرہ کیا اور فرمایا کہ ''انی لیحزننی ان تذھبوا بہ '' تمہارا لے جانا ہی میرے حق میں باعثِ غم اور باعثِ حزن ہے۔

یہ قرآنِ کریم کا اعجاز ہے

تو بہرحال بھائیوں نے ان دو چیزوں کو بنیاد بنایا اور کہا کہ ہم ان کی پوری پوری حفاظت کریں گے، الغرض حضرت یعقوب علیہ السلام نے انہیں اجازت مرحمت فرمادی قرآنِ کریم نے اجازت کا صریح ذکر نہیں کیا اور یہ قرآنِ کریم کا اعجاز ہے کہ وہ بیچ کی کڑیوں کو حذف کردیتا ہے صرف ضروری باتوں کو بیان کرتا ہے اور یہ بلاغت ہے قرآنِ کریم کی۔

ایک ضروری تنبیہ

یہاں ایک بات اور سن لیں ممکن ہے آپ میں جو بوڑھے لوگ ہیں انہوں نے پرانی ''قصص الانبیاء،، دیکھی ہوں اس میں عجیب عجیب واہی تباہی بغیر سند کے قصے لکھے ہیں، اس میں لکھا ہے کہ عوج بن عنق ایک آدمی تھا اس کی عمر ۲۵ ہزار سال تھی اور قد اتنا لمبا تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں جب طوفان آیا تو پانی صرف اس کے ٹخنہ تک پہنچا اور وہ سمندر میں ہاتھ ڈال کر مچھلیاں پکڑ لیتا اور سورج کے قریب کرکے بھونتا تھا اور پھر اس کو کھاتا تھا۔ (تفسیروں میں اسرائیلی روایتیں ص ۱۲۰) پتہ نہیں سوتا کہاں تھا شاید پیر فیجی میں رہتا ہوگا اور سر امریکہ میں رہتا ہوگا اور پیشاب کرتا ہوگا تو نہ جانے کتنے ملکوں میں سیلاب آجاتا ہوگا بہرحال اس میں عجیب عجیب واقعات موجود ہیں۔ تو ایک پرانی قصص الانبیاء ہے جو بہت طویل ہے اور اس کے علاوہ بھی اس قسم کی جتنی کتابیں ہیں ان میں قصہ لکھنے والوں نے بہت رنگ بھرا ہے اور طبیعتوں میں رقّت پیدا کرنے

محفلوں میں رنگ جمانے اور طبیعتوں میں تاثر پیدا کرنے کیلئے عجیب عجیب چیزیں ذکر کی ہیں، مگر قرآنِ کریم کو ان تمام تفصیلات سے بحث نہیں ہے اور میں وہی بات کہوں گا جو سند اور تحقیق کی روشنی میں صحیح ہوگی ایسی واہی تباہی باتیں کہ جن کی کوئی سند نہ ہو اور جن کا کوئی سر پیر نہ ہو وہ آپ کو انشاء اللہ اس مجلس میں نہیں سنائی جائے گی، تحقیقی باتیں کہی جائے گی۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام کا حضرت یعقوب علیہ السلام سے ایک سوال

تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے دو باتیں ذکر کیں، ایک اپنے غم کا اظہار اور اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا اندیشہ کہ بھیڑیا اسے نہ کھالے، حافظ عماد الدین ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ بعض سلف سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ جبرئیلِ امین نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے پوچھا کہ آپ جانتے بھی ہیں کہ یہ سب پریشانی آپ کو کیوں پیش آئی؟ تو اس پر حضرت یعقوب علیہ السلام نے لاعلمی ظاہر کی تو جبرئیلِ امین نے فرمایا کہ آپ کو یہ سب پریشانی آپ کے اس جملے ''واخاف ان یاکلہ الذئب'' کہ مجھے یہ خوف ہے کہ کہیں یوسف کو بھیڑیا نہ کھا جائے اس کی وجہ سے پیش آئی۔

اسباب اختیار کرنا نبوت کے منافی نہیں ہے

ابوحیّان غرناطی رحمہ اللہ اپنی تفسیر ''بحرِ محیط'' میں لکھتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام بڑے درجہ کے پیغمبر تھے اور اسباب کا اختیار کرنا شانِ نبوت کے منافی نہیں ہے مگر بعض مرتبہ انبیاء کرام کی اسباب پر نظر جاتی ہے تو ان کی عظمتِ شان کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی طرف سے ان کی پکڑ ہو جاتی ہے اور یہ ان کے درجہ کے اعتبار سے ہے، ہمارے درجہ کے اعتبار سے نہیں۔

پیغمبر معصوم ہوتا ہے

ورنہ پیغمبر معصوم ہوتا ہے یہ ذہن میں رہے اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ پورے قرآنِ کریم میں حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ میں قرآنِ کریم نے دو لفظ ذکر کئے ہیں، ایک جگہ ''نَسِـــیَ آدم '' کہا کہ آدم (علیہ السلام) سے بھول ہوئی اور دوسری جگہ فرمایا'' وعـــصـــیٰ آدم '' کہ آدم (علیہ السلام) سے نافرمانی ہوئی، ہم اور آپ حضرت آدم علیہ السلام کے لئے نافرمانی کا لفظ نہیں کہہ سکتے لیکن حق تعالیٰ ایک جگہ فرمارہے ہیں'' عصیان،، اور دوسری جگہ فرمایا''نسیان،، اس میں اربابِ تفسیر نے تطبیق یہی دی کہ واقعۃً حضرت آدم علیہ السلام سے نسیان ہوا واقعۃً بھول ہوئی آپ کو یاد نہیں رہا کہ ایک خاص درخت کے قریب ہونے سے اور اس کا دانہ کھانے سے اللہ تعالی نے روکا ہے، لیکن ان کا درجہ اور ان کی شان اتنی بڑی ہے کہ اس نسبت کی وجہ سے اس بھول کو عصیان سے تعبیر کیا۔ (کشکول معرفت ص ۲۶۸/۲۶۹ بحوالہ روح المعانی پارہ ۱۶ ص ۲۷۰) اور ظاہر ہے کہ عام آدمی اور خاص آدمی میں فرق ہوتا ہے، مثلاً ڈبل سیٹ موٹر سائیکل کو کوئی عامی آدمی ٹریبل سیٹ چلائے تو اس کی نوعیت اور ہوگی اور ایک پولیس والا یہ کام کرے تو اس کی نوعیت اور ہوگی دونوں کی نوعیت میں بڑا فرق ہے تو پیغمبر کی معرفت کے لحاظ سے بعض مرتبہ چھوٹی بات پر بھی پکڑ ہو جاتی ہے، تو حضرت جبرئیلِ امین نے ان سے یہ بات کہی کہ آپ کا یہ جملہ آپ کی جملہ پریشانیوں کا سبب بنا ہے۔

ساری فرحتوں کا سبب لا تایئسوا من روح اللہ ہے

اور پھر پوچھا کہ آپ کو جو مسرتیں نصیب ہوئیں حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات ہوئی سارا خاندان ایک ساتھ مل گیا یہ ساری فرحتیں اور یہ ساری مسرتیں یہ ساری خوشیاں تمہیں کیوں ملی جانتے ہو؟ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا میں نہیں جانتا، تو

حضرت جبرئیلِ امین نے بتایا کہ آپ نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا ''لاتایئسوا من روح اللہ'' کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس مت ہو، بس آپ کا یہ جملہ آپ کے لئے ساری مسرتوں کا اور ساری خوشیوں کا سبب بن گیا (تفسیر ابن کثیر)۔

بھیڑیئے کی خصوصیت

آپ یہاں یہ بات بھی سنتے چلیں کہ بھڑیئے کی یہ خصوصیت لکھی ہے کہ یہ جب سوتا ہے تو چونکہ خود کا باطن ٹھیک نہیں اس لئے ہر وقت خطرہ میں رہتا ہے، تو سوتے ہوئے ایک آنکھ بند کرتا ہے اور ایک آنکھ کھلی رکھتا ہے، صاحبِ مستطرف نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ یہ ایک آنکھ بند رکھتا ہے اور ایک آنکھ کھلی رکھ کر سوتا ہے اور اس کی اسے مشق ہوتی ہے اسی طرح خرگوش کے بارے میں کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ مارے خطرے اور اندیشے کے اور خاص طور سے مؤنث اپنے بچوں کی حفاظت کے زمانے میں دونوں آنکھیں کھلی رکھ کر سوتی ہے (حیوۃ الحیوان ج ا ص ۱۰۹) آپ کہیں گے یہ کیسے؟

تو سنئے ایک آدمی رسیا میں گرفتار ہوا وہ سیاسی آدمی تھا تو اس کو یہ سزا دی گئی کہ اس کو سونے نہ دیا جائے جب وہ سونے لگے تو اس پر پانی ڈال دیا جائے یا دروازہ کھٹکھٹایا جائے یا اسے ہلا دیا جائے، بہر حال یہ کہ اسے سونے نہ دیا جائے تا کہ پریشان ہو کر راز اُگل دے، جیسے مجرم کو برف پر لٹایا جاتا ہے اسی طریقہ سے سزا کی ایک شکل یہ بھی ہے، تو اس آدمی نے آنکھیں کھلی رکھ کر سونے کی مشق کی اور وہ اسی طرح سوتا تھا، ایسے بھی واقعات ہیں کہ نیند میں لوگ چلتے ہیں، نیند میں بولنے والے تو بہت ہیں نیند میں لوگ چلتے بھی ہیں اور عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں، تو اس نے آنکھیں کھلی رکھ کر سونے کی مشق کی اور کئی روز اس نے اسی طریقے سے گزارے، تو بھیڑیئے کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ دائیں آنکھ کھلی رکھتا ہے اور بائیں آنکھ بند کر کے سوتا ہے اور جب

اُکتا جاتا ہے تو داہنی آنکھ بند رکھتا ہے اور بائیں آنکھ کھلی رکھتا ہے جیسے دیوبند میں ایک طالب علم تھے جب انہیں نیند سے اٹھایا جاتا تھا تو وہ صرف ایک آنکھ کھولتے تھے اور تھے گجرات کے کوئی ان سے کہتا کہ یہ کیا؟ تو وہ کہتا تھا کہ ایک دم سے کیسے جاگا جائے یعنی ایک دم سے کیسے اٹھا جائے آہستہ آہستہ اٹھنا چاہئے، تو بہرحال بھیڑیئے کی یہ خصوصیت ہے اور وہ بڑا عجیب وغریب جانور ہے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے دو چیزیں ذکر کیں اور بعد میں وہی بنیاد بنی۔

بڑوں کے چھوٹے بول پر بھی بعض مرتبہ گرفت ہوجاتی ہے

تو ابوحیّان غرناطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض مرتبہ بڑوں کے چھوٹے بول پر بھی گرفت ہوجاتی ہے، بہرحال یہ اللہ تعالیٰ کے معاملات ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کی تفویض کی شانیں دیکھنا چاہتے ہیں۔

اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی

امامِ غزالی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ایک چھوٹی سی بستی تھی اوپر کی بات کی تفہیم کرنا چاہتا ہوں، بہت مختصر آبادی تھی دوچار گھر ہوں گے، اس میں ایک نیک طینت انسان رہتے تھے ان کے یہاں تین جانور تھے گدھا، کتا اور مرغا، گدھا مرگیا تو بیوی نے صدمہ ظاہر کیا، تو بڑے میاں نے کہا کہ اس میں بھی اللہ تعالی کی کوئی مصلحت ہوگی، کچھ دن بعد کتا مرگیا تو بیوی نے شوہر کو خبر دی تو انہوں نے وہی جواب دیا کہ اس میں بھی اللہ تعالی کی کوئی حکمت ومصلحت ہوگی تو وہ جھلاّ کر کہنے لگی کہ آپ کے پاس بس یہی ایک جواب ہے اور کوئی جواب ہے ہی نہیں، پھر اللہ تعالی کی شان کہ وہ جو مرغ صاحب تھے گھر کے مؤذن صاحب وہ بھی رخصت ہوگئے، صحیح حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ مرغ کو گالی نہ دی جائے کہ وہ اذان دیتا ہے۔ (مشکوۃ شریف) اذان کے اوقات میں ملائکہ کا

اس کو ادراک ہوتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جب بھی آواز دے تو اس وقت نماز کا وقت ہو جائے، ہاں نماز کے وقت آواز دے تو پھر ٹھیک ہے، تو دونوں میں فرق ہے، البتہ وہ عموماً صحیح وقت پر ہی اطلاع دیتا ہے، بہر حال مرغ بھی مر گیا تو بیوی نے کہا کہ لو یہ ایک رہ گیا تھا وہ بھی رخصت ہوا، تو انہوں نے کہا کہ یہ اللہ تعالی کے معاملات ہیں اس پر وہ بڑی گرم ہوئی کہ یہ عجیب بات ہے کچھ بھی ہو تو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالی کے معاملات ہیں اس کی حکمت ہے (احیاء علوم الدین) اور واقعی اللہ تعالی کے معاملات عجیب ہی ہوتے ہیں۔

اللہ تعالی کے معاملات عجیب ہوتے ہیں

جیسے آدمی کو اپنی موت کا علم نہیں ہوتا یہ اللہ تعالی کا ایک معاملہ ہے، ایک آدمی نے اسمِ اعظم معلوم کیا اور یہ دعا کی یا اللہ! مجھے اپنی موت اور اپنے جانوروں، رشتہ داروں اور گھر والوں کی موت کا وقت معلوم ہو جائے چنانچہ اس کی دعا قبول ہوگئی، ایک دن اس کو بتایا گیا کہ کل کو تمہارا گدھا مرنے والا ہے چنانچہ اس نے اسے بیچ دیا پھر کچھ وقت کے بعد اس پر الہام ہوا کہ اب تمہارا بیل مرنے والا ہے تو اس نے اس کو بھی بیچ دیا، پھر کچھ وقت کے بعد الہام ہوا کہ تمہارا غلام مرنے والا ہے تو اس نے اسے بھی بیچ دیا، پھر کچھ وقت کے بعد الہام ہوا کہ کل جناب تشریف لے جانے والے ہیں تو بڑی کشمکش میں مبتلا ہوا کہ کل دنیا سے جانا ہے اور اسی وقت سے ان کی سٹی گم ہوگئی (تسہیل المواعظ حصہ اول ص ۵۴۷) تو یہ اللہ تعالی کے معاملات ہیں کہ اس نے موت کا وقت چھپا رکھا ہے ورنہ تو دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے، تو امام غزالی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ وہ شخص اپنی بیوی سے ہر بار یہی کہتے رہے کہ اس میں بھی اللہ تعالی کی کوئی مصلحت ہوگی، چنانچہ کچھ دن کے بعد ایسا ہوا کہ ان کی بستی کے قریب ایک بستی تھی اس پر ڈاکوؤں نے حملہ کیا اور ساری

بستی کو لوٹ لیا اور عورتوں کو باندی بنالیا اور مردوں کو غلام اور روانہ ہوگئے اور یہ واقعہ ان کی بستی سے بالکل قریب میں ہوا، ڈاکوؤں کا یہ قافلہ رات کے وقت ان کے گھر کے قریب سے ہی گذرا تھا مگر ان کو پتہ نہیں چلا کہ یہاں کوئی گھر ہے اس لئے کہ پہلے زمانہ میں آج کی طرح بجلیوں کا نظام نہیں تھا انہیں اُس بستی کی خبر اس طرح ہوئی کہ کسی کے گھر کے سامنے گدھے صاحب بندھے ہوئے تھے انہوں نے آواز لگائی، کسی کے یہاں کتّا تھا وہ بھونکا، غرض یہ کہ جانوروں کا بولنا ڈاکوؤں کے لئے اس بستی کے معلوم ہونے کا سبب بنا اور پھر انہوں نے پورے گاؤں کو لوٹ لیا، جب اس واقعہ کی خبر ان بزرگ کو ہوئی تو وہ بیوی سے کہنے لگے ظالم! بڑی خیر ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے گدھا کتا اور مرغ کو لے لیا (یعنی وہ مرگئے) ورنہ تو بھی جاتی میں بھی جاتا اور گھر کا سارا سامان بھی رخصت ہوجاتا (تبلیغ دین ص۳۱۲،۳۱۳) تو یہ سب اللہ تعالیٰ کے معاملات ہوتے ہیں اسی میں بندوں کی بھلائی ہے مگر اس حقیقت کو آدمی نہیں سمجھتا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا حضرت عزرائیل علیہ السلام سے سوال

تو خیر حضرت یعقوب علیہ السلام پر طبعی اعتبار سے یہ بات بہت شاق تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام ان سے جدا ہو مگر جدائی ہوئی جو اللہ تعالیٰ کو منظور تھی اور اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام نہیں جانتے تھے کہ اس واقعہ کی حقیقت اس شان کے ساتھ ظاہر ہوگی، ہاں! اتنا تو جانتے تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جو خواب دیکھا تھا وہ سچا ہے اسی لئے فراق کے زمانہ میں ایک مرتبہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت عزرائیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ بتاؤ تم نے میرے بیٹے یوسف کی روح قبض کی ہے؟ حضرت عزرائیل علیہ السلام فرمانے لگے نہیں میں نے اس کی روح قبض نہیں کی (تفسیر مظہری، گلدستہ تفاسیر ج۳ص۵۰۳) اس سے آپ کو مزید اطمینان ہوا اور یقین ہوا کہ

ملاقات ہوکر رہے گی اس لئے کہ بشارتیں موجود تھیں اور پھر حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب اس کی ترجمانی کر رہا تھا۔ (حوالہ بالا)۔

طبعی غم کو کیا کیجئے؟

مگر طبعی غم کو کیا کیجئے؟ اللہ تعالیٰ نے انسان کی طبیعت ہی کچھ اس طریقہ سے بنائی ہے، دیکھئے، حضرت نبیٔ کریم ﷺ کے ننھے منھے بیٹے حضرت ابراہیمؓ بیمار ہوئے پھر حضور ﷺ نے دیکھا کہ ان کا انتقال ہو رہا ہے ان کی روح نکل رہی ہے تو روایتوں میں موجود ہے کہ حضور ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، جب صحابہ کرام نے آپ ﷺ کی یہ کیفیت دیکھی تو انہیں تعجب ہوا کسی نے اس بارے میں عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ان العین تدمع والقلب یحزن ولا نقول الاّ ما یرضی ربنا وانا بفراقک یاابراھیم لمحزونون" (بخاری شریف ۱/۱۷۴ احدیث نمبر ۱۲۸۹) آنکھیں آنسو بہاتی ہیں اور دل غمگین ہوتا ہے اور ہم وہی بات کہتے ہیں جو ہمارے رب تبارک وتعالیٰ کو راضی کرنے والی ہے اے ابراہیم! تمہارے فراق پر ہمیں تاثر ہے، یہاں دیکھئے کوئی کلمہ، کوئی بات، کوئی لفظ ایسا ہے؟ جو خدا تعالیٰ کی شان کے خلاف ہو، اس کی رضا کے خلاف ہو، نہیں، کیونکہ یہ شانِ محمدی اور شانِ پیغمبری کے بالکل خلاف ہے کہ ان کی زبان سے کوئی ایسی بات نکلے۔

بدسلوکی کی جو تفصیلات ہیں وہ محتاجِ سند ہے

چنانچہ معتبر تفاسیر میں لکھا ہے کہ جب بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کو ساتھ لے جانے لگے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے قریب بلایا، چُمکارا دعائیں دیں اور بڑی شفقت کے ساتھ بھائیوں کے حوالہ کیا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ موقع کتنا نازک تھا کہ ننھا سا بچہ جو ظاہری اور باطنی دونوں کمالات کا حامل اس

کو جدا کرنا ہے جب بھائی ان کو لے کر چلے تو ان کا سلوک حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ ٹھیک نہیں رہا، باقی بدسلوکی کی تفصیلات محتاج سند ہیں، لوگوں نے بڑی عجیب عجیب باتیں لکھی ہیں مثلاً یہ کہ ایک نے طمانچہ مارا تو دوسرے کی گود میں پہنچے اور دوسرے نے مارا تو تیسرے کی گود میں پہنچے اور تیسرے نے مارا تو چوتھے کی گود میں اور آپ ہر ایک کی طرف لپکتے تھے اور وہ آپ کو برا بھلا کہتے تھے، بہر حال اتنا تو ثابت ہے کہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی لیکن زیادتی کی سب تفصیلات وہ محتاجِ سند اور محتاجِ دلیل ہیں معتبر تفاسیر سے بھی کچھ زیادتیوں کا پتہ چلتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔

جب ایک بات خدا تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہوتی ہے تو اس کا تحقق کس شان کے ساتھ ہوتا ہے

چلتے چلتے کنویں کے پاس پہنچے، یہ کنواں عام شاہراہ سے کچھ فاصلے پر تھا اور حضرت قتادہؒ کا خیال یہ ہے کہ بیت المقدس کا تھا عام حضرات کا خیال یہ ہے کہ نہیں بلکہ وہیں بستی کے قریب ایک کنواں تھا اور عام شاہراہ سے ذرا ہٹکر تھا (حوالہ بالا) وہاں پہنچنے کے بعد تمام نے حضرت یوسف علیہ السلام کے باب میں یہ عزم کیا کہ انہیں کنویں میں ڈالدیں اور وہ پناہ کے لئے ہر ایک کی طرف لپکتے تھے اور دیکھئے! جب ایک بات خدا تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہو جاتی ہے تو اس کا تحقق کس شان کے ساتھ ہوتا ہے، یہ تصور نہیں کیا جا سکتا تھا کہ بھائی اس قسم کی سختی کریں گے، بہر حال انہوں نے سختی کی ہر ایک یوسف کو اپنے سے جدا کرتا تھا بالآخر حضرت یوسف علیہ السلام کو زبردستی کنویں میں ڈالدیا گیا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے کنویں کی منڈیر پکڑ لی (تفسیر مظہری ج۶ ص۸۵) بھائیوں نے ان کے ہاتھ سے منڈیر چھڑائی اور جب کچھ نیچے پہنچے تو رسّی کاٹ دی

اورانہیں نیچے پھینک دیا گیا۔ (تفسیر مظہری ج۶ص۸۵) آپ جا کر پانی میں گرے اور کنویں میں ایک پتھر تھا اس پر کھڑے ہو گئے (زادالمسیر ج۴ص۱۹۰)

مقامِ جبرئیل عند سدرۃ المنتھی ہے

بعض تفسیروں میں سورۂ نجم میں جبرئیلِ امین کے باب میں لکھا ہے کہ ان کا مقام سدرۃ المنتھی کے قریب ہے ''عند سدرۃ المنتھی، عندھا جنۃ الماوی'' (نجم، آیت: ۱۴/۱۵) جب یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے چھوڑا تو حق تعالیٰ نے جبرئیلِ امین کو حکم دیا کہ جبرئیل جاؤ اور یوسف کو سنبھالو اور یہ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ زمین سے آسمان کی مسافت پانچ سو سال ہے اور پانچ سو سال بھی بیل گاڑی ریل گاڑی اور ہوائی جہاز والے ہوتے تو یار لوگ کبھی کے پہنچ گئے ہوتے اور آسمانوں کا ڈل بھی (ان کی موٹائی) پانچ سو سال ہے، پھر اس کے بعد پانچ سو سال کی مسافت ہے پھر ڈل اتنا ہی ہے پھر پانچ سو سال پھر اتنا ہی ڈل اس طرح سات آسمان اور ان کی موٹائی ملا کر مسافت کا اندازہ لگائیے۔ (خطبات حکیم الاسلام ج۱ص۲۹۲)

غرض یہ کہ سات آسمانوں کے اوپر جنت ہے تو سدرۃ ساتویں آسمان پر ہے وہاں جبرئیلِ امین کا قیام ہے، یہ قرآن کریم میں ان کا ایڈریس ہے، تو جبرئیلِ امین وہاں سے چلے اور انہوں نے بھائیوں کے چھوڑنے کے بعد آناً فاناً چشمِ زدن میں برق سے زیادہ تیزی سے چل کر حضرت یوسف علیہ السلام کو سنبھالا۔

قوتِ جبرئیلی کا اندازہ لگائیے

اس سے آپ قوتِ جبرئیلی کا اندازہ لگائیے ان کے چھ سو پر ہیں، حدیث صحیح میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں نے جبرئیل کو دیکھا کہ ان کے چھ سو پر ہیں۔ (جامع الدراری شرح بخاری ص ۲۱۹) اور ان میں یاقوت وزبرجد جڑے ہوئے ہیں، ساری فضا کو

جبرئیل گھیرے ہوئے ہیں ان کی طاقت کی یہ کیفیت تھی کہ قومِ لوط کی بستیوں کو جو سدوم کے علاقہ میں تھیں جو عراق سے ملا ہوا علاقہ ہے وہاں چار بستیاں چار لاکھ کی آبادی پر مشتمل تھیں ان کو جبرئیل امین نے سب سے چھوٹی انگلی پر اٹھایا اور پھر ان کو الٹ دیا (تفسیر ابنِ کثیر) آپ اندازہ لگایئے کہ فرشتے کی قوت کتنی زیادہ ہوگی، بہرحال جبرئیلِ امین نے کنویں میں پہنچ کر حضرت یوسف علیہ السلام کو سنبھالا گو اس کی سند میں بھی گفتگو ہے مگر بعض اربابِ تفاسیر نے اسکو لکھا ہے۔

جب عمارت بلند کی جاتی ہے تو اس کا فاؤنڈیشن نیچے ہوتا ہے

بہرحال حضرت یوسف علیہ السلام کنویں میں پہنچ گئے مگر آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ جب کسی عمارت کو بہت بلند کیا جاتا ہے تو اس کا فاؤنڈیشن بہت نیچے تک ڈالا جاتا ہے بھائیوں کو کیا پتہ تھا کہ ہم تو یوسف کو نیچے پہنچا رہے ہیں اور ہم انہیں جتنا نیچے پہنچا رہے ہیں خدا تعالی انہیں اتنا ہی زیادہ اوپر اٹھائیں گے، خدا تعالی انہیں اتنی ہی بلندی بخشیں گے اور خدا تعالی انہیں اتنا ہی زیادہ عروج عطا فرمائیں گے چنانچہ ہوا ایسا ہی۔

یہ دوری قُرب کی تمہید تھی

بہرحال حضرت یوسف علیہ السلام کنویں میں پہنچے اور وہ کرتہ جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے تعویذ بنا کر ان کے گلے میں ڈالدیا تھا (تفسیر مظہری ج۶ ص ۸۶) جس کا تذکرہ میں نے پرسوں کیا تھا، حضرت جبرئیلِ امین نے اسے کھولا اور اسے آپ کو پہنادیا جس سے اطمینان کی کیفیت پیدا ہوگئی اور حضرت یوسف علیہ السلام تین روز تک اس کنویں میں رہے۔ (تفسیر مظہری ج۶ ص ۸۶) بھائیوں میں یہودا کو آپ سے بڑا تعلق تھا وہ رات میں آکر آپ کو کھانا بھی پہنچاتے تھے۔ (تفسیر مظہری ج۶ ص ۸۶) اور ادھر بھائیوں نے

یہ خیال بھی رکھا تھا کہ کنواں زیادہ پانی والا نہ ہو کہ آپ ختم ہو جائیں کیونکہ ان کا منشا ان کو ختم کرنا نہیں تھا چونکہ وہ آپس میں مشورہ کرنے کے بعد قتل سے رُکے تھے اور انہوں نے یہ بھی خیال رکھا کہ وہ بالکل خشک نہ ہو اس لئے کہ اگر وہ خشک ہوتا اور کسی طرح باپ تک پہنچ جاتے تو ان کا منشا پورا نہ ہوتا وہ چاہتے تھے کہ کنویں میں کچھ پانی بھی ہو اور کوئی ایسی شکل ہو کہ کسی بہانے سے یوسف کسی قافلے کے ساتھ دور چلے جائیں اور باپ کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں، مگر انہیں کیا پتہ تھا کہ یہ دوری قرب کی تمہید ہے۔

ہر آدمی اپنے جوہرِ استعداد کے اعتبار سے طبیعت کے کنویں میں ڈالا گیا ہے

ویسے ہر آدمی اپنے جوہرِ استعداد کے اعتبار سے طبیعت کے کنویں میں ڈالا گیا ہے ایک حسّی کنواں ہوتا ہے اور ایک معنوی کنواں ہوتا ہے حسی کنواں وہ ہے جسے میں اور آپ دیکھتے ہیں اور ایک کنواں وہ ہے جسے اہلِ دل اور عارفین ''طبیعت'' سے تعبیر کرتے ہیں کہ انسان کی خواہشات درحقیقت گہرے کنویں کے مانند ہیں اس سے باہر نکلنے کیلئے طاقت کی ضرورت ہے، اس کو آپ ایک مثال سے سمجھئے جب ہوائی جہاز اوپر کی طرف اٹھتا ہے تو زمین کی کشش سے نکلنے کے لئے ہوائی جہاز بڑی قوت چاہتا ہے اسی لئے اس موقع پر کافی پیٹرول اور کافی طاقت صرف ہوتی ہے اس سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے بدن کا جو تعلق تحتانی اور ارضی خواہشات کے ساتھ ہے جس کو میں طبیعت سے تعبیر کر رہا ہوں یا جس کو عارفین نے طبیعت کے کنویں سے تعبیر کیا ہے اس سے برآمد ہونے اور اوپر آنے کیلئے بڑے پاور اور قوت کی ضرورت ہے، جیسے ہوائی جہاز کو طاقت وقوت کی ضرورت ہوتی ہے، اسی لئے اگر آپ کسی ٹریکٹر کے بارے میں چاہیں کہ وہ اڑنے لگے یا آپ کسی ٹرک سے امید رکھیں کہ وہ اڑنے لگے تو لوگ کہیں گے

کہ یہ اپنی بے پَر کی اڑا رہے ہیں، اس لئے کہ کوئی طاقت اور قوت ہونا چاہئے جو اس کو کشش ارضی سے نکالے اور اس کو دوسری سمت کی طرف لے جاسکے۔

روح کا اس عالم میں آنا حق تعالیٰ کے قرب کا مقدمہ ہے

تو یہ جسمانی تقاضے انسان کی روح کے لئے جو اُس عالم سے اس عالم میں لائی گئی ہے کنویں کے مشابہ ہیں جس میں اس روح کو رکھا گیا ہے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کا کنعان کے کنویں میں جانا تخت و تاج کا مقدمہ بنا ٹھیک اسی طرح روح کا اُس عالم سے اِس عالم میں آنا حق تعالیٰ کے قرب کا مقدمہ ہے انسانوں کی نظریں اس بات کو اس وقت نہیں سمجھتیں مگر مشیتِ خداوندی یہی ہے کہ روح کو اُس عالم سے اس عالم میں بھیجا جو کنویں سے زیادہ عمیق اور تحتانی ہے اور زیادہ سافل اور نیچے ہے مگر یہ قُربِ خداوندی کا سبب ہے۔

اس جہاں میں حالات سب پر آتے ہیں

بہرحال حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالا گیا، ایک بات اور سن لیں حضرت یوسف علیہ السلام جیسا شخص جن کے کمالاتِ باطنی بھی مسلم اور کمالات ظاہری بھی مسلّم ہیں جب وہ کنویں میں ڈالے گئے اور ان کو حالات پیش آئے تو اگر ہمیں اس دنیا میں حالات پیش آئیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، آدمی کو طبعی طور پر تاثر ضرور ہوتا ہے، مگر عقلی اعتبار سے تشویش نہیں ہونا چاہئے، یہاں دو باتیں خاص طور سے ذہن میں رہیں، دیکھو ایک بات تو یہ کہ جن کو خدا تعالیٰ سے صحیح نسبت اور صحیح تعلق ہوتا ہے تکلیف کی چیزوں سے انہیں بھی تکلیف ہوتی ہے ایسا نہیں ہے کہ اس سے انہیں تکلیف نہیں ہوتی، مثلاً ایک آدمی فاسق و فاجر اور بدکار ہو اور آپ اسکو ڈھیلا اٹھا کر مارے تو اسے تکلیف ہو اور کسی نیک آدمی کو مارے تو اسے تکلیف نہ ہو ایسا نہیں ہے، تکلیف دونوں

کو ہوگی۔

تکالیف کا تعلق صحتِ احساس پر موقوف ہے

بلکہ ہوسکتا ہے کہ متقی کو بہتر احساس لطیف ہونے کی وجہ سے زیادہ تکلیف ہو، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ خدا تعالی کی راہ میں مجھے جتنی اذیتیں دی گئی ہیں کسی کو نہیں دی گئیں، حالانکہ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ ﷺ کی نبوت کا زمانہ صرف چالیس سے تریسٹھ سال تک ہے اور اس میں بھی مکی زندگی میں مشقت زیادہ پیش آئی اور حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نوسو سال دعوت دی اور آپ کی قوم کا حال یہ تھا کہ وہ آپ پر پتھراؤ کرتی تھی یہاں تک کہ آپ پتھروں میں دب جاتے تھے اور بڑی مشکل سے ان میں سے نکلتے تھے اور آپ کی قوم آپ کو ٹاٹ میں لپیٹتی تھی اور لپیٹ کر دور دراز مقام میں ڈال آتی تھی اور اس میں سے آپ بڑی مشکل سے نکل کر آتے تھے تو حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نوسو سال تک پریشانیاں جھیلیں مگر جناب رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جتنی تکلیف مجھے دی (پہنچائی) گئی اتنی کسی کو نہیں دی (پہنچائی) گئی۔(مجالس حکیم الاسلام ج۱ص۲۸۷) تو اس کا تعلق احساس کی لطافت سے ہے۔

کچے پانی کی بو معلوم ہوتی ہے

یہ بات میں آپ کو ایک واقعہ سے سمجھاتا ہوں، حضرت گنگوہی رحمہ اللہ ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اس وقت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کا دورِ اہتمام تھا، انہوں نے چائے بنائی اور کپ دھو کر اس میں چائے ڈال کر پیش کردی، حضرت گنگوہی کی طبیعت کی لطافت کا اندازہ لگائیے، چائے پیتے ہوئے فرمایا کہ: چائے میں پانی کا کچا پن محسوس ہوتا ہے، مولانا نے پھر دوبارہ چائے بنائی اور کپ دھویا اور اس میں چائے ڈال کردی، پھر کچا پن معلوم ہوا، پھر سہ بارہ چائے بنائی اس میں بھی کچا پن محسوس

ہوا، بعد میں انہوں نے بہت سوچا تو معلوم ہوا کہ کپ میں جو تھوڑا سا پانی رہ جاتا تھا حضرت کو اس کا ادراک اور احساس ہوتا ہوگا چنانچہ انہوں نے اس کو پونچھا، پھر چائے پیش کی تو فرمایا کہ: اب ٹھیک ہے (حیات ابرار ص ۴۱۷)۔

درسِ حدیث میں مشغول رہئے اسی سے تکمیل ہوجائے گی

حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی رحمہ اللہ حضرت مولانا گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ سے فرماتے تھے کہ ہمیں شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے پاس لے چلو تاکہ ہم بھی صاحبِ نسبت بن جائیں، اندیشہ ہے کہ کہیں دنیا سے ایسے ہی رخصت نہ ہوجائیں اور یہ دونوں بزرگ حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ سے فرماتے تھے کہ درسِ حدیث میں مشغول رہئے اسی سے آپ کی تکمیل ہوجائے گی۔

یا اللہ! تین لاکھ روپیہ عطا فرما

حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ صاحبِ جذب بزرگ گذرے ہیں ان کے متعلق لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جذب کا غلبہ ہوا، ہاتھ اٹھایا اور دعا شروع کی یا اللہ! تین لاکھ روپیہ عطا فرما، یا اللہ! تین لاکھ روپیہ عطا فرما، بس دعا کرتے کرتے آنکھ لگ گئی، تو انہوں نے خواب میں جنت دیکھی اور جنت میں ایسا عالیشان محل دیکھا جس کا تصور نہیں کیا جاسکتا، اس کے کنگوروں پر بہت خوبصورت موتی جڑے ہوئے ہیں مگر ایک مقام پر دیکھا کہ ایک موتی غائب ہے، انہوں نے فرشتے سے پوچھا یہ کیوں غائب ہے؟ اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ تو اس نے کہا کہ یہ محل یعقوب نانوتوی کا ہے اور اس نے آج اللہ تعالی سے بہت بضد ہوکر دعا کی کہ اے اللہ! تین لاکھ روپیہ چاہئے تو اللہ تعالی کی طرف سے حکم ہوا کہ اس کنگورے سے ایک موتی کم کردیا جائے اب جو آنکھ کھلی

تو دعا شروع کی کہ اے اللہ! بالکل نہیں چاہیئے، اے اللہ! بالکل نہیں چاہیئے (خطبات حکیم الاسلام ج۴ص۴۶۷) تو یہ صاحبِ جذب بزرگ تھے۔

خواجہ صاحب نے کہا تو مجبوراً آئے ہیں

حضرت مولانا یعقوب صاحب ایک مرتبہ جذب کے غلبہ میں چلے اور اجمیر پہنچے اور پہاڑ پر جا کر مراقب ہوئے اور حضرت خواجہ صاحب کی طرف متوجہ ہوئے ان پر منجانب اللہ یہی الہام ہوا کہ درسِ حدیث میں مشغول رہو اسی میں تمہاری نسبت کی تکمیل ہو جائے گی، خیر وہاں سے لوٹے اور گنگوہ پہنچے حضرت گنگوہیؒ سے لوگوں نے کہا کہ مولانا یعقوب صاحب نانوتوی تشریف لائے ہیں تو حضرت نے فرمایا: ہم نے کہا تو سمجھ میں نہیں آیا، خواجہ صاحب نے کہا تو مجبوراً آئے ہیں اس درجہ حضرت گنگوہی کا کشف بڑھا ہوا تھا، حضرت گنگوہی بڑے صاحبِ کشف بزرگ تھے۔

حضرت گنگوہیؒ بڑے صاحبِ کشف بزرگ تھے

ایک بڑھیا حضرت گنگوہیؒ کے پاس آئی اور کہا میرے دو بیٹے حج کرنے گئے ہوئے ہیں اور کئی مہینے ہو گئے ان کی کوئی خبر نہیں ہے اس لئے میں بڑی پریشان ہوں، تو آپ نے فرمایا میں کوئی عالم الغیب تھوڑا ہی ہوں، لیکن جب اس نے بہت اصرار کیا تو آپ نے یوں ہاتھ رکھا (یہاں حضرت والا نے وہ اشارہ کر کے بتلایا) اور تھوڑی دیر مراقب ہوئے پھر فرمایا مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ جا رہے ہیں اور ابھی فلاں منزل پر ہیں چنانچہ اس بڑھیا نے وہ وقت یاد رکھا اور بعد میں تحقیق کی تو بات بالکل درست نکلی، حضرت گنگوہیؒ اتنے بڑے درجہ کے شخص تھے۔

صحتِ احساس شدتِ تکلیف کا سبب بنی ہے

مجھے تو یہ بتانا ہے کہ صحتِ احساس اور لطافتِ احساس بڑی چیز ہے، حضور ﷺ کی

روحانیت کا شدتِ احساس اور امت کے ساتھ شدت تعلق جو کسی نبی کو نصیب نہ ہوسکا وہ سبب بنا ہیں شدتِ تکلیف کا اس لئے حضور ﷺ فرمار ہے ہیں کہ: خدا تعالی کی راہ میں مجھے جو اذیت پہنچی وہ کسی نبی کو نہیں پہنچی اگر چہ دعوت کا زمانہ حضرت نوح علیہ السلام کا ساڑھے نوسوسال کا ہے، تو صحتِ احساس بڑی چیز ہے، ولی میں اور فاسق میں فرق یہی ہے، یوں بظاہر دونوں ایک ہیں اگر آپ ولی کو پتھر مارے تو ولی کو بھی تکلیف ہوگی اور فاسق کو مارے تو فاسق کو بھی تکلیف ہوگی ،اگر فاسق آدمی کے بدن سے خون نکلے گا تو کیا متقی آدمی کے بدن سے دودھ نکلے گا؟ نہیں، اس کے بدن سے بھی خون ہی نکلے گا۔

جسمانی تکلیف تو ہوتی ہے لیکن روح کو ایک لذت محسوس ہوتی ہے

مگر حصولِ نسبت اور اللہ تعالی سے تعلق کے بعد ان چیزوں سے چاہے جسمانی تکلیف ہو مگر عقلِ سلیم اور روح کو ایک لذت محسوس ہوتی ہے اور اس کی مثال بزرگوں نے یوں دی ہے جیسے کوئی شخص مرچ والے پکوڑے یا بہت مرچ والے سموسے یا حلیم کھا (پی) رہا ہو، اور اس کی وجہ سے اس کی ناک بھی بہہ رہی ہو اور چہرے پر بھی پسینہ ہو کوئی اس سے کہے حضرت! آپ کا چہرہ متغیر ہے اور چہرے پر پسینہ ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور ناک بھی بہہ رہی ہے اور آپ پریشان معلوم ہورہے ہیں لہٰذا حلیم کا پیالہ آپ حلم و بردباری سے رکھ دیجئے اور بھجیہ (پکوڑے) کو رکھ کر کسی دوسرے قضیہ میں مشغول ہوجایئے اور سموسے رکھ دیجئے تو وہ کہے گا نہیں، یہ پریشانی مجھے مبارک آپ پریشان نہ ہوں۔

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

ٹھیک اسی طریقہ سے اگر حصولِ نسبت کے بعد کسی شخص کو پریشانی پیش آتی ہے تو اس کا حال یہ ہوتا ہے جیسے کوئی شخص عاشق ہو اور معشوق اسے گالی دیدے تو وہ یہی کہے

گا کہ ؎

تو ہوکہ ترش رو مجھے گالی ہزار دے
یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

تُرشی سے نشہ اتر تا ہے مگر محبت کا نشہ ایسا ہے کہ معشوق اگر ترش چہرہ بنائے تو محبت کا نشہ نہیں اتر تا، ترشی (کھٹاس) سے نشہ اتر تا ہے، مگر شاعر کہتا ہے ؎

تو ہوکہ ترش رو مجھے گالی ہزار دے
یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

تو حق یہ ہے کہ اس نسبت کی وجہ سے خاص کیفِ روحانی ہوتا ہے، میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کسی نیک آدمی کا گلا پکڑ لے اور کہے کہ آپ متقی ہیں لہٰذا آپ کو تکلیف نہیں ہوگی، بلکہ متقی کو زیادہ تکلیف ہوتی ہے اور زیادہ مزہ بھی آتا ہے اور یہ بھی سن لیں کہ کھانا کھانے میں جو مزہ متقی کو آتا ہے وہ مزہ فاسق کو نہیں آتا حتی کہ کتابوں میں لکھا ہے کہ بیوی سے صحبت میں جو مزہ متقی کو آتا ہے وہ فاسق وفاجر کو نہیں آتا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اس کا روحانی احساس بالکل صحیح ہے اس لئے وہ جتنی تکلیف محسوس کرے گا اتنی ہی لذت بھی محسوس کرے گا اور فاسق کا روحانی احساس ختم ہو چکا ہے ماؤف ہو چکا ہے کمزور ہو چکا ہے وہ اس چیز کو محسوس نہیں کرسکتا آپ کہیں گے کہ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

یہ تو کلابی تقویٰ ہے

ہم کہیں گے کہ آپ تقویٰ اختیار کر کے دیکھو اور اگر تقویٰ اختیار کرنے کے بعد بھی سمجھ میں نہ آئے تو ہم کہیں گے کہ فسق کے آثار ختم ہونے کا انتظار کرو، اس لئے کہ ساٹھ سال کے فسق وفجور کے آثار تین دن کے تقویٰ سے ختم ہونا بظاہر مشکل ہے اور تقوی

سے ہماری مراد کامل تقویٰ ہے، کلابی تقویٰ مراد نہیں۔

ایک صاحب فجر بعد وظیفہ پڑھنے بیٹھتے تھے اور کسی سے بالکل بات نہیں کرتے تھے، کوئی آدمی رشوت کے سلسلے میں آتا تو اشارے سے کہتے تھے کہ دو سولوں گا، یا تین سو لوں گا، یا چار سولوں گا (خطباتِ حکیم الامت) زبان سے بات نہیں کرتے تھے، جو کلام کرنا ہو جائز ناجائز اشارہ سے کرتے زبان سے نہ کرتے یہ ان کا تقویٰ تھا جس کو کلابی تقویٰ کہتے ہیں، کلاب یہ کلب کی جمع ہے اس کے معنی کتے کے ہیں، کتا جب پیشاب کرتا ہے تو ایک پاؤں اٹھا کر کرتا ہے کہ کہیں چھینٹیں نہ اڑیں یہ اس کا تقویٰ ہے اور ادھر حال یہ ہے کہ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ زیادہ تر نجاست ہی میں منہ مارتا ہے۔

حق تعالیٰ جس چیز کو دیکھتے ہیں اسے انسانی نظریں نہیں دیکھ سکتیں

تو بات اس پر چل رہی تھی کہ یہ عالم ایک کنویں کی حیثیت رکھتا ہے اور انسان کے حق میں اس کے طبعی تقاضے کنواں ہے، بہر حال حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالا گیا تاکہ مصر کے تاج وتخت کے مالک بنیں، اگر وہ کنعان ہی کے اندر رہتے تو یہ بات انہیں نصیب نہ ہوتی، حق تعالیٰ جس چیز کو دیکھتے ہیں اسے انسانی نظریں نہیں دیکھ سکتیں، چاہے وہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو، حضرت یوسف علیہ السلام اپنے باپ کی نرم نرم گود سے ہٹ کر کنویں کی تاریکی میں پہنچے مگر وہاں بھی حق تعالیٰ نے سکون کا نظم کر دیا، حضرت جبرئیلِ امین کو بھیجا اور آگے آیت آرہی ہے جس میں ہے کہ ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی عام طور پر انبیاء کرامؑ کو نبوت چالیس (۴۰) سال میں ملتی ہے (معارف القرآن ج ۵ ص ۳۲) یہ قاعدہ کلی نہیں ہے، عمومی قاعدہ ہے، اسی لئے تحقیق یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے باب میں جو ''اوحینا الیہ لتنبئنھم بامرھم ھذا وھم لایشعرون'' کا لفظ آیا ہے کہ ہم نے یوسف کی طرف وحی بھیجی یہ الہام بھی

ہوسکتا ہے۔(تفسیر مظہری ج۶ص۸۶،تفسیر ماجدی ج۲ص۵۸۴)وحی تکوینی بھی ہوسکتی ہے اور وحی بذریعہ جبرئیل بھی ہوسکتی ہے جس کو وحی تشریعی کہتے ہیں اربابِ تحقیق نے یہ سب احتمالات نقل کئے ہیں، اس لئے اگر اسکو وحی تشریعی کہا جائے تو وہ قاعدۂ اکثری ہوگا اور اگر یہ وحی تشریعی نہ ہو تو یہ وحی تکوینی ہوگی ،قرآنِ کریم میں ہے کہ " واوحی ربک الی النحل "(نحل،آیت:۶۸) حق تعالیٰ نے شہد کی مکھی کی جانب وحی بھیجی یعنی وہ بات اس کے دل میں ڈالی جیسے بچہ اپنی ماں سے اللہ تعالی کے بتائے طریقہ کے مطابق دودھ پیتا ہے، یہ خدا تعالی کی تفہیم وحی ہے اس سے نبوت لازم نہیں آتی ، زمین کے بارے میں ہے"یومئذ تحدث اخبارھا، بان ربک اوحی لھا"(زلزال آیت:۴/۵) اس دن زمین اپنی خبریں بیان کرے گی اس وجہ سے کہ آپ کے رب نے اسکی طرف وحی بھیجی زمین کی طرف وحی سے زمین کا نبی ہونا لازم نہیں آتا (ترجمان السنۃ ج۳ص۴۵۹)وحی کے معنی ہیں خبرِ خفی (حوالہ بالا) جو اللہ تعالی کی طرف سے آتی ہے۔

کشف اور فراست کا فرق ایک مثال کے ذریعہ

یہاں دو چیزیں ہیں، ایک ہے کشف اور ایک ہے فراست دونوں میں ایسا ہی فرق ہے جیسا ٹیلی فون اور ٹیلی گرام میں، کشف کی حقیقت ہے جیسے مثلاً آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں اور ایک آدمی آرہا ہے اور آپ کو منکشف ہوگیا، یہ تو کشف ہے کہ فلاں آدمی آرہا ہے، فلاں آدمی فلاں جگہ جارہا ہے یہ بغتۃً یعنی ایک دم ہوتا ہے اور فراست جیسے مثلاً پوسٹ آفس میں ٹیلی گرام کی آواز کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ آپ اس سے اندازہ لگا کر جوڑ کر بتادیں کہ فلاں آدمی کا انتقال ہوگیا ہے یا فلاں شخص دنیا میں تشریف لے آئے تو فراست میں ایک انداز ہوتا ہے اس میں مجموعی آثار سے ایک خیال دل میں آتا ہے، یہ دونوں میں فرق ہے اور دونوں میں غلطی کا احتمال ہے اور کشف وفراست سے بہت بڑھ

کر وحی کا درجہ ہے، چنانچہ وحی میں خطا کا احتمال اور امکان نہیں ہے۔

وحی حجت ہے تو الہام حجت کیوں نہیں؟ جبکہ دونوں حق تعالی کی طرف......

ایک مثال آپ سن لیں، پھر میں اپنی بات ختم کرتا ہوں، حضرت نانوتویؒ رحمہ اللہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت! خدا تعالی کی طرف سے جو خبر متقی بندوں کے قلب پر القاء کی جاتی ہے وہ الہام کہلاتی ہے اور خدا تعالی کی طرف سے جو خبر نبیوں اور رسولوں پر آتی ہے وہ وحی کہلاتی ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ نبیوں اور رسولوں کی باتیں حجتِ قطعی دلیلِ قطعی اور بالکل ساڑھے سولہ آنہ مسلم، معتبر، مستند، قابلِ اعتبار ہوتی ہیں اور الہام شرعی اعتبار سے حجت و دلیل نہیں بن سکتا حالانکہ وہ بھی خدا تعالی کی طرف سے ہے اور یہ بھی خدا تعالی کی طرف سے ہے، دونوں میں فرق کیا ہے؟ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ چل رہے تھے سامنے ایک دیوار تھی پوچھا کہ بتاؤ یہ دیوار کتنے فاصلے پر ہے؟ اس نے کہا کہ پچاس ساٹھ قدم، کچھ آگے بڑھے تو پھر پوچھا اب بتاؤ کتنا فاصلہ ہے؟ کہا چالیس پچاس قدم، پھر تھوڑی دیر بعد پوچھا اب کتنا فاصلہ ہے؟ تو کہا کہ بیس پچیس قدم اور کچھ آگے بڑھے تو پوچھا کہ اب کتنا فاصلہ ہے؟ تو کہا کہ پندرہ بیس قدم، پھر کچھ آگے بڑھے تو پوچھا کہ اب کتنا فاصلہ؟ تو کہا کہ دس پندرہ قدم، پھر کچھ آگے بڑھے تو کہا کہ تین چار قدم، پھر اور آگے بڑھے تو پوچھا کتنا فاصلہ؟ تو کہا کہ ایک قدم، تو حضرت نے اس سے پوچھا کہ ایک دو تو نہیں، تو کہا کہ نہیں صرف ایک قدم، اس کے بعد حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے اس سائل سے فرمایا کہ دیوار اپنی جگہ ہے اور دیوار سے دوری تمہارے تردد اور شک کا سبب بنی اور جب دیوار سے قرب ہو گیا اور فاصلہ صرف ایک قدم رہ گیا تو یقین حاصل ہو گیا، ٹھیک اسی طرح انبیاء کرام علیہم السلام کو خدا تعالی کی ذات سے انتہائی قرب ہوتا ہے اور گویا انبیاء کرام علیہم السلام اس عالم کی چیزوں کو انتہائی

قریب سے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس اعتبار سے اولیاء کرام کو دوری ہوتی ہے اس لئے الہام میں شک کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اولیاء کو خدا تعالی کی ذات سے وہ قرب نہیں ہے جو انبیاء کرام کو اللہ تعالی کی ذاتِ عالی کے ساتھ ہے، اس لئے وہ بعد اور دوری شک کا سبب بن جاتی ہے اس لئے اولیاء کرام کا الہام دلیلِ شرعی و قطعی نہیں بن سکتا اور انبیاء کرام علیہم السلام کی وحی دلیلِ قطعی ہے۔ (خطبات حکیم الاسلام ج ۳ ص ۳۹۵/۳۹۶) کیسی نفیس مثال دی اور واقعی حضرت نانوتویؒ محقق اور بڑے شخص تھے آپ نے بڑے بڑے حقائق چھوٹی چھوٹی مثالوں سے واضح فرما دیئے، خیر بات اس پر چل رہی تھی کہ یہ کنواں بڑی نعمت اور بڑے انعام کی تمہید تھا جیسے روح کے حق میں اُس عالم سے اس بدن میں آنا ترقی کا ذریعہ ہے، آج کی بات یہیں تک رکھے اور عنقریب آپ لوگ بھی اس کنویں سے نکلیں گے انشاء اللہ اس لئے گھبرائیے مت، حضرت یوسف علیہ السلام تو نکل ہی گئے، اللہ پاک ہم سب کو طبیعت کے کنویں سے نکالیں اور روح کے تخت و تاج تک پہنچائیں جس کی بنا پر صحیح سر بلندی اور خدا تعالی کا فیضان ہو، درود شریف پڑھئے اور دعا کیجئے۔

۞۞۞۞۞

درس نمبر اٹھارہ سے حاصل ہونے والی تین اہم ہدایات

(۱) بہت سی جدائیاں اس عالم میں کسی اچھے نتیجہ کا پیش خیمہ، مقدمہ اور عنوان ہوتی ہیں، حضرت یعقوب علیہ السلام بھی یہ نہیں جانتے تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ تکلیف دہ جدائی بعد کی اس ملاقات کا سبب بنے گی جس میں بے پناہ شادمانی اور مسرت ہوگی اور اس دنیا میں ایسا ہوتا ہے۔

اللہ تعالی واقعی حاکم بھی ہے اور حکیم بھی ہے۔

(۲)حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی کیلئے دو چیزیں بنیاد بنی ہیں کھانا اور کھیلنا، معلوم ہوا کہ یہی دو چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے انسان مبتلائے آلام ومصائب ہوتا ہے۔

(۳)حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ایک مرتبہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے پوچھا کہ تمہیں جو مسرت حاصل ہوئی کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، سارا خاندان ملا یہ ساری فرحتیں اور مسرتیں تمہیں کیوں ملی جانتے ہو؟ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا میں نہیں جانتا، تو حضرت جبرئیلِ امین نے فرمایا کہ آپ نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا کہ ''لاتایئسوا من روح اللہ '' اللہ تعالی کی رحمت سے مایوس مت ہو، بس آپ کا یہ جملہ آپ کے لئے ساری مسرتوں اور خوشیوں کا سبب بن گیا۔

اس سے ہمیں یہ سبق ملا کہ اللہ تعالی کی رحمت سے کبھی بھی نا امید نہیں ہونا چاہئے، چاہے حالات بظاہر کیسے ہی ناگوار اور نامناسب ہوں اور حدیث شریف کا یہ ٹکڑا ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہئے ''انا عند ظن عبدی بی،،

درس نمبر (۱۹)

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم امابعد!

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ، بسم اللہ الرحمن الرحیم

وجآء ت سیارة فارسلوا واردھم فادلیٰ دلوہ، قال یبشریٰ ھذا غلم، واسروہ بضاعة، واللہ علیم بمایعملون☆ وشروہ بثمن بخس دراھم معدودة،وکانوا فیه من الزاھدین(یوسف ،آیت: ۱۹/۲۰)☆ **صدق اللہ العظیم.**

حضرت یوسف علیہ السلام اور آپ ﷺ کے درمیان چند مشابہتیں

بزرگانِ محترم! گفتگو یہ چل رہی تھی کہ سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام کنویں میں ڈالدیئے گئے اور آپ وہاں تقریباً تین دن رہے، اس درمیان یہودا جو بڑے بھائی تھے وہ ان کی خبر گیری اور خیال رکھتے تھے اوران کی ضروریات کھانا وغیرہ وہاں پہنچاتے تھے اور ویسے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی جانب سے تانیس (مانوس) کرنے کی شکل اور ربِّ اکرم کی جانب سے طمانینت کی شکل ان کیلئے موجود تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ وقت کنویں کی تنہائی میں گذرا جیسے نبیٔ اکرم ﷺ نبوت سے پہلے غارِ حرا میں تنہائی میں رہتے تھے حدیث شریف میں وارد ہے کہ ’’ حبب الیه الخلاء ‘‘ (بخاری شریف حدیث نمبر۳) تنہائی آپ ﷺ کے لئے پسندیدہ بنادی گئی تھی اور عجیب اتفاق ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ کو جو حال پیش آیا اس میں اور اس میں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ غار فوقانی تھا اور یہ کنواں تحتانی تھا اور دونوں میں مسافت بھی تقریباً اتنی ہی ہے کہ وہ کنواں بھی بستی (کنعان) کے قریب تھا اور یہ غار بھی بستی (مکہ مکرمہ) کے قریب تھا فرق اتنا ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ اپنے شوق سے غارِ حرا میں پہنچتے تھے یہاں بھائیوں کو شوق تھا کہ یوسف کو باپ سے جدا کریں بہرحال شوق کی کیفیت یہاں بھی ہے وہاں بھی ہے البتہ دونوں کی نوعیت مختلف ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ہر انتظام عجیب حکیمانہ ہے

اللہ تعالیٰ کا ایک زبردست نظام ہے اور عجیب حکیمانہ انداز سے وہ اپنے سارے معاملات کو انجام دیتے ہیں چنانچہ ایک قافلہ شام سے چلا اور مصر کی جانب راہی ہوا یہ کنواں اس کے راستہ میں نہیں پڑتا تھا مگر وہ قافلہ راہ بھول گیا اور اگر یوں کہہ دیا جائے کہ اسے راہ بھلادی گئی تو یہ زیادہ مناسب تعبیر ہوگی اس لئے کہ حق تعالیٰ کا نظام انتہائی عجیب وغریب اور حکیمانہ نظام ہے پس وہ قافلہ آ کر ٹھہرا اور انہوں نے اپنے ایک شخص کو پانی لانے کی غرض سے کنویں پر بھیجا اور اس شخص کا نام بھی مالک تھا اور اگر یہ کہہ دیا جائے کہ کنویں جیسی جگہ سے نکالنے والی ذات مالک ہی ہوتی ہے تو بیجا نہ ہوگا ویسے حقیقۃً مالک تو حق تعالیٰ ہی ہیں مگر صورتاً انسان بھی مالک بن سکتا ہے بہر حال اس کا نام مالک تھا۔

جمالِ یوسفی کی تعبیر علامہ ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ کی زبانی

''فادلیٰ دلوہ'' اس نے کنویں میں ڈول ڈالا حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر ایک تفسیری روایت کے مطابق اسوقت سات سال تھی، حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھا کہ کنویں میں ڈول پہنچا ہے تو اس کو پکڑ لیا اور اس میں تشریف فرما ہو گئے اس کے بعد جب اوپر والے نے ڈول کھینچا اور وہ ڈول اوپر پہنچا تو بجائے پانی کے انتہائی حیرانی کی شکل تھی اس لئے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اس میں موجود تھے اور آپ چندرے آفتاب و ماہتاب کا مصداق، چاند و سورج کا ملا جلا ٹکڑا اور انتہائی حسین وجمیل شخصیت کے مالک تھے بقول علامہ ادریس کاندھلویؒ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا جمال ویسا تھا جیسے حور وغلمان کا جمال (معارف القرآن ادریسی ج۴ص۱۰۰) اور حور کے حسن وجمال کی کیفیت ظاہر ہے، سورۂ رحمٰن میں حضرتِ ابن عباسؓ کا ارشاد ہے کہ اگر حورِ عین سمندر میں

تھوک دے تو اس کے لعاب کی حلاوت سے ساتوں سمندر میٹھے ہو جائیں (گلدستۂ تفاسیر ج ۷ص ۳۸) اور حدیث شریف میں یہ بھی ہے کہ اگر حور اپنی کلائی ظاہر کر دے تو چاند سورج اس کے سامنے ماند پڑ جائیں (حوالہ بالا) اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن و جمال کیسا ہوگا۔

غلام کی تعریف

بہرحال اس نے کہا ''یبشریٰ ھذا غلام '' اس نے اپنے بعض ساتھیوں کو آواز دی اور کہا ارے بڑی خوشی کی بات ہے یہ تو انتہائی حسین وجمیل غلام (بچہ) ہے غلام کہتے ہیں نوعمر لڑکے کو، علامہ کشافؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ لفظ غلام کا اطلاق بچہ پر ہوتا ہے جب تک کہ ڈاڑھی نہ نکلے، مگر بندے کا خیال ہے کہ یہ بھی اکثری ہے اس لئے کہ جب نبی کریم ﷺ کو حق تعالیٰ کے فضل سے معراج نصیب ہوئی اور آپ ﷺ چھٹے آسمان سے اوپر تشریف لے گئے تو حضرت موسیٰ روئے اور یہ رونا رشک کا تھا اور فرمایا کہ یہ غلام بعد کے ہیں اور انہیں یہ ترقی نصیب ہوئی اس موقع پر حضرت موسی علیہ السلام نے غلام کا لفظ استعمال فرمایا اور علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اس مقام پر غلام سے مراد مضبوط جوان ہے، ویسے عامۃً غلام نوعمر لڑکے کو کہتے ہیں اور اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر سات سال تھی جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا۔

قافلے والوں کی تو عید ہوگئی

بہرحال قافلہ والوں کی تو حضرت یوسف علیہ السلام کو پا کر عید ہوگئی کہ یہ تو عجیب وغریب بچہ ہے جو ہمیں نصیب ہوا ''واسروہ بضاعۃ'' علماء مفسرین نے اس کے کئی مطلب بیان کئے ہیں، ایک مطلب تو اسکا یہ ہے کہ جو پانی لینے کیلئے پہنچا تھا اس نے اور اس کے خاص آدمیوں نے پونجی سمجھ کر ان کو چھپایا انہوں نے یہ سمجھا کہ ایک بہت بڑی

قیمتی چیز مل گئی ہے ہم اس کے ذریعہ سے بڑی رقم اور سرمایہ حاصل کریں گے اور اس کا اہتمام کیا کہ قافلے والوں کو اس کی اطلاع نہ ہو ورنہ سب کے سب اس میں شریک ہونا چاہیں گے، بہرحال قافلے کے دوسرے اشخاص سے انہوں نے اخفا کیا یہ اس مطلب کا حاصل ہے، یا مطلب یہ ہے کہ جب قافلے والوں کو علم ہوا تو انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قیمتی پونجی سمجھ کر چھپایا تاکہ کوئی اور شخص باخبر نہ ہو اور ان کے ہاتھ سے یہ دولتِ گراں مایہ چلی نہ جائے، اس وجہ سے قافلے والے اخفاء سے کام لے رہے تھے کہ کوئی اور شخص مطلع نہ ہو، یا اس کا مطلب یہ ہے کہ ادھر برادرانِ یوسف تلاش میں تھے کہ کوئی قافلہ آئے اور انہیں یہاں سے لے جائے چنانچہ جب انہوں نے دیکھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کنویں میں نہیں ہیں تو ان کو تلاش کیا تلاش کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک قافلہ والے نے ان کو کنویں سے نکال لیا ہے قافلے والوں کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ یہ ہمارا بھاگا ہوا غلام ہے اور ہم اس کے مالک ہیں آپ حضرات اس کے مالک نہیں ہیں، قافلے والوں نے بھی محسوس کیا کہ یہ قیمتی چیز کہیں ہاتھ سے چلی نہ جائے، لہٰذا انہوں نے غنیمت سمجھا کہ وہ کسی طریقہ سے ان کو بھائیوں سے خرید لیں۔ تو بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی حقیقت کا اخفاء کیا اور ان کو اپنا غلام قرار دیا حالانکہ وہ آزاد تھے کسی کے غلام نہیں تھے کہ ان کا بیچنا جائز ہوتا مگر صورتِ حال یہ ہوئی اور بھائیوں نے یہ شکل اختیار کی ''وشروہ بثمن بخس دراھم معدودۃ'' اور ''شراء'' کے معنی آتے ہیں خریدنے کے بھی اور بیچنے کے بھی اگر حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی طرف ضمیر راجع ہو تو مطلب یہ ہے کہ انہوں نے قافلہ والوں کے ہاتھ حضرت یوسف علیہ السلام کو گنتی کے چند درہموں میں فروخت کر دیا، یا ''شراء'' کا مفہوم خریدنا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قافلہ والوں نے بھائیوں سے حضرت یوسف علیہ السلام کو چند

درہموں میں خرید لیا۔

کلی طور پر تین روایتیں ملتی ہیں

ذخیرۂ تفاسیر میں حضرت یوسف علیہ السلام کی قیمت کے سلسلہ میں تین روایات ملتی ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ بھائیوں نے ان کو قافلے والوں کے ہاتھوں بیس درہم میں فروخت کیا دوسرا قول یہ ہے کہ بائیس (۲۲) درہم میں بیچا، درہم کو ایسے سمجھ لے جیسے چونّی اور تیسری روایت یہ ہے کہ چالیس (۴۰) درہم میں بیچا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی شخصیت اوران کی حیثیت ایسی تھی کہ اگر ان کی قیمت کے طور پر لاکھوں درہم بھی لئے جاتے تو کم تھے مگر چونکہ بھائیوں کا منشا یوسف کو بیچنا نہیں تھا بلکہ وطن سے بے وطن اور باپ سے دور کرنا تھا قرآنِ کریم نے اسی حقیقت کی جانب رہنمائی کرتے ہوئے فرمایا ''وکانوا فیه من الزاهدین'' اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی ان کے باب میں بے رغبت تھے وہ چاہتے تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کسی طریقہ سے یہاں سے چلے جائیں، خیر قافلے والوں نے انہیں خریدا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو لیکر وہ آگے چل دیئے۔

بھائی بے وطن بنارہے تھے اور رب العلمین شاہِ زمن بنارہے تھے

حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے بیان القرآن میں بہت اچھی عبارت تحریر فرمائی ہے فرمایا کہ: اللہ تعالی کی شان دیکھئے کہ ادھر برادرانِ یوسف حضرت یوسف علیہ السلام کو بے وطن بنارہے تھے اور قافلے والے انہیں خرید کر ذریعۂ ثمن بنارہے تھے قافلہ والوں کے پیشِ نظر یہ تھا کہ ان کو مصر میں فروخت کریں گے تو بڑی بھاری قیمت ہاتھ آئے گی، تو بھائی تو انہیں بے وطن بنارہے تھے اور قافلے والے انہیں ذریعۂ ثمن بنارہے تھے اور رب العلمین انہیں شاہِ زمن بنارہے تھے

کہ وہ اپنے زمانہ میں ایک بے مثال بادشاہ بننے والے ہیں، تو ایک جماعت کا قصد تھا بے وطن بنانا اور دوسری کا قصد تھا ذریعۂ ثمن بنانا اور حق تعالیٰ کا منشا تھا شاہِ زمن بنانا۔

توفیقِ الٰہی انعامِ عظیم ہے

اس سے بہت سے نتائج نکلتے ہیں، ان میں سے ایک چیز یہ بھی ہے کہ ہر انسان اپنی طبیعت اور خواہشات کے کنویں میں گرا ہوا ہے جب تک کہ توفیقِ الٰہی کی ڈول رسی اس کی طرف متوجہ نہ ہو یعنی حق تعالیٰ کی طرف سے توفیق کا وارد اس کے قلب پر نہ آئے اسوقت تک آدمی اپنی نفسانی اور ظلمانی خواہشات سے نکل کر روحانی فضا کی طرف نہیں جا سکتا، معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی طرف سے توفیق انعامِ عظیم ہے اور وہ بندے کے اپنے اختیار کی بات نہیں ہے جیسے اس مقام پر معاملہ حضرت یوسف علیہ السلام کے اختیار سے متعلق نہیں تھا، حق تعالیٰ نے شکل پیدا فرمادی اور اس مقام پر ڈول رسی پہنچائی گئی، بہرحال توفیق کا آنا یا ان تجلیات کا ہونا جن سے نفس میں اضمحلال پیدا ہو یہ حق تعالیٰ کی قدرت کی بات ہے بندے کے اختیار کی بات نہیں ہے۔

حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ کی ایک اہم وصیت

اسی لئے سلف صالحین موت تک اپنے حال کے تغیر وتبدل سے خائف رہتے تھے، سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کی وصیتوں میں ہے کہ آدمی کتنا ہی بڑا ہو مگر ہر وقت اپنے حال کے متغیر ہونے اور بدل جانے سے ڈرتا رہے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کل کو کیا بات پیش آجائے اور قلب کی حالت کیا ہو جائے، اس لئے کہ حدیثِ پاک میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ: قلبِ انسانی کی مثال ایسی ہے جیسے پرندے کا کوئی پر کسی میدان میں پڑا ہو اور ہوائیں اسے ادھر سے ادھر الٹتی پلٹتی ہوں (مشکوۃ شریف) یہی وجہ ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے دعا فرمائی کہ ”یامقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک“

(جواہر الاحادیث حدیث نمبر ۹۶۸ بحوالہ درمنثور ۸/۲) اے قلوب کو اُلٹ پُلٹ کرنے والی ذات! میرے قلب کو دین پر جما دیجئے، استقامت دیجئے کہ وہ اس پر جم جائے، تو استقامت بڑی چیز ہے اور توفیق کے بغیر کوئی شئے نہیں ہوسکتی۔

ایک خطرناک سودا

یہاں تو کیفیت یہ ہوئی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے قافلے والوں کے ہاتھ فروخت کیا تو بعض بزرگوں نے فرمایا کہ: یہ بیع اور سودا بہت غلط قسم کا ہوا اس لئے کہ اتنی بڑی قیمتی چیز کو جس کی قیمت لاکھوں درہم بھی نہیں بن سکتے انہوں نے اس کو چند درھموں میں فروخت کردیا جیسے یہ سودا صحیح نہیں تھا اور غبن کا اور گھاٹے کا سودا تھا اس سے زیادہ خطرناک سودا یہ ہے کہ ہم اپنی ذات کو خواہش کے ہاتھ فروخت کردیں جبکہ حق تعالیٰ شانہ نے ہماری ذوات کو خرید لیا ہے چنانچہ ارشاد باری ہے ''ان اللہ اشتری من المؤمنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ'' (توبۃ، آیت: ۱۱۱) حق تعالی نے مسلمانوں کی جانوں اور ان کے مالوں کو خرید لیا ہے اور اس کے عوض میں حق تعالی نے انہیں جنت عطا فرمائی ہے جب رب العلمین نے یہ خرید وفروخت کا معاملہ ہمارے ساتھ فرمایا ہے تو اب اگر کوئی آدمی اپنے نفس کو اور اس کے جوہر اور صلاحیت کو رب العلمین کیلئے قربان کرنے کے بجائے خواہشات کیلئے تج دے اور قربان کردے تو یہ اس سے بھی زیادہ گھاٹے کا معاملہ ہوگا۔

انسان کا سب سے بڑا دشمن اس کا نفس ہے

اور بعض عارفین نے اس سے یہ نکتہ مستنبط کیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے قلب میں اس وقت عداوت اور دشمنی کی کیفیت تھی اس اعتبار سے گویا یوں کہہ سکتے ہیں کہ دشمنوں نے فروخت کیا حضرت یوسف علیہ السلام کو قافلے والوں

کے ہاتھ اب اگر ہم اپنی صلاحیتوں کونفس کے حوالے کر دیں تو گویا ہم نے اپنی صلاحیتوں کو دشمنوں کے ہاتھ فروخت کر دیا اس لئے کہ حدیثِ پاک میں فرمایا گیا کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن اس کا نفس ہے یہ اس سے زیادہ خطرناک بات ہے کہ وہاں تو گویا بیچنے والے دشمن تھے مگر جن کو بیچا گیا وہ تو دشمن نہیں تھے وہ تو راغب تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح ان کو لے جائیں، تو بیچنے والے دشمن تھے مگر خریدنے والے دشمن نہیں۔ اور اگر آدمی اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر دے اور نفس کے ہاتھوں بیچ دے تو ظاہر بات ہے کہ نفس تو اعلیٰ درجہ کا دشمن ہے تو وہاں بیچنے والے دشمن یہاں خریدنے والے دشمن، آپ کے کچھ پلّے بھی پڑتا ہے؟ یا ویسے ہی سب سر کے اوپر سے جا رہا ہے کہیں آپ لوگ ''وکانوا فیہ من الزاھدین'' کا مصداق نہ ہوں، بہر حال اگر انسان اپنی صلاحیتوں کو ضائع نہ کرے تو واقعی اس کے لئے بڑی فلاح کی شکلیں ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں فہم نصیب فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ پر یقین کا ایک ایمان افروز واقعہ

ایک واقعہ یاد آیا، امامِ غزالیؒ نے لکھا ہے کہ ایک شخص تھے انہوں نے یہ طے کیا تھا کہ میں حق تعالیٰ کے علاوہ کسی سے سوال نہیں کروں گا، اب ہوا یہ کہ ایک روز جناب کہیں تشریف لے جا رہے تھے راستہ سے کچھ دور ایک بغیر منڈیر کا کنواں تھا اس پر پیر پڑ گیا تو وہ دھم سے نیچے پہنچ گئے اب وہ کنواں عام راستے سے ہٹ کر تھا اور وہ جگہ بھی کچھ ویران سی تھی اب نفس سے ان کا معاہدہ ہوا تھا کہ خدا تعالیٰ کے علاوہ کسی سے سوال نہیں کر وں گا مگر اندر سے نفس کہتا تھا کہ اگر کسی کو پکارو گے نہیں تو بچنے کی کوئی شکل نہیں ہے، خیر اس میں بیچارے کچھ وقت رہے مگر نفس بیتاب و بے چین تھا کہ کسی کو اندر سے پکارنا چاہئے اور کسی کو مدد کیلئے بلانا چاہئے، کچھ دیر گذرنے کے بعد محسوس ہوا کہ کچھ آدمی کنویں

کے پاس باتیں کررہے ہیں تو اور زیادہ خواہش پیدا ہوئی کہ کسی طرح ندا دے تا کہ کوئی شخص آئے اور داد رسی کرے اور کسی طرح نکالنے کی کوشش کرے، مگر وہ اپنے اس معاہدے پر جمے ہوئے تھے اور نفس میں ایک قسم کا ابال تھا اور بے چینی تھی کہ ان کو آواز دو، پھر آواز کان میں آئی کہ وہ لوگ کہہ رہے ہے کہ چونکہ کنویں پر منڈیر نہیں ہے کیا اچھا ہو کہ ہم لوگ اس پر لکڑیاں رکھ دیں اور اس کو بند کردیں تا کہ کوئی جانور یا انسان بھول کر اندر گر کر ہلاک نہ ہو ادھر یہ تجویز ہو رہی ہے اور ادھر وہ اپنے معاہدے پر جمے ہوئے تھے کہ ہمیں کسی سے سوال نہیں کرنا ہے اور اندر نفس زور لگا رہا ہے کہ ہمیں کسی صورت میں یہاں ٹھہرنا نہیں ہے، اب باہر والوں نے اپنی تجویز کے مطابق منڈیر پر ایک تختہ رکھا اس کے بعد دوسرا رکھا تیسرا رکھا اور ادھر اندر اس شخص کی بیتابی بڑھ رہی تھی حتی کہ چوتھا پھر پانچواں چھٹا تختہ رکھا یہاں تک کہ جب صرف ایک تختہ کی گنجائش رہی ہے تو نفس نے کہا کہ اب بھی پکارو تا کہ وہ مدد کریں اور ہم باہر نکلے ورنہ آ بنے گی، مگر انہوں نے یہ طے کیا تھا کہ مجھے حق تعالیٰ کے علاوہ کسی سے سوال نہیں کرنا ہے چاہے اس کنویں میں میری جان چلی جائے اس لئے کہ اپنے رب سے معاہدہ ہے اور خدا تعالی سے معاہدہ کر کے کوئی آدمی نا کام نہیں ہوتا آخر جب ایک تختہ کی جگہ باقی رہی اور وہ بھی انہوں نے لا کر رکھ دیا تو اندر سے نفس نے کہا کہ اب بھی آواز دو ورنہ اگر یہ لوگ رخصت ہو گئے تو اندر پڑے پڑے سڑ جاؤ گے اور مر جاؤ گے مگر جی یہی کہتا تھا کہ حق تعالیٰ سے معاہدہ ہے وہ حفاظت فرمائیں گے، چنانچہ وہ تختہ بھی رکھ دیا گیا پھر ان لوگوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ ممکن ہے کہ تختے ہٹ جائیں کیا اچھا ہو کہ ہم پتھر لا کر اس کے اوپر رکھدیں تا کہ یہ تختے ہٹ نہ سکیں تو اندر سے نفس نے کہا کہ لیجئے یہ اوپر پتھر رکھنے جا رہے ہیں اس لئے اب وہ میرے حق میں لمبی سی قبر بن جائے گی، خیر پتھر لا کر رکھا گیا اس وقت بھی نفس نے بہت

تقاضہ کیا کہ پکاروتا کہ کسی طرح وہ نکالے مگر وہ اپنے معاہدے پر جمے ہوئے تھے اور اب تک انہیں استقامت حاصل تھی اسوقت پھر نفس نے کہا کہ یہ تو با قاعدہ قبر بن گئی، خیر وہ سب رخصت ہو گئے اب نفس کو بڑی تشویش ہوئی کہ اب معلوم نہیں یہاں کیا حشر ہو گا مگر حق تعالیٰ ''علیم بذات الصدور،، ہیں، ذرّہ ذرّہ سے باخبر ہیں دل تک کا حال جانتے ہیں حق تعالی نے اپنے فضل سے نصرت کی ایک شکل پیدا فرمادی وہ اسی حال میں تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ہاتھ ظاہر ہوا اور ساتھ ہی ایک آواز آئی کہ اسے پکڑ لو، پھر خیال آیا کہ غیر اللہ کی طرف توجہ مناسب نہیں ہے ہم نے تو یہ معاہدہ کیا تھا کہ حق تعالیٰ نکالیں گے، معاً یہ خیال آیا کہ ہم نے اپنے طور پر کسی کو نہیں پکارا غیبی طور پر حق تعالیٰ نے یہ شکل پیدا کی ہے اس سے فائدہ نہ اٹھانا مناسب نہ ہوگا چنانچہ ہاتھ کو پکڑنا تھا کہ ایسا محسوس ہوا جیسے بجلی کا کرنٹ لگا ہوا اور اس طرح وہ اندر سے باہر آ گئے اور باہر نکل کر دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شیر ہے جو بھاگا ہوا چلا جا رہا ہے حجۃ الاسلام امامِ غزالیؒ نے لکھا ہے کہ یہ عجیب وغریب بات ہے کہ شیر جس کا پنجہ انسان کے حق میں مہلک ثابت ہوتا ہے مگر حق تعالیٰ شانہ نے غیبی طور پر یہ شکل ظاہر فرمائی پھر غور کرنے کی بات ہے کہ کنویں کی گہرائی اور اس کے پنجہ میں کوئی نسبت نہیں ہے اسکے ذریعہ نکالنے کی شکل پیدا کرنا یہ حق تعالیٰ کی طرف سے ایک صورت ہوئی جو عقل سے بالاتر ہے حق تعالی کی ذات ہی ہے جو ہلاکتوں سے بچانے والی ہے۔

بڑوں کے معاملات عجیب ہوتے ہیں

بہر حال حضرت یوسف علیہ السلام کو قافلہ والوں نے لیا اور لے کر چلدیئے، بعض کتابوں میں میری نظر سے گذرا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بچپن میں ایک دفعہ آئینہ دیکھا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے جمال کی کیفیت کیا تھی وہ میں پچھلی

مجلس میں عرض کر چکا ہوں کتابوں میں لکھا ہے کہ کوئی چیز حلق سے نگلتے تھے تو حلق سے نگلتے ہوئے محسوس ہوتی تھی، حورِعین کے باب میں ہے کہ ان کی پنڈلیوں کی ہڈی میں جو گودا ہوگا وہ گودا بھی انسان کو نظر آئے گا مگر آپ یہ اشکال نہ کریں کہ دنیا میں ذرا سا پاؤں چھل جاتا ہے تو اسکو دیکھ کر طبیعت مکدر ہو جاتی ہے تو جنت میں دنیا کی طرح خون اور کثافتیں نہیں ہوں گی حافظ ابنِ کثیرؒ تو لکھتے ہیں کہ ایسی شکل ہوگی کہ جیسے ایک چاندی کی لڑی پرودی گئی ہو بہر حال وہاں جمال کا ظہور موجبِ لذت اور فرحت ہوگا اور دیکھنے والے کو اس سے انبساط اور خوشی ہوگی، بہر حال حضرت یوسف علیہ السلام نے بچپن میں آئینہ دیکھا اور آئینہ دیکھ کر یہ جملے ان کے منہ سے نکلے کہ اگر میری قیمت لگائی جائے تو کون میری قیمت ادا کر سکے گا؟ اب یہ جملہ ایسا تھا جس سے کچھ اور بھی بو آتی ہے اور بڑوں کے معاملات عجیب ہوتے ہیں بچپن سے ان کی تربیت ایک خاص انداز سے کی جاتی ہے اللہ تعالیٰ کا یہ ایک نظام ہے، بعض اربابِ تفسیر نے لکھا ہے کہ بچپن میں ان کے منہ سے جو ایک بول نکلا تھا اس کا اثر یہ ہوا کہ چند ٹکوں اور درہموں کے عوض فروخت ہوئے، معلوم ہوا کہ انسان کبھی کسی حال میں کوئی بڑا بول نہ بولے، یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں کبر کا سوال نہ تھا مگر بعض مرتبہ حضرتِ حق کی نظر میں صورت پسندیدہ نہیں ہوتی جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ’’انا اعلم‘‘ کہا تھا، بہر حال حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ معاملہ ان کی حالت رفیعہ کی وجہ سے پیش آیا۔

جھوٹے دعویٰ کی دنیوی سزا

مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی باب میں جھوٹا دعوی کیا تو نتیجۃً اسے ذلت پیش آئے گی مثلاً اپنی حیثیت سے زیادہ مالدار اپنے کو بتایا یا اپنی حیثیت سے بڑا عالم اپنے کو بتایا یا اپنی حیثیت سے بڑا بزرگ بتایا تو یہ ایک قسم کا جھوٹا دعویٰ ہے اور

کبھی فعل سے بھی دعویٰ ہوتا ہے، بہرحال کسی قسم کا جھوٹا دعوے کرے تو اسے بھگتنا پڑے گا، یہاں تو خیر دعویٰ نہیں تھا مگر بظاہر عنوان ایسا تھا اور بڑوں کی بات بڑی ہوتی ہے۔

زہد کا مطلب

عجیب بات ہے کہ بھائیوں کے باب میں قرآنِ کریم میں فرمایا گیا کہ بھائی بے رغبت تھے اور سمجھ میں آتا ہے کہ بھائیوں کی بے رغبتی بھی ان کے نفس کا اثر تھی ورنہ زہد کی تو حقیقت ہی یہ ہے کہ جس چیز کی طرف طبیعت چلتی ہو اس سے طبیعت کو جبر کر کے ہٹایا جائے، زہد فی الدنیا کا مطلب یہی ہے کہ دنیا کی طرف انسان کی طبیعت چلتی ہے اسکے باوجود انسان دنیا سے طبیعت کو ہٹائے (علامات محبت ص۶۵۳ مجالس مفتئ اعظم ص۴۴۱) مثال کے طور پر آپ نے مٹھائی دیکھی طبیعت چاہتی ہے کہ مٹھائی کھائے اب آپ طبیعت کو روکے یہ زہد کہلائیگا، اگر آپ نے نجاست دیکھی اور آپ اس سے ہٹ گئے تو یہ زہد نہیں کہلائے گا اس لئے کہ طبیعت کو تو از خود اس سے نفور ہے تو گویا لفظ "زھد" سے یہ بھی نکلا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں پر ایک کیفیت خاصّہ غالب تھی اور اس میں حسد کی شرکت تھی جس کو کیدِ شیطانی کا کوئی اثر کہہ سکتے ہیں، غرض یہ کہ وہ کیفیت حضرت یوسف علیہ السلام سے بے رغبتی کا سبب بن گئی ورنہ وہ خود بھی اپنے اندر سے حضرت یوسف علیہ السلام کو چاہتے تھے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے کمالات ان کی طرف توجہ اور کشش کا سبب تھے، حاصلِ کلام یہ نکلا کہ آدمی کی نظر حق تعالیٰ پر ہونی چاہئے، چاہے آدمی کنویں جیسی تاریکی میں پھنس جائے اگر حق تعالیٰ پہ نظر ہوگی تو ضرور وہ نکلنے کی شکل پیدا فرما دیں گے۔

ان اللہ یحب ان یری اثر نعمتہ علی عبدہ

اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے بھائیوں سے بھی محتاط رہے اس لئے

کہ ’’کل ذی نعمۃ محسود‘‘ ہر نعمت والے پر حسد کیا جاتا ہے اور حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ: اپنی ضرورتیں پورا کرنے میں کتمان اور اخفاء سے مدد حاصل کرو اور یہ بھی وارد ہے کہ بندہ پر اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اثر ظاہر ہو یہ بھی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے (مسند احمد ۲/۱۰۸) بہر حال ان میں سے ہر ایک کا ایک خاص مقام اور ایک موقع ہے جیسے مثال کے طور پر حق تعالیٰ نے کسی کو دس لاکھ پاؤنڈ عطا فرمائے ہیں اب وہ کپڑے ایسے پہنتا ہے جیسے ہندوستان کے مارواڑی (بنئے) پہنتے ہیں کہ ان کے کپڑے دیکھ کر پتہ ہی نہیں چلتا کہ کبھی ایک پیسہ بھی ان کو نصیب ہوا ہوگا، حالانکہ حق تعالیٰ نے نعمت دی ہو تو اس کا اثر بھی ظاہر ہونا چاہئے یعنی انسان اچھے حال میں رہے مگر اظہارِ نعمت کا یہ مطلب نہیں کہ وہ دس لاکھ کی نوٹوں کو لیکر سڑک کے کنارے اور فٹ پاتھ پر کھڑا ہو جائے یہ اس کے لئے فتنہ کا سامان ہے، تو گفتگو کا حاصل یہ نکلا کہ آدمی کو اپنے معاملات میں محتاط رہنا چاہئے۔

حسد تمام رذائل کی اصل ہے

اور یہ بھی آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ حسد سب سے زیادہ خطرناک چیز ہے، امامِ رازیؒ نے تفسیر کبیر میں سورۂ فلق کی تفسیر میں ثابت کیا ہے کہ تمام رذائل کی اصل حسد ہے سب سے بدترین رذیلہ انہوں نے حسد کو قرار دیا ہے اور بعض نے کبر کو سب سے بدترین رذیلہ قرار دیا ہے۔

اب یہ بھی سن لیں کہ حسد کہتے کسے ہیں میں اس کی دو مثال دیتا ہوں اس سے آپ کو آسانی سے بات سمجھ آجائے گی مثلاً ایک آدمی نے کسی کی بلڈنگ دیکھی اور چاہا کہ وہ اسکے ہاتھ سے نکل جائے چاہے مجھے ملے یا نہ ملے یہ حسد ہے، یا کسی کو دیکھا کہ وہ حافظ ہے تو یوں چاہا کہ وہ بھول جائے اور میں حافظ ہو جاؤں یہ حسد ہے، ہاں! آدمی یہ چاہیں کہ میں بھی حافظ ہو جاؤں اور وہ بھی نہ بھولے تو یہ رشک ہے اور پسندیدہ ہے، اگر

آدمی کوئی نعمت دیکھے اور دیکھ کر چاہے کہ مجھے بھی یہ نعمت ملے اور اسکے پاس بھی رہے تو یہ رشک ہے، اور یہ چاہے کہ اس کے پاس سے چلی جائے اور مجھے ملے یہ حسد ہے گویا حاسد سامنے والے سے نعمت کا زوال چاہتا ہے کہ وہ نعمت اس کے پاس سے ختم ہو جائے، ایک بات اور سن لیں کہ حاسد کو جو نقد سزا ملتی ہے وہ تو یہی ہے کہ وہ حسد کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔

حسد کا ایک نفسیاتی علاج

اگر کوئی آدمی اس بیماری میں (حسد میں) مبتلا ہے تو اس کا ایک نفسیاتی علاج شیخ محی الدین ابنِ عربیؒ نے لکھا ہے اس پر عمل کرے انشاء اللہ اس سے فائدہ ہوگا وہ لکھتے ہیں کہ آدمی اپنے اندر کوئی کمال پیدا کرلے جب دیکھا کہ فلاں کے کمال سے دل میں جلن ہورہی ہے تو اس موقع پر آدمی اپنے کمال اور خوبی کو مستحضر کرلے اور یہ سوچ لے کہ اگر اللہ تعالی نے اس کو وہ خوبی دی ہے تو مجھے بھی حق تعالی نے یہ خوبی عطا فرمائی ہے اسکے نتیجہ میں آدمی اس پریشانی سے بچ جائے گا۔

حاسد تقدیرِ الٰہی پر معترض ہے

اور اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ حاسد تقدیرِ الٰہی پر معترض ہے گویا وہ در پردہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ اس کو یہ چیز کیوں ملی؟ یہ اس کا مستحق نہیں تھا حالانکہ یہ اللہ تعالی کی تقدیر اور تقسیم ہے۔

قسمت کیا ہر ایک کو اقسام ازل نے
ہر شخص کو جس چیز کے وہ قابل نظر آیا
پروانے کو دیا جلنا تو بلبل کو دیا نالہ
غم ہم کو دیا جو سب سے مشکل نظر آیا

یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو اس کے مناسب چیز تقسیم کی ہے بلبل کو نالہ، پروانے کو جلنا اور انسان کو غم دیا جو سب سے مشکل نظر آیا تو غم بھی ایک نعمت ہے، اس سے دل کی بہت زیادہ صفائی ہوتی ہے، تو کہنے کا منشا یہ ہے کہ اپنے بھائیوں سے بھی آدمی محتاط رہے، اس واقعہ سے یہ سبق بھی ملتا ہے۔

بعض مرتبہ نعمت کے اخفاء کی ضرورت ہوتی ہے

اور اس سے ایک بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر انسان کو کبھی غیر متوقع طور پر کوئی چیز مل جائے تو ایسے موقعہ پر اس کو اخفاء سے کام لینا چاہئے جیسے قافلہ والوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کا اخفاء کیا تھا کہ کوئی ان پر مطلع نہ ہو، تا کہ کوئی گڑبڑی واقع نہ ہو، تو غرض یہ کہ اس میں بڑے اسباق ہیں۔

انسان کی ابتدائی مشقتیں بعد میں اس کے لئے اچھے نتائج پیدا کرتی ہیں

اور یہ بھی آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے باب میں آگے چل کر فرمایا گیا ہے کہ ’’ انہ من یتق ویصبر ‘‘(یوسف ،آیت: ۹۰) یعنی جو تقویٰ اختیار کرے اور صبر کرے تو اللہ تعالیٰ ایسے نیکو کاروں کے اجر کو ضائع نہیں فرماتا، حضرت یوسف علیہ السلام کی وہ شان وشوکت جو ان کو بعد میں حاصل ہوئی اگر اس کو کوئی شخص دیکھے گا تو وہ یہی سوچے گا کہ واقع میں حضرت یوسف علیہ السلام بڑے مزے میں ہیں مگر آپ نے ابتداء میں جو پاپڑ بیلے ہیں اور جو جتن کئے ہیں اور جو تکلیفیں اٹھائی ہیں اگر آدمی ان کو مستحضر رکھے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ انسان کی ابتدائی مشقتیں بعد میں اس کے لئے اچھے نتائج پیدا کرتی ہیں، خیر بھائی حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس آئے اور آپ سے صورتِ حال بیان کی تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے صبر جمیل اختیار فرمایا۔

حقیقتِ حال بیان کرنا صبر کے خلاف نہیں ہے

یہاں ایک ضروری بات سن لیں، کبھی ضرورت کے موقعہ پر اپنا اصلی حال بیان کرنا صبر کے خلاف نہیں ہے، حضرت عمرؓ سے ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت! مزاج کیسے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ طبیعت ٹھیک نہیں، تو وہ شخص کہنے لگا کہ آپ اللہ تعالی کی شکایت کررہے ہیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: واہ! حق تعالیٰ تو چاہتے ہیں کہ میری بیماری اور کمزوری ظاہر ہو اور میں اپنی پہلوانی بتاؤں؟ تو معلوم ہوا کہ اظہارِ حقیقت یہ شکایت مذمومہ میں داخل نہیں، یہ تو اپنی کمزوری کا اظہار ہے جو عبدیت کا ایک شعبہ ہے، ہاں اگر شکوہ شکایت کا انداز ہو تو پھر حکم اور ہوگا۔

تین بزرگوں کی تین مختلف حالتیں

میں اس سلسلہ میں آپ کو ہمارے تین بزرگوں کا حال سناتا ہوں، حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ بیمار ہوتے تو خوب واویلا کرتے تھے گویا عبدیت کا اظہار فرماتے تھے، چنانچہ بعض لوگ بیمار ہوتے ہیں تو ان کے گھر کا منظر دیکھنے کے لائق ہوتا ہے ان کی عجیب وغریب کیفیت ہوتی ہے اور حضرت گنگوہیؒ بیمار ہوتے تو نہ شور نہ شغب البتہ اتباعِ سنت میں علاج کا اہتمام فرماتے تھے اور آپ پر تو واقعی اتباعِ سنت کا غلبہ تھا اور حضرت نانوتویؒ بیمار ہوتے تو لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا تھا اور کبھی اچھے ہونے کے بعد برسبیل تذکرہ زبان پر آجاتا تھا تو فرماتے تھے کہ ہاں بخار آ گیا تھا، بہرحال کسی پر تفویض کی شان غالب ہے، کسی پر اتباعِ سنت کی، تو کسی پر عبدیت کی شان غالب ہے (مجالس حکیم الاسلام ج۱ ص۱۲۵ تا ۱۲۷) یہ بزرگوں کے الوان (رنگ) ہیں، تو کہنے کا منشا یہ ہے کہ شکوہ شکایت تو جائز نہیں ہے مگر ضرورت کے محل میں اپنا ذوق ظاہر ہو تو کوئی حرج نہیں جیسے آپ سے کوئی پوچھے کہ کیسے گذر رہی ہے؟ اب آپ کہے کہ کڑکی (مالی تنگی) چل رہی

ہے اور آپ کا منشا لالچ نہیں ہے کہ سامنے والے سے کچھ مانگیں اور نہ منشا اللہ تعالیٰ کی شکایت ہے بلکہ مقصود صرف اپنی اصلی حالت کا اظہار ہے تو اس کی گنجائش ہوگی اور اگر قصد کچھ اور ہے یا بعد میں نیت کچھ اور ہوگئی تو اس صورت میں پھر احکام میں تبدیلی ہوگی ،تو یہ سارے فوائد ''فصبر جمیل ،، سے حاصل ہوتے ہیں۔

دعائیہ کلمات

یہ چند کلمات عرض کئے گئے، اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ ہم جو اپنی طبیعت کے کنویں میں پڑے ہوئے ہیں خدا کرے کہ اُدھر سے ڈول رسّی نصیب ہوجائے اور اُدھر سے کوئی ایسی شکل پیش آئے کہ ہم اپنے نفس کے کنویں سے نکل کر باہر روحانیت کی کشادہ فضا میں پہنچیں بلکہ حق تعالی ولایت کے تخت پر متمکن فرمادیں اور ولایت کے تاج سے سرفراز فرمادیں تاکہ ہم لوگوں کا بیڑا پار ہوجائے۔

۞۞۞۞۞

درس نمبر انیس سے حاصل ہونے والی پانچ اہم ہدایات

(۱) حق تعالی ہر چیز پر قادر ہے وہ عاجز اور بیکس انسان کو بھی تخت وتاج کا مالک بنا سکتا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ اسکی ایک نظیر ہے حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بہت خوب لکھا ہے کہ برادرانِ یوسف حضرت یوسف علیہ السلام کو فروخت کر کے بے وطن بنا رہے تھے اور قافلہ والے انہیں خرید کر ذریعۂ ثمن بنا رہے تھے اور رب العلمین انہیں شاہِ زمن بنا رہا تھا۔

(۲) آدمی اپنے بھائیوں سے بھی محتاط رہے کہ ''کل ذی نعمة محسود،، ویسے حدیث شریف میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ بندہ پر اثرِ نعمت ظاہر ہو یہ بھی اللہ تعالی کو پسند ہے مگر اس کا ایک خاص مقام اور موقع ہے اس کو آدمی کو سمجھنا پڑے گا۔

(۳) دو چیزیں ہیں ایک ہے رشک اور ایک ہے حسد، آدمی کسی کے پاس کوئی نعمت دیکھے اور یہ چاہے کہ مجھے ملے اور اسکے پاس بھی رہے یہ رشک ہے اور اگر یہ چاہے کہ نعمت اس کے پاس سے چلی جائے اور مجھے ملے یہ حسد ہے، رشک کی تو گنجائش ہے مگر حسد کی نہیں۔

(۴) انسان کی ابتدائی مشقتیں بعد میں اس کے لئے اچھے نتائج پیدا کرتی ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ اس کا پتہ دے رہا ہے۔

(۵) ضرورت کے موقعہ پر اپنا اصلی حال بیان کرنا یہ صبر کے خلاف نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کا واقعہ اس کا پتہ دے رہا ہے۔

درس نمبر (۲۰)

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم، امابعد!

فاعوذ بالله من الشیطن الرجیم ، بسم الله الرحمن الرحیم☆

وقال الذی اشتراه من مصر لاا مراته اکرمی مثواه عسے ان ینفعنا او نتخذه ولدا ،وکذلک مکنا لیوسف فی الارض ولنعلمه من تاویل الاحادیث والله غالب علے امره ولکن اکثر الناس لا یعلمون ☆

نگاہیں دوقسم کی ہیں

محترم حضرات! اس دنیا میں نگاہیں دوقسم کی ہیں ایک نگاہ وہ ہے جو واقعات کو واقعات ہی کی حد تک دیکھتی ہے واقعات کی ابتداء اور انتہا اور ان کے فوائد اور نتائج سے کوئی بحث نہیں ہوتی یہ سطحی نگاہ ہے۔

اور ایک نگاہ نگاہِ بصیرت ہے بصیرت مندانہ نگاہیں کسی واقعہ کے منشا کو بھی سمجھتی ہیں کہ یہ واقعہ کیوں وجود میں آیا اسکے آثار ونتائج اور ثمرات کیا ہوں گے، تو وہ ان وجوہ پر بھی غور وفکر کرتی ہیں اور وہ تاڑ لیتی ہیں کہ اسکی پشت پر کیا عواقب ونتائج ہیں جو بعد میں ظاہر ہوں گے، تو اس عالم میں دوقسم کے لوگ ہیں ایک وہ جن کی نگاہیں سطحی اور ظاہری ہیں اور ایک وہ طبقہ ہے کہ جو حقیقت رس ہے جو حقیقت تک پہنچتا ہے، حق تعالی شانہ کے جتنے معاملات اِس عالم میں بندوں کے ساتھ ہوتے ہیں اُن میں بھی بعض مرتبہ وہ اپنے ظاہر اور اپنی صورت سے تو ناگوار معلوم ہوتے ہیں مگر بعد میں ان کے جو آثار اور نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ مستحسن ہوتے ہیں بلکہ انہی کی غرض سے وہ معاملہ وجود میں آتا ہے۔

مقصود لذاتہ اور مقصود لغیرہ کا فرق

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ایک شئی مطلوب لذاتہ ہوتی ہے اور ایک

شئ مطلوب لغیرہ ہوتی ہے چنانچہ بعض مرتبہ آدمی کسی شئ کا قصد کرتا ہے تو اس میں کبھی دو چیزیں مقصود معلوم ہوتی ہیں مگر ان میں سے ایک اپنی ذات سے مقصود نہیں ہوتی بلکہ وہ صرف ذریعہ ہوتی ہے جیسے مثال کے طور پر آپ یہاں سے کسی ہوٹل میں جانا چاہیں جہاں نہایت عمدہ قسم کی چائے ملتی ہو اب آپ اسکے لئے کسی سواری کا انتخاب کریں تو وہ سواری بھی آپ کا ایک مقصود ہے مگر سواری مقصود لذاتہ نہیں ہے حالانکہ قصد تو آپ نے اُس سواری کا بھی کیا ہے مگر آپ کا اصل مقصود ہوٹل میں پہنچنا اور چائے پینا ہے تو یہ مقصود لذاتہ ہے اور وہ مقصود لغیرہ ہے، یا جیسے مثلاً خدانخواستہ آپ کو پیر میں پھوڑا ہو اور آپ اپنے پیر کا آپریشن کروائیں اور اس میں تکلیف برداشت کریں تو یہ سب چیزیں آپ کا مقصود ہیں مگر لذاتہ نہیں بلکہ اسکے نتیجہ میں جو صحت حاصل ہوگی وہ آپ کا مقصود ہے۔

تو بعض مرتبہ بعض چیزیں اپنی صورت سے تو گراں اور ناگوار ہوتی ہیں مگر نتائج ان کے بڑے خوشگوار اور اچھے ہوتے ہیں۔

حق تعالی کے اپنے بندوں کے ساتھ دو قسم کے نظام ہے

بہر حال سیدنا حضرت یعقوب علیہ السلام کی نظر سے حضرت یوسف علیہ لسلام اوجھل کئے گئے بلکہ اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ حق تعالی کا ایک نظام اپنے بندوں کے ساتھ جذب کا ہے کہ خدا تعالی بندوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور ایک نظام صَرُف کا ہے کہ بندے کی طبیعت کسی چیز سے لگ جاتی ہے تو وہ چیز اس سے ہٹا دی جاتی ہے۔

صَرُف کی چند مثالیں

چنانچہ کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت میں تھے، بڑا اچھا خوشگوار ماحول، ہر چیز طبیعت کے موافق مگر ایک بات پیش آئی اور جنت ان سے چھڑا

دی گئی تو جنت پسندیدہ چیز تھی اس کا صَرف کیا گیا ان کو جنت سے ہٹا دیا گیا، یا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملکِ مصر سے ایک قسم کا لگاؤ تھا اور انس پیدا ہو گیا تھا مگر قبطی کے قتل کا واقعہ پیش آیا کہ مارا اسے مکاّ اور تھا ایسا پکاّ کہ کام اس کا بن گیا اور وہ آخرت کی طرف رخصت ہو گیا پھر فرعون کی پارلیمنٹ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا مشورہ ہوا چنانچہ ایک مخلص نے آ کر اطلاع دی تو آپ وہاں سے خوف کی حالت میں نکلے، دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر سے ایک لگاؤ تھا مگر شکل یہ پیش آئی کہ مصر کو چھوڑنا پڑا ابّا جی سے جنت چھڑوائی گئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مصر ترک کروایا گیا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام سے بڑا شغف تھا خود قرآنِ کریم ہی کے الفاظ ہیں کہ ''انی لیحزنی ان تذھبوا بہ،، تمہارا یوسف کو لے جانا میرے لئے حزن اور غم کا باعث ہوگا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام سے انتہائی لگاؤ اور شغف تھا پس واقعہ ایسا پیش آیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام سے ہٹا دیئے گئے اور یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے نبی کریم ﷺ کو مکہ مکرمہ سے محبت تھی یہی وجہ ہے کہ جب ورقہ بن نوفل نے پیشین گوئی کی تھی کہ آپ کی قوم آپ کو مکہ مکرمہ سے نکالے گی اور اگر میں اس وقت زندہ رہا تو میں آپ کی بھرپور مدد کروں گا (سیرۃ المصطفیٰ ج ا ص ۱۴۰) تو نبی کریم ﷺ نے تعجب سے پوچھا تھا کہ کیا میری قوم مجھے نکالے گی؟ یعنی جب آپ کے اخلاق ایسے، سلوک ایسا، ہمدردی ایسی اور پھر یہ سنا کہ میری قوم مجھے نکالے گی تو تعجب ہوا پھر جب نبی کریم ﷺ نے پیارا مکہ چھوڑا تو آپ ﷺ نے مکہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اگر میری قوم مجھے یہاں سے نہ نکالتی تو میں تجھے نہ چھوڑتا (ترمذی، ابن ماجہ) معلوم ہوا کہ آپ کو مکہ مکرمہ سے لگاؤ تھا اور نہ صرف آپ کو لگاؤ تھا بلکہ صحابہ کرام کو بھی لگاؤ تھا تو مکہ مکرمہ سے علیحدگی کی شکل سامنے آئی۔ یہی وجہ ہے کہ

حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت بلالؓ جیسے غیر معمولی شخص یعنی بڑے شخص لوگ غیر معمولی کو معمولی سمجھتے ہیں حالانکہ غیر معمولی کے معنی بڑے کے آتے ہیں یہ لوگ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد بعض دفعہ مکہ مکرمہ کو یاد کر کے وطن کی محبت میں روئے ہیں (اسوۂ صحابہ حصہ اول ص۴۵) اور وطن بھی مکہ مکرمہ جو کہ مہبطِ وحی اور برکتوں کا مرکز تھا ویسے تو نبی کریم ﷺ نے حُبِّ مدینہ کی بھی دعا فرمائی کہ اسکی محبت پیدا ہو جائے (مشکوۃ شریف باب حرم المدینۃ حرّسھا اللہ تعالی حدیث نمبر۷) بہر حال مکہ مکرمہ بھی آپ کو پیارا تھا مگر آپ سے چھڑایا گیا پھر آپ کو ازواج مطہرات میں ماں عائشہ صدیقہؓ سے بڑی محبت تھی حضرت خدیجہؓ کے وصال کے بعد جتنی بھی ازواج مطہرات اور امہات المومنین تھیں ان میں حضور ﷺ کو ماں عائشہ صدیقہؓ سے بڑی محبت تھی اور محبت غیر اختیاری ہوتی ہے کہ نہ لگائے لگے، نہ بجھائے بجھے، ایسا شعلہ ہے جو لگانے سے لگتا نہیں اور بجھانے سے بجھتا نہیں بلکہ بجھانا چاہو تو اور اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ شاعر تو کہتا ہے ؎

مریضِ عشق پہ رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

تو نبی کریم ﷺ کو ماں عائشہؓ سے بڑی محبت تھی مگر جب آپ ایک غزوہ سے لوٹے ہیں اور حضرت عائشہؓ اپنے ہار کے گم ہو جانے کی وجہ سے اسکی تلاش میں نکلیں تو صحابہ کرام نے اونٹ کا ہودج اونٹ پر رکھ دیا اور سمجھے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ اندر موجود ہیں مگر وہ اندر نہیں تھیں۔ بہر حال اس غزوہ میں حضرت عائشہؓ آپ سے پیچھے رہ گئیں تو حضرت صفوان بن معطلؓ جن کا کام ہی یہ تھا کہ بعد میں گری پڑی چیزیں اٹھایا کرتے تھے انہوں نے دیکھا کہ حضرت عائشہؓ پڑاؤ کی جگہ موجود ہیں تو انہوں نے حضرت عائشہؓ کو بہت دیانتداری کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچایا یہ بڑا لمبا واقعہ ہے اس موقعہ

پر منافقین کو بڑا اچھا موقع ملا اور انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ حضرت عائشہؓ پاکدامن نہیں ہیں بلکہ غلط کیریکٹر کی حامل ہے اور انہوں نے بعض بھولے بھالے مسلمانوں کو بھی متاثر کر دیا تو یہ سازش تھی اور اس سے نبی کریم ﷺ کو شدید ترین تکلیف ہوئی ۔ بہر حال نبی کریم ﷺ کو حضرت عائشہؓ سے خاص والہانہ محبت تھی تو ایک مدت کے لئے آپ کو ان سے ہٹایا گیا، اسکے بعد چند آیتیں نازل ہوئیں اور ان میں حضرت عائشہؓ کی برأت ظاہر کی گئی۔

دیکھئے مکہ مکرمہ پسندیدہ چیز تھی وہ بھی چھڑایا گیا اور بیویوں میں ماں عائشہ صدیقہؓ سے بڑا تعلق تھا ان سے بھی کچھ مدت کے لئے صَرف کی شکل ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالی کا ایک نظام صَرف کا ہے کہ جس شئی سے کسی مخلص بندے کو لگاؤ ہوتا ہے تو وہ شئی اُس سے ہٹالی جاتی ہے۔

بظاہر بے وقاری کا معاملہ تھا مگر اس میں وقار چھپا پڑا تھا

یہاں بھی حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام سے بہت زیادہ لگاؤ اور بڑی محبت تھی تو یہ صَرف کا عمل وجود میں آیا کہ وہ ان سے ہٹا دیئے گئے چنانچہ وہ گود سے نکلے اور کنویں میں پہنچا دیئے گئے اددسکے بعد حق تعالی نے کنویں سے نکلنے کی شکل پیدا کی کہ آپ قافلہ والوں کے ہاتھوں فروخت کئے گئے یہ بھی ایک قسم کی بظاہر تکلیف اور بے وقاری سا کا معاملہ ہے مگر اِس میں وقار بھی چھپا پڑا تھا کہ جنہوں نے ان کو خریدا وہ ان کے طالب بھی تھے، اسکے بعد وہ قافلے والے وہاں سے روانہ ہوئے اب کون بھلا اس بات کو سوچ سکتا تھا کہ بھائیوں نے جن کو کنویں کی نذر کر دیا ہے اور جن کو قافلے والوں کے ہاتھ چند دراہم میں فروخت کر دیا ہے ان کا ایک وقت ایسا بھی آنے والا ہے کہ وہ ان باتوں کو ان کے سامنے بیان فرمائیں گے اور وہ ان کو شروع میں پہچان

بھی نہ سکیں گے۔

بیشتر زمانوں میں مصر کی ایک شان رہی ہے

بہر حال وہ قافلہ حضرت یوسف علیہ السلام کولیکر مصر پہنچا اور اس زمانہ میں مصر کی ایک شان تھی اور بیشتر زمانوں میں مصر کی ایک شان رہی ہے آج بھی اس ملک کی کچھ خصوصیات ہیں ویسے مصر افریقہ کے خطہ میں پڑتا ہے مگر جب عرب حضرات مصر میں پہنچے تو انہوں نے وہاں کا تمدن، تہذیب، حتی کہ لسان تک پر اثر ڈالا چنانچہ وہاں کی ہر چیز عرب بن گئی ورنہ جغرافیائی حیثیت سے مصر سرزمینِ افریقہ میں پڑتا ہے اور افریقہ کے جنگلات مشہور ہیں۔

کنویں میں جانا مقدمہ تھا محلِّ شاہی میں پہنچنے کا

تو خیر حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر لے جایا گیا اور اُس زمانہ میں باندی غلام فروخت ہوتے تھے، حضرت یوسف علیہ السلام ایک بڑی منڈی میں پہنچائے گئے جہاں غلام اور باندیاں بِکتے تھے آپ چاند کا ٹکڑا اور حسن و جمال کا مرقع تھے اور کششیں اور رعنائیاں ہزار جان سے آپ پر نثار تھیں اور حق تعالی کی طرف سے عجیب وغریب جاذبیت آپ پر ڈالدی گئی تھی، خیر دام لگنے شروع ہوئے، مختلف خریدار آئے حتی کہ عزیز مصر جو مصر کا پرائم منسٹر تھا اور عزیزِ مصر اس کا لقب تھا جیسے ہندوستان میں بادشاہ کو راجہ کہتے تھے اور چین کے بادشاہ کو خاقانِ چین کہتے تھے یا فارس کے بادشاہ کو کسرائے فارس کہا جاتا تھا اور روم کے بادشاہ کو قیصر روم کہتے تھے اور مصر کا ایک دور تھا جس میں مصر کے بادشاہ کو فرعون کہا جاتا تھا۔ (عمدۃ القاری ج ا ص ۹۷، تفسیر القرآن العظیم ج ا ص ۹۰) غرض یہ کہ وہ عزیزِ مصر کے نام سے مشہور تھا اور نام اس کا قُطفیر یا اِطفیر تھا اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدا۔

ایک لطیفہ

تو بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قافلے والوں کو بیس درہم میں بیچ دیا اور آپ بیس درہم کو بیس چونی سمجھ لیں یعنی بیس پاؤلی، پاؤلی پہ ایک لطیفہ آپ کو سنا دیں، ہندوستان کی ایک مسجد میں ایک صاحب نے میرے ساتھ فجر کی نماز پڑھی ان کے جیب سے پاؤلی (چار آنہ) گری اور گشت کھا کر سیدھی میرے پاس آئی، اب وہ نماز کے بعد ادھر ادھر ہاتھ مار رہے تھے (چار آنہ کو تلاش کر رہے تھے) تو میں نے وہ پاؤلی انہیں دی اور کہا یہ آپ اپنی پاؤلی لیجئے اور باہر جا کر یہ مت کہنا کہ میری پاؤلی گم ہوگئی، وہ بھی کوئی ظریف الطبع تھے اس پر مسکرائے، (پاؤلی گم ہوجانا ایک محاورہ ہے بہ معنی پاگل ہونا)۔

کوہِ نور اصل میں گوئے نور تھا

بہرحال مصر کی منڈی میں حضرت یوسف علیہ السلام کے مقابلے میں مُشک اور بیش قیمت جواہرات اور ہیرے رکھے گئے اور آپ جانتے ہیں کہ ہیرے کتنے قیمتی ہوتے ہیں ایک ایک ہیرا کئی لاکھ کا ہوتا ہے یہ آپ کے لندن میں جو ہیرا ہے کوہِ نور ہندوستان سے آیا ہوا وہ اصل میں گوئے نور ہوگا گوئے کہتے ہیں گیند کو وہ گیند جتنا ہی بڑا ہے آپ لوگوں نے دیکھا ہوگا اسی لندن شہر میں ہے، تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ کوہِ نور جس بادشاہ کے محل میں تھا اسکے محل میں چراغ نہیں جلایا جاتا تھا کوہِ نور کی چمک سے خود ہی روشنی رہتی تھی، تو بڑے بیش قیمت ہیرے اور جواہرات حضرت یوسف علیہ السلام کے مقابلے میں رکھے گئے، ویسے تاریخ ارض القرآن میں علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اس کی تصریح کی ہے کہ مصر کی پہاڑیوں میں اس زمانہ میں بھی عجیب عجیب عمدہ قسم کے ہیرے ہوتے تھے جیسے آجکل زامبیا کے قریب کونگو مشہور ہے اس میں بڑے ہیرے اور جواہرات ہیں جو اسرائیل کے ماتحت ہے، غرض یہ کہ ہیرے، جواہرات، مُشک اور

اس قسم کی قیمتی چیزیں حضرت یوسف علیہ السلام کے مقابلے میں ترازو میں رکھی گئیں اب آپ اندازہ لگائیے کہ مُشک آج ہندوستان میں سولہ ہزار روپیہ تولہ ہے تو حضرت یوسف علیہ السلام کی قیمت کتنی لگائی گئی ہوگی ویسے جو مُشک اصلی ہوتی ہے وہ آپ ذرا سی لگائیں تو ناک سے خون جاری ہو جائے وہ عجیب وغریب ہوتی ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی محلِّ شاہی میں آمد

غرض یہ کہ بڑی بھاری قیمت میں عزیزِ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدا اور خریدنے کے بعد اپنے محل میں لاکر اپنی اہلیہ جس کا نام زَلیخا یا زُلیخا تھا سپرد کیا، حق تعالیٰ شانہ اسی کا تذکرہ فرما رہے ہیں کہ ”وقال الذی اشتراہ من مصر لامراتہ ،، اور اس شخص نے جس نے مصر میں ان کو خریدا اپنی بیوی سے کہا ”اکرمی مثواہ،، انہیں اچھے طریقے سے رکھئے، توقیر کا معاملہ کیجئے اور یوں نہ سمجھے کہ یہ غلام ہے لہذا توہین کا معاملہ کیا جائے، اس نے اکرام کا لفظ استعمال کیا ہے اب آپ دیکھئے کہ وہاں سے نکلے تھے تو اہانت کی شکل تھی مگر قربان جایئے اللہ تعالیٰ کی شان کے کہ معمولی داموں میں بِکنے والے اور کنویں میں رہنے والے کو محلِّ شاہی میں پہنچا دیا اور ساتھ ہی عزیزِ مصر اپنی بیوی کو تاکید کرتا ہے کہ ان کے ساتھ اکرام کا معاملہ کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کی شان دیکھئے چونکہ آگے چل کر اُن کو بلند مقامات ملنے والے تھے اس لئے ان کا محلِّ شاہی میں پہنچنا بہت مناسب تھا اس لئے کہ انہیں مستقبل میں ملکِ مصر کی خدمات انجام دینی تھیں اور سارا نظامِ مملکت سنبھالنا تھا اس لئے شاہی گھرانے میں ان کی تربیت کا انتظام کیا گیا تا کہ ان کا ذہن بنے اور سارے نشیب وفراز سمجھنے کا موقع ملے اور ایک خاص قسم کی صلاحیت پیدا ہو اور تجربات کی روشنی میں انہیں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے، پھر یہ کہ بڑوں کے ساتھ اور نعمتوں میں رہنے کی وجہ سے آپ میں ایک قسم کی سیر چشمی کی کیفیت پیدا ہو اس لئے آپ نعمتوں میں

رکھے گئے توقیر کے ساتھ رکھے گئے، محلِّ شاہی میں رکھے گئے تاکہ تجربات عزت و شوکت اور سیر چشمی وغیرہ صفات اور خدا جانے کتنے فوائد آپ کے ہاتھ آئیں، تو یہ تمہید تھی حق تعالی نے اسکے ذریعہ محلِّ شاہی میں انہیں پہنچادیا، دوسرے یہ کہ بڑوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ان کے اثرات بھی آتے ہیں۔ اسی کو حق تعالی فرماتے ہیں ''وکذلک مکنا لیوسف فی الارض ،، اسی طریقہ سے ہم نے یوسف کو زمینِ مصر میں تمکین دی تمکین کا مفہوم ہے کسی کو ٹھکانے پر جمادینا گویا حضرت یوسف علیہ السلام کو ہم نے ملکِ مصر میں ٹھکانہ دیا اور وہاں انہیں جمادیا اللہ تعالی کی قدرت دیکھئے حضرت یوسف علیہ السلام پر کیسے حادثات پیش آئیں مگر وہ سب تمہیدیں تھیں ان کے ذریعہ حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے محلِّ شاہی میں پہنچے۔

کلمة حق ارید بها الباطل

پھر حق تعالی نے علم کا تذکرہ کیا ''ولنعلمه من تاویل الاحادیث،، تاکہ ہم انہیں خواب کی تعبیر کا علم سکھائیں، معلوم ہوا کہ علم کے بغیر چھٹکارا نہیں ہے، ایک اصلاحی جملہ سن لیں جو بڑے کام کا ہے ایک غلط بات چل پڑی ہے جس میں بڑے بڑے سمجھدار لوگ بھی مبتلا ہیں آپ نے ایک جملہ یہ سنا ہوگا کہ ''اصل چیز عمل ہے زیادہ پڑھ کر کیا کریں گے،، یہ جملہ ''کلمة حق ارید بها الباطل ،، کا مصداق ہے اس کا منشا بظاہر یہ ہے کہ عمل مقصود ہے ''سبحان اللہ،، یہ بہت اچھی بات ہے مگر اس جملہ کا دوسرا مطلب بعض لوگ یہ بھی لیتے ہیں کہ علم کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی حاجت نہیں ہے قلیل علم کافی ہے اس کا اصل منشا یہی ہے اور نفس کا چور اس میں چھپا ہوا ہے، اگر یہی مقصود ہوتا تو جناب نبی کریم ﷺ کو حق تعالی یوں نہ فرماتے کہ ''وقل رب زدنی علما،، (سورۂ طٰہٰ آیت نمبر ۱۱۴) آپ یہ دعا کیجئے کہ اے میرے رب! میرے علم کو بڑھائیے میرے علم کو زیادہ کیجئے،

تو ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کا علم صرف ''تعلیم الاسلام''، یا ''بہشتی زیور''، تک محدود نہیں تھا، آپ ﷺ فرماتے ہیں اولین وآخرین کا علم مجھے دیا گیا اور اسکے بعد بھی حق تعالی شانہ کی طرف سے یہ ارشاد ہورہا ہے کہ آپ یوں دعا کیجئے کہ اے میرے رب! میرے علم کو بڑھائیے تو عام طور پر اس جملہ میں نفس کا چور یہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنی جہالت پر قناعت کرنے کے لئے اور اپنی جہالت پر پردہ ڈالنے کے لئے اس جملہ کو استعمال کرتے ہیں کہ اصل چیز عمل ہے، علم کی ضرورت نہیں۔

علم کی کثرت معرفتِ خداوندی کا ذریعہ بنتی ہے

عمل کی اہمیت سے انکار نہیں ہے مگر علم کی کثرت بھی مطلوب ہے اس لئے کہ علم کی کثرت معرفتِ خداوندی کا ذریعہ بنتی ہے ورنہ آپ دیکھ لیجئے کہ ایک بچہ جو مکتب میں پڑھتا ہے وہ جانتا ہے اللہ تعالی ایک ہے اور رسول برحق ہے گویا وہ توحید ورسالت کا عقیدہ رکھتا ہے اور ایک شخص بڑے مدرسہ میں توحید ورسالت کا عقیدہ پڑھتا ہے اور اسکی پشت پر عقلی اور نقلی دلائل قائم ہیں ان کو بھی پڑھتا ہے اسکی وجہ سے اسکو اس عقیدہ پر بصیرت حاصل ہوگی ظاہر بات ہے کہ اس مبتدی کو وہ بصیرت حاصل نہیں ہوگی اس سے معلوم ہوا کہ معرفت بڑی بڑی کتابیں پڑھنے کے بعد حاصل ہوگی، غرض یہ کہ علم کی زیادتی معرفتِ خداوندی کا ذریعہ اور سبب بنتی ہے اور اگر علم ناقابل توجہ چیز ہوتی تو نبی کریم ﷺ سے یہ نہ کہا جاتا کہ آپ یہ دعا فرمائیے کہ اے میرے رب! میرے علم میں زیادتی فرمائیے، جب حضور ﷺ جیسی ذاتِ عالی کو حق تعالی یہ فرمارہے ہیں کہ آپ علم میں زیادتی کی دعا کیجئے تو ہم اور آپ لوگ کس شمار میں ہیں؟ بہر حال جو لوگ اس جملہ سے کمئ علم پر قناعت پر استدلال کرتے ہیں وہ درست نہیں بظاہر عنوان تو اچھا ہے مگر اندر ان کے نفس کا چور چھپا ہوا ہے جس میں ابلیس کا دخل بھی موجود ہے لہذا ایسے سارے بھولے

بھالے لوگوں کو اس ملفوظ کے باب میں غور فرمانا چاہئے اور اپنی اس رائے پر نظر ثانی کرنا چاہئے اس لئے کہ قرآن وسنت سے علم کی زیادتی بھی مطلوب معلوم ہوتی ہے کیونکہ علم معرفتِ خداوندی کا باعث ہے۔

اگر علم کی یہ زیادتی مطلوب نہ ہوتی تو بغداد کے وہ کتب خانے جو ایک ہی شہر میں تقریباً تیس ہزار تھے اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ فضول تھے؟۔

صحابہ سب کچھ کرنے کے باوجود بھی علم سے غافل نہیں تھے

یا صحابہ کی وہ محنتیں کہ جن کے باب میں حضرت حسن بصریؒ فرماتے تھے کہ تم ان کو دیکھ لو تو تم ان کو پاگل ومجنون سمجھو (خطبات احتشام الحق ج۱ص ۵۸) تو جب صحابہ کرام اپنی اس کیفیت اور اتنی ساری دھن کے باوجود علم سے غافل نہیں تھے حدیثوں کا حفظ کرنا ان کا مشغلہ تھا، مسائل سمجھنا ان کا مشغلہ تھا، دین سمجھنا ان کا مشغلہ تھا اور اسکے ساتھ جہاد اور دعوت کا کام بھی وہ کرتے تھے، تو کہنے کا منشا یہ ہے کہ علم بڑی بصیرت کی چیز ہے اور اس سے بیشمار فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

علم بہت بڑی اور لازوال دولت ہے

اور اگر علم نہیں ہے تو ظاہر بات ہے کہ پھر آدمی جاہل ہے اسی لئے قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ ''یعلم ما بین ایدیهم وما خلفهم ولا یحیطون بشئی من علمه الا بما شاء وسع کرسیه السموات والارض ،،(سورۂ بقرۃ آیت نمبر ۲۵۵) اللہ تعالی نے اولاً علم کا تذکرہ فرمایا اور اسکے بعد کرسی کا تذکرہ فرمایا دنیا میں تو پہلے اسٹیج بنایا جاتا ہے اور اسکے اوپر کرسی رکھی جاتی ہے مگر حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے وہاں کرسی نیچے ہے اور تخت یعنی اسٹیج اوپر ہے معلوم ہوا کہ وہ کرسی کسی اور شان کی ہے اور اللہ تعالی کے عرش کی بھی کچھ اور شان ہے، ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ ''سدرة المنتهى ،، جو ساتویں آسمان پر ہے اسکی شاخیں

اتنی پھیلی ہیں کہ وہ کرسی کے پایوں سے لپٹی ہوئی ہیں خدا جانے اسکی کیا شکل ہوگی خدا تعالی اپنے فضل سے ہم سب کو زیارت نصیب فرمائیں، تو غرض یہ کہ علم بہت بڑی اور لازوال دولت ہے۔

علم ہر قوم کے ارتقاء کا سبب ہے

جب ہندوستان میں کچھ بن بلائے مہمان تشریف لائے تھے تو برائے نام کالج اور یونیورسٹیاں تھیں اس لئے انہوں نے بہت آسانی سے ہندوستان کو غلام بنالیا۔ اور انہوں نے اولاً بالقصد ہندوستانیوں کو جاہل رکھنے کی کوشش کی اس لئے کہ وہ یہ جانتے تھے کہ اگر قوم میں علم آئے گا تو غلام نہیں رہ سکے گی بلکہ انہیں آزادی اور ترقی کی سوجھے گی اور پھر یہی ہوا۔ بہر حال جب علم کسی قوم میں آتا ہے تو وہ اس کے ارتقاء کا سبب بنتا ہے اور جب علم نہیں ہوتا تو جہالت کے سبب انحطاط در انحطاط ہوتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو علم لطیف اور مقام لطیف

اللہ تعالی کا ارشاد ہے "ولنعلمہ من تاویل الاحادیث"، اور تاکہ ہم ان کو تاویل احادیث سکھلائیں اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالی حضرت یوسف علیہ السلام کو ایک لطیف علم دینا چاہتے تھے اس لئے اللہ تعالی نے انہیں مقام لطیف میں پہنچا دیا کہ محلِّ شاہی کی فضا ویسے بھی صاف شفاف ہوتی ہے اور وہاں کی غذائیں نہایت عالی اور ماحول پاکیزہ ہوتا ہے پھر حضرت یوسف علیہ السلام کسی سے خلط ملط بھی نہیں رکھتے تھے۔

حضرت شیخ الحدیثؒ کی کہانی خود ان کی زبانی

جب حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ اپنی طالب علمی کے زمانہ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے پاس جاتے تھے تو راستے کے درمیان بھی حضرت مولانا یحیی صاحبؒ کی طرف سے ان کی نگرانی کا نظم تھا اور خود حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ

فرماتے تھے کہ میری تربیت اور نگرانی میرے والد ماجد نے ایسے کی ہے کہ کنواری لڑکی کی تربیت اور نگرانی کوئی کیا کرے گا (سبق آموز بیانات ص ۲۸) جب نگرانی اور حفاظت کی اتنی شکلیں ہوتی ہیں تب جا کے عموماً ایسے با کمال لوگ پیدا ہوتے ہیں، الا ماشاء الله.

حق تعالیٰ اپنے امر پر غالب ہیں۔ مغلوب نہیں

تو کہنے کا منشا یہ ہے کہ یہ خدائی نظام ہے کہ کس شان کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام کو عزیز مصر کے محل میں پہنچایا تو اللہ تعالیٰ حضرت یوسف علیہ السلام کے باب میں فرما رہے ہیں کہ ہم نے ملکِ مصر میں ان کو ٹھکانہ دیا اور ہم نے ان کو تعبیر رؤیا اور دقیق باتوں کا علم سکھلایا یہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہوا، پھر حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنے امر پر غالب ہیں۔ حق تعالیٰ مغلوب نہیں ہیں۔

ایک علمی اشکال کا آسان حل

ایک ہے غالب ہونا ایک ہے مغلوب ہونا جیسے حق تعالیٰ محجوب نہیں ہیں اور مخلوق تو محجوب ہوتی ہے اسی لئے فرمایا ''کلا انهم عن ربهم يومئذ لمحجبون ''، (سورۂ مطففین آیت نمبر ۱۵) قیامت میں کافرین اپنے رب سے حجاب اور پارٹیشن میں ہوں گے انہیں حق تعالیٰ کا دیدار نصیب نہیں ہوگا، تو مخلوق کی صفت محجوب ہونا ہے حق تعالیٰ کی صفت اس طریقہ پر خاص کر نہیں ہے اور اگر مسلم شریف کی حدیث میں حق تعالیٰ کے لئے حجاب کا تذکرہ ہے تو وہاں بھی فرمایا گیا ''حجابه نور ''، حق تعالیٰ کا حجاب نور ہے اسکی ایک خاص شان ہے اس میں اس طرح مغلوبیت کی جہت نہیں ہے وہ اسکی صفتِ عالیہ کا اثر ہے۔

ایک دفعہ سبق میں یہ بات آئی تو سوال پیدا ہوا کہ نور کی وجہ سے کیسے حجاب ہوگا؟ نور کی وجہ سے تو چیزیں نظر آتی ہیں، اسی لئے ایک عالم سے کسی نے پوچھا کہ

شیاطین ہم کو دیکھتے ہیں ہم شیاطین کو نہیں دیکھتے اسکی وجہ کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ دیکھو جو اندھیرے میں کھڑا ہو کر اُجالے والے کو (روشنی میں کھڑے آدمی کو) دیکھے گا تو وہ انہیں دیکھ لے گا اور اجالے (روشنی) میں کھڑا ہونے والا اندھیرے میں کھڑے ہونے والے کو دیکھنا چاہے تو نہیں دیکھ سکتا، تو شیاطین اندھیرے میں ہیں اور ہم لوگ اجالے (روشنی) میں ہیں اس لئے وہ ہم کو دیکھ سکتے ہیں اور ہم ان کو نہیں دیکھ سکتے، بہر حال یہ سوال پیدا ہوا کہ نور کی وجہ سے کیسے حجاب ہوگا؟ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ایک بات ذہن میں ڈالی اس کا حاصل یہ تھا میں نے طلبہ سے کہا دیکھو! یہ کتاب میرے سامنے رکھی ہے اور اس وقت فرض کرو کہ میرے سامنے مثلاً سو واٹیج کا ایک بلب ہے اور اسکی روشنی میں کتاب کے حروف نظر آ رہے ہیں مگر اسی کی جگہ ایک لاکھ واٹیج کا بلب لگا دیا جائے تو یہ حروف نظر نہیں آئیں گے، اب آپ سے کوئی پوچھے کہ یہ حروف نظر کیوں نہیں آ رہے ہیں ابھی تو وہ نظر آ رہے تھے، تو آپ یہی کہیں گے حجابی شکل ہوگئی روشنی کی تیزی اور نور کی شدت سے نگاہیں خیرہ ہیں یعنی نور کی تیزی کی وجہ سے نگاہیں کام نہیں کرتیں تو یہاں پر بھی جو آڑ اور پارٹیشن ہوا وہ درحقیقت شِدّتِ نور ہے اسی لئے حدیث شریف میں اس کے بعد شِدّتِ نور کا بھی تذکرہ ہے کہ اگر وہ حجابات ہٹا دیئے جائیں تو حدِّ نظر تک ساری چیزیں جل کر خاکستر ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی نظر کی کوئی حد نہیں تو گویا ساری مخلوق کا کام تمام ہو جائے کوئی حق تعالیٰ کے نور کی شدت کو برداشت ہی نہیں کر سکتا۔

حق تعالیٰ کے سارے معاملات حکمت پر مبنی ہیں مغلوبیت پر نہیں

تو غرض یہ کہ حق تعالیٰ اپنے معاملات میں غالب ہیں یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کچھ چلی نہیں اس لئے اسکے مقبول بندے یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈال دیا، دنیا میں تو یہ

ہوتا ہے کہ بعض دفعہ بادشاہ بھی پھنس جاتے ہیں اور ان کی کچھ چلتی نہیں، ہزار ہزار انتظامات کے بعد بھی دنیا میں مغلوبیت کی شکلیں پیش آتی ہیں مگر حق تعالی کے سارے معاملات حکمت پر مبنی ہیں مغلوبیت پر نہیں، اللہ تعالی اپنے امر پر غالب ہیں کہ حق تعالی جب چاہیں بندے کی ضرورت کے مطابق اس کی تربیت کے لئے کوئی سا حال اس پر طاری کردیں ''ولکن اکثر الناس لا یعلمون،، مگر انسانوں کی اکثریت اس بات کو نہیں جانتی۔

جمہوریت ڈاکٹر اقبالؒ کی نظر میں

اس سے ایک مسئلہ یہ بھی نکلا کہ کثرتِ رائے کی بنیاد پر فیصلہ رکھنا صحیح نہیں ہے جیسے جمہوریت میں ہوتا ہے، ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے کہ ؎

جمہوریت وہ طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
رایوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

جیسے مثلاً واٹنگ ہوئی اور اس میں ایک ہزار عقلمند ایک طرف اور دس ہزار عقل کے باردان (بے وقوف) دوسری طرف ہیں تو یہ کامیاب سمجھے جائیں گے، تو جمہوریت میں سر گنے جاتے ہیں سر کے اندر جو گودا ہے اس سے بحث نہیں ہوتی۔

جوہر مختصر ہوتا ہے

اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا کہ ''ولکن اکثرھم یجھلون،، اور انسانوں کی اکثریت جاہل ہیں اور کہیں فرمایا کہ 'قلیلا ما تذکرون ،معلوم ہوا غافل زیادہ ہیں اور کہیں فرمایا 'قلیلا ما تشکرون،، معلوم ہوا کہ ناشکرے زیادہ ہیں، تو جاہل زیادہ، کافر زیادہ، ناشکرے زیادہ، غافل زیادہ تو کہنے کا منشا یہ ہے کہ جوہر مختصر اور کم ہوتا ہے۔

اللہ تعالی کی رحمت سے مایوس نہ ہو

توحق تعالی نے فرمایا کہ انسانوں کی اکثریت اِن حقیقتوں کونہیں سمجھتی ہے کہ اللہ تعالی اپنے امر پر غالب ہیں اس سے ایک سبق یہ بھی ملا کہ اگر آدمی کسی پریشانی میں مبتلا ہواس پرکوئی مصیبت آجائے اور ایسی مصیبت جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کنویں میں ڈالے گئے اور بظاہر نکلنے کی کوئی شکل نہیں تب بھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، حضرتِ حق سے آدمی دعا کرے اور اسکی رحمت سے مایوس نہ ہوتو حق تعالی اس سے بھی نکلنے کی شکل پیدا فرمادیں گے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے پیدا فرمائی۔

دوسروں پر ظلم وستم ٹھیک نہیں ہے اس لئے کہ.....................

اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ جب حق تعالی غالب ہیں تو اپنے کسی اعلی حال اور کمال پر بھی اکڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ آدمی اپنے آپ کو غالب سمجھ کر دوسروں سے اپنی بات منوانے لگے اور دوسروں پر ظلم وستم کرنے لگے یہ ٹھیک نہیں ہے اس لئے کہ ’’واللہ غالب علی امرہ ،،اسی لئے قرآن کریم میں میاں بیوی کے مسئلہ سے متعلق ایک مقام پر فرمایا ’واللہ علی کل شئی قدیر ،،اس سے سبق یہ دینا ہے کہ اگر شوہر آج بیوی پر ظلم وزیادتی کرتا ہے اور اپنے پاور کو غلط استعمال کرتا ہے تو حق تعالی قادر ہیں اگر وہ اپنی قدرت شوہر کے خلاف استعمال کریں گے تو اس کی تو آبنے گی وہ تو ایک رکعت کا بھی نہیں ہوگا۔

تم تو ایک رکعت کا بھی نہیں ہو

جیسے ایک خاں صاحب تھے انہوں نے کچھ بکریاں پالی تھیں پہلے نماز کی طرف سے ان میں غفلت تھی پھر نمازی ہو گئے اب جب نماز پڑھنا شروع کی تو ایک بکری مرگئی دوسری مرگئی تیسری مرگئی غرض یہ کہ جتنی بکریاں تھیں وہ سب مرگئیں وہ سمجھتے تھے کہ نماز

سے بکریاں مر رہی ہیں، ایک روز کھانے بیٹھے تھے کہ بکری کا چھوٹا بچہ اُچھل کود کرنے لگا تو خاں صاحب نے خفا ہوکر کہا کہ تو تو ایک رکعت کا بھی نہیں ہے جب ہماری نماز سے بڑی بڑی بکریاں ختم ہوگئی تو تیری کیا حیثیت ہے تو تو ایک رکعت کا بھی نہیں ہے۔

حق تعالی کی قدرت کے سامنے نمک کی ڈلی اور عرش اعظم برابر ہے

تو خیر بندوں کی اللہ تعالی کی قدرت کے سامنے کیا حیثیت ہے۔علماء تو لکھتے ہیں نمک کی ڈلی اور عرش اعظم حق تعالی کی قدرت کے سامنے برابر ہیں اسکی قدرت بے نہایت ہے اس سے کوئی سوال بھی نہیں کرسکتا، وہ جو چاہے کرے۔

انسان کو سنت اللہ کی معرفت ہونا چاہئے

تو بہر حال اس میں بڑا سبق ہے اور اللہ تعالی کے جتنے معاملات ہیں وہ عباد کے ساتھ ہیں ان کو سمجھنا چاہئے اسی لئے ہر آدمی کو سوچنا چاہئے کہ میرے ساتھ خدائی معاملہ کیا ہے، دیکھئے! خدا تعالی کا نظام یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالی آکر کھڑے ہو جائیں اور کہیں کہ بھئی دیکھو ہم نے تمہارے بارے میں یہ نظام بنایا ہے، یہ نہیں ہوگا، ارباب تفسیر لکھتے ہیں کہ انسان کو سنت اللہ کی معرفت ہونا چاہئے کہ اللہ تعالی کی سنت پچھلی قوموں کے باب میں کیا رہی ہے اور ان کے ساتھ حق تعالی کا کیا معاملہ رہا اور ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ گناہوں کے باوجود اگر کسی پر روزی کی فراوانی ہو تو یہ بہت زیادہ ڈرنے اور خطرے کی بات ہے اس لئے کہ قرآن کریم میں ہے ''حتی اذا فرحوا بما اوتوا اخذنهم بغتة، (انعام،۴۴) وہ نافرمانی کرتے رہے یہاں تک کہ جب ادھر سے نعمتیں ملتی رہیں اور وہ ان پر خوش ہوئے تو اچانک ہم نے ان کو پکڑ لیا، غرض یہ کہ اس آیت میں بڑی عبرت اور بڑا سبق ہے، تو حق تعالی فرماتے ہیں 'والله غالب علی امره، ، اللہ تعالی اپنے امر پر غالب ہے لیکن انسانوں کی اکثریت '' بے دال کی بُودم،، اور بُزِ اخفش ہے ان کی نظر

بالکل سطحی ہے وہ اس کو نہیں سمجھتے۔

نگاہیں دو قسم کی ہوتی ہیں

تو بات اس پہ چلی تھی کہ کچھ نگاہیں وہ ہیں جو واقعہ کو واقعہ کی حیثیت سے دیکھتی ہیں اور بس اور بعض وہ ہیں کہ جو اسکے مَناشی اور نَواشی کو بھی دیکھتی ہیں یعنی ابتداء میں کیا اسباب اور وجہیں تھیں اور بعد میں اس کا کیا نتیجہ ہوگا اُن ساری چیزوں کو وہ سوچتی ہیں اور اُس سے سبق حاصل کرتی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی صحیح فکر نصیب فرمائیں اور علم کا صحیح جذبہ عطا فرمائیں۔

علم قدر کی چیز ہے

قرآن وحدیث کا علم ایسا نہیں ہے کہ دو چار آیتیں، دو چار حدیثیں اور دو چار مسائل سمجھ لئے اور سمجھ لیا کہ بس کافی ہے علم حاصل ہوگیا اگر ایسا ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ دوسری سب باتیں اللہ تعالیٰ نے فضول بیان فرمائیں حالانکہ ہر چیز انسان کی ضرورت کی ہے اور قرآنِ کریم تو علم وحکمت کا سمندر ہے اس لئے اسکی بڑی قدر کرنے کی ضرورت ہے اللہ پاک ہمیں قرآن وحدیث کے علم کی قدر نصیب فرمائیں اسکی عظمت کی توفیق عطا فرمائیں اور اسکے تقاضوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔آمین۔

۞۞۞۞۞

درس نمبر بیس سے حاصل ہونے والی ۱۱۱ اہم ہدایات

(۱) بعض مرتبہ انسان کو جو حالات پیش آتے ہیں وہ اپنے ظاہر اور اپنی صورت سے تو ناگوار معلوم ہوتے ہیں مگر ان کے بعد جو آثار اور نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ مستحسن ہوتے ہیں بلکہ انہی کی غرض سے وہ حالات پیش آتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ اسکی عکاّسی کرتا ہے۔

(۲)حق تعالیٰ کا ایک نظام بندوں کے ساتھ صَرف کا ہے۔

(۳)بڑوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ان کے اثرات بھی آدمی میں آتے ہیں۔

(۴)عمل کی اہمیت سے انکار نہیں ہے مگر علم کی کثرت بھی مطلوب ہے اس لئے کہ علم کی کثرت معرفتِ خداوندی کا ذریعہ ہے۔

(۵)علم جب کسی قوم میں آتا ہے تو وہ ارتقاء کا سبب بنتا ہے۔

(۶)حق تعالیٰ کے سارے معاملات حکمت پر مبنی ہے مغلوبیت پر نہیں۔

(۷) کثرتِ رائے پر فیصلہ کی بنیاد رکھنا صحیح نہیں ہے۔

(۸) اگر آدمی کسی پریشانی میں مبتلا ہو اور اس پر کوئی مصیبت آجائے اور اس سے بظاہر نکلنے کی کوئی شکل نہ ہو تب بھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے حضرتِ حق سے آدمی دعا کرے اور اسکی رحمت سے مایوس نہ ہو تو حق تعالیٰ اس کے لئے بھی اس سے نکلنے کی شکل پیدا فرما دیں گے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے پیدا فرمائی۔

(۹)حق تعالیٰ غالب ہیں اور جب حق تعالیٰ غالب ہیں تو اپنے کسی کمال اور اعلیٰ حال پر بھی اکڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ آدمی اپنے آپ کو غالب سمجھ کر دوسروں سے اپنی بات منوانے لگے اور دوسروں پر ظلم وستم کرنے لگے۔

(۱۰) انسان کو سنت اللہ کی معرفت ہونا چاہئے یعنی وہ یہ جانے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت پچھلی قوموں کے باب میں کیا رہی ہے اور ان کے ساتھ کیا معاملہ رہا ہے۔

(۱۱) گناہوں کے باوجود اگر روزی کی فراوانی ہو تو یہ بہت زیادہ ڈرنے اور خطرے کی بات ہے کیوں کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ”حتی اذا فرحوا بما اوتوا اخذنھم بغتة،، وہ نافرمانی کرتے رہے یہاں تک کہ جب ادھر سے نعمتیں ملنا شروع ہوئیں اور وہ ان پر خوش ہوئے تو اچانک اللہ تعالیٰ نے ان کو پکڑ لیا۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

درس نمبر (۲۱)

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم، امابعد!

فاعوذ بالله من الشیطن الرجیم ، بسم الله الرحمن الرحیم☆ و استبقا الباب و قد ت قمیصه من دبر و الفیا سیدها لدا الباب قالت ماجزاء من اراد باهلک سوء اًالا ان یسجن او عذاب الیم☆قال هی راودتنی عن نفسی و شهد شاهد من اهلها ان کان قمیصه قد من قبل فصدقت وهو من الکذبین ☆ وان کان قمیصه قد من دبر فکذبت وهو من الصدقین ☆ فلما راٰ قمیصه قد من دبر قال انه من کیدکن ان کیدکن عظیم☆یوسف اعرض عن هذا و استغفری لذنبک انک کنت من الخطئین(یوسف،آیت:۲۵/۲۹) ☆ **صدق الله العظیم**

معصیت کی جگہوں سے بھی بچیں

محترم حضرات! گفتگو یہ چل رہی تھی کہ آدمی ان مواقع سے اوران جگہوں سے بچے جہاں اسے گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہواس لئے کہ انسان کی طبیعت میں فطری طور پرخواہشات بھی موجود ہے پھرنفس کا اپنا ایک کام ہے، پھر شیطان کی کوششیں اور کاوشیں اپنے مقام پر ہیں اس لئے ان وجوہ سے انسان کوان تمام مواقع سے بچنے کی ضرورت ہے جہاں پر مبتلائے معصیت ہونے کا اندیشہ ہو، گناہ میں پھنس جانے کا خطرہ ہو، یہاں بھی یہی شکل ہوئی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو زلیخا نے اپنی طرف مائل کرنے کی بے حدکوشش کرلی اوروہ ناکام ہی رہی اورصورت یہ پیش آئی کہ آپ آگے آگے تھےاورزلیخا پیچھے تھی اورہوایہ کہ زلیخانے ان کے دامن کا پچھلا کپڑا کھینچا آپ تیزی سے بھاگ رہے تھے اور دروازہ پر پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ عزیزِ مصر(زلیخا کے شوہر)موجود ہیں اب آپ اندازہ لگایئے کہ یہ موقع کتنا نازک تھا اوراس میں بھی اللہ

تعالیٰ کا ایک خاص کرم ہوا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی غیبی طور پر تائید ہوئی کہ عزیز کو غصہ نہیں آیا وہ مشتعل نہیں ہوا، ورنہ ایسے موقعہ پر آدمی اپنے ضبط کو کھو دیتا ہے اور قوتِ غصبیہ اس پر غالب آجاتی ہے، بعض دفعہ زبان چلانے لگتا ہے اور زیادہ غیرتمند ہو تو ہاتھ بھی اٹھ جاتا ہے اور معاملہ کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے، عزیزِ مصر میں یہ اشتعال کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کی نصرت تھی، اس موقعہ پر زلیخا نے جو بات کہی وہ بڑی عجیب تھی اس نے اپنی پوزیشن کا ڈیفنس (دفاع) کرنے کیلئے کہا کہ اس شخص کی کیا سزا ہو جو آپ کے اہل کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہو، گویا زلیخا اپنے شوہر سے یہ کہنا چاہتی تھی کہ یہ معاملہ جو وجود میں آیا ہے یہ ان کے ناپاک ارادہ کا اثر ہے اور اس کی سزا یہ ہے کہ انہیں سخت سزا دی جائے یا انہیں قید خانہ میں ڈالدیا جائے، زلیخا نے یہ بات اپنی پوزیشن کو بچانے کیلئے کہی، اب آپ اندازہ لگایئے کہ ادھر تو کیفیت یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اسی گھر کے پروردہ اور اسی گھر کے پلے ہوئے ہیں عزیزِ مصر نے ان کو خریدا تھا اور شاہی محل میں ناز ونعم اور بڑی توقیر کے ساتھ ان کو رکھا تھا اور خود آپ زلیخا کے زیرِ احسان رہے تھے، پھر یہ ایسا نازک موڑ اور پھر اس پر مزید یہ کہ زلیخا یہ بات کہہ رہی ہے کہ ان کا ارادہ ناپاک تھا اس موقعہ پر حضرت یوسف علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ''ھی راودتنی عن نفسی'' یعنی ان کی یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ انہوں نے خود مجھے پھسلانے کی ناکام کوشش کی ہے۔

جان کی طرح آبرو کی حفاظت بھی ضروری ہے

اس سے ایک مسئلہ یہ بھی نکلا کہ کبھی ایسا موقع آجائے جس سے انسان کی آبرو پر آنچ آنے والی ہو اور اس میں وہ واقعۃً قصور وار نہ ہو تو جو صحیح بات ہے اس کا اظہار ضروری ہے اس لئے کہ جس طرح اپنی جان کی حفاظت ضروری ہے اسی طرح اپنی آبرو کی

حفاظت بھی ضروری ہے، اس موقعہ پر اگر حضرت یوسف علیہ السلام سکوت اختیار کرتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ زلیخا نے جو الزام ان کے سر دھرا ہے اسے وہ تسلیم کرتے ہیں حالانکہ آگے چل کر حق تعالیٰ ان سے پیغمبری کا کام لینے والے ہیں، نظامِ مملکت کا کام لینے والے ہیں، مستقبل میں ان سے بڑی بڑی خدمات متعلق ہونے والی ہیں ظاہر ہے کہ اگر وہ اس موقعہ پر سکوت اختیار کرتے تو ان کی عزت پر زد پڑتی اس لئے حضرت یوسف علیہ السلام نے اصل صورتِ حال اور اپنی حقیقت وصداقت ظاہر کرنے کیلئے فرمایا ''ھی راودتنی عن نفسی ''اسی عورت نے مجھے بہلایا پھسلایا اور اسی نے کہا کہ میرے ساتھ غلط کاری کرو، حضرت یوسف علیہ السلام موقع کی نزاکت کو سمجھتے تھے کہ آپ عورت کے بھی زیرِ احسان رہے ہیں پھر ایک وقت تک اس کے ساتھ تنہائی کی شکل بھی رہی ہے ایسی حالت میں یہ بات کہنا کوئی معمولی بات نہیں تھی، بہر حال حضرت یوسف علیہ السلام آگے اور زلیخا پیچھے تھی۔

ایک بچہ کی معقول گواہی

پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کی براءت کیلئے بطورِ کرامت ایک شکل ظاہر ہوئی اور نبوت مل جانے کے بعد حق تعالیٰ کی طرف سے جو عجائب ظاہر ہوتے ہیں وہ معجزات کہلاتے ہے نبوت ایک دعویٰ ہے اور ہر دعویٰ کیلئے ایک دلیل اور پروف ہوتا ہے، تو نبی کو حق تعالیٰ جو معجزات دیتے ہیں وہ اس کی نبوت کے دلائل ہوتے ہیں تاکہ ان کا دعوی ثابت ہو جائے، تو غرض یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ عجیب معاملہ پیش آیا اور اللہ تعالی کی طرف سے نصرت کی ایک شکل ظاہر ہوئی، قرآنِ کریم میں فرمایا گیا ''وشھد شاھد من اھلھا '' روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک دودھ پیتا چھوٹا سا بچہ تھا جو گہوارے کے اندر موجود تھا اس نے اس سلسلہ میں گواہی دی

اور ایسی عاقلانہ گواہی دی کہ اس سے حضرت یوسف علیہ السلام کی صداقت واضح ہوئی، اس نے یہ بات کہی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کرتہ کو دیکھا جائے اگر وہ آگے کی طرف سے پھٹا ہو تو اس صورت میں عورت سچی ہے اور یوسف جھوٹے ہیں اور اگر کرتہ پیچھے سے پھٹا ہو تو اس صورت میں یہ ثابت ہوگا کہ یوسفؑ بھاگ رہے تھے اور زلیخا ان کو پیچھے سے پکڑ رہی تھی اور واقعہ یہ ہے کہ اگر آمنے سامنے ہونے کی شکل میں بھی ہاتھا پائی کی نوبت آتی تب بھی امکان تھا اس بات کا کہ یوسفؑ سچے ہو، مگر اس احتمال کو ختم کرنے کے لئے اس بچہ نے بے داغ بات کہی کہ اگر کرتہ آگے سے پھٹا ہے تو یوسف علیہ السلام خاطی ہیں اور اگر پیچھے سے پھٹا ہے تو عورت خاطی ہے پھر جب واقعاتی دنیا میں اس کا مشاہدہ کیا گیا تو کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا تھا اس سے عزیز مصر نے یہ سمجھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام سچے ہیں اور یہاں بھی عجیب بات یہ ہوئی کہ چھوٹا سا ننھا منا بچہ اور فیصلہ اس کا اس قدر عادلانہ اور حکیمانہ یہ سب حق تعالیٰ کی طرف سے نصرت کی ایک شکل تھی ورنہ اس عمر میں اس طریقہ سے کلام عادۃً نہیں ہوتا۔

دو اور بچوں کا گہوارے میں کلام کرنا

ویسے مستدرک حاکم کی روایت میں آپ ﷺ کا ارشاد آیا ہے کہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی بچے ہیں جنہوں نے بچپن میں کلام فرمایا ہے جیسے بنی اسرائیل میں جریج ایک بزرگ گذرے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے مطیع و فرمانبردار بندے تھے اور ایک جگہ عبادت خانہ میں ٹھہرے تھے دنیا ان کو مانتی تھی ان کی تکریم کرتی تھی، کسی کو حسد پیدا ہوا تو اس نے یہ چاہا کہ کسی طریقہ سے ان کو ذلیل ورسوا کیا جائے، چنانچہ ایک آزاد قسم کی عورت تھی اس نے اس کو تیار کیا اس عورت نے ایک چرواہے کے ساتھ بدکاری کی جس سے اس کو بچہ پیدا ہوا اس نے بچہ کو لاکر جریج کے عبادت خانہ کے پاس رکھ دیا اور لوگوں کو خبر دی کہ یہ جو

عبادت کرنے والے بزرگ ہیں اور جو متقی بنے ہوئے ہیں ان کی یہ حرکت ہے انہوں نے میرے ساتھ منہ کالا کیا تھا جس سے میں حاملہ ہوئی اور آج اس سے یہ بچہ پیدا ہوا ہے جو تمہارے سامنے موجود ہے، جب لوگوں نے یہ دیکھا تو انہوں نے ان کے عبادت خانہ کو ڈھادیا، لوگوں میں غصہ تھا قوم غصہ سے بے قابو تھی جریج نے کہا کہ ٹھہر جاؤ! اتنی عجلت مت کرو، اس بچہ سے پوچھا جائے کہ تو کس کا لڑکا ہے؟ حق تعالیٰ نے ان کو کرامت عطا فرمائی چنانچہ جب بچہ سے پوچھا گیا تو اس نے بتلا دیا کہ میرا باپ فلاں چرواہا ہے، جریج نہیں ہے (رواہ الشیخان) اب جو بچہ نے زانی کا نام بتایا تو لوگ جریج کے ہاتھ چومنے لگے اور ان کی تکریم کرنے لگے، تو جب حق تعالیٰ نصرت فرماتے ہیں تو خلافِ عادت چیزیں بھی ظاہر ہونے لگتی ہیں جیسا کہ اس قصہ میں ہوا اور خود قرآنِ کریم میں ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تو لوگوں نے کہا ’’یا اخت ھارون ما کان ابوک امرأ سوء وما کانت امک بغیا‘‘ (مریم، آیت: ۲۸) تمہارے باپ بھی ایسے نہیں تھے اور تمہاری ماں بھی ایسی نہیں تھیں تم نے یہ حرکت کیسے کی کہ بغیر شادی کے بچہ ہوگیا، حضرت مریمؓ کو بڑی تشویش تھی مگر حق تعالیٰ کی طرف سے نصرت ہوئی، انہوں نے حق تعالیٰ کی طرف سے مامور ہو کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا کہ انہیں سے پوچھ لو، تو قوم کے لوگوں نے کہا ’’کیف نکلم من کان فی المھد صبیا‘‘ (مریم، آیت: ۲۹) جو بچہ ابھی گہوارے میں ہے ہم اس سے کیسے کلام کریں؟ کوئی دانا فرزانہ ہو تو اس سے گفتگو کی جاسکتی ہے، ادھر تو یہ بات ہوئی اور ادھر گہوارے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے انہوں نے فرمایا ’’انی عبد اللہ‘‘ بے شک میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں ’’اتنی الکتاب وجعلنی نبیا‘‘ (مریم، آیت: ۳۰) تو بچپن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کلام کیا ہے ان ہی کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؓ کی براءت ظاہر فرمائی۔

ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہوتی ہے

حق تعالیٰ کی مرضی ہوتی ہے تو خلافِ عادت چیز ظاہر ہوتی ہے بلکہ چیزوں کے خواص بھی ختم ہو جاتے ہیں، دار الندوہ میں قریش مکہ کی میٹنگ ہوئی کہ محمد (ﷺ) کا کیا کیا جائے اور اس میں قریش کے بڑے بڑے متکبر سردار بھی موجود تھے کوئی کہہ رہا تھا کہ ان کو کسی مکان میں بند کر دیا جائے اور روشندان سے ان کو کھانا پانی دیدیا جائے وہ اندر ختم ہو جائیں گے یہ تدبیر بھی رد کر دی گئی، کسی نے کہا کہ گدھے پر بٹھا کر ان کو شہر بدر کر دیا جائے یہ تجویز بھی یہ کہہ کر رد کر دی گئی کہ ان کا کلام اتنا میٹھا اور ان کے اخلاق اتنے عمدہ ہیں کہ جہاں پر جائیں گے دلوں پر حکومت کریں گے اور پھر اگر طاقت فراہم کر کے تمہاری طرف متوجہ ہوں گے تو تمہاری آ بنے گی، کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ کہا بالآخر ابو جہل کی رائے یہ ہوئی کہ تمام قبائل کے کچھ نوجوان ملکر یکایک ان پر حملہ کریں اور ان کو ختم کر دیں، ظاہر ہے کہ اس صورت میں بنی ہاشم بدلہ لینے کیلئے کس کس سے بھڑیں گے، ابلیس بھی وہاں شیخ نجدی بن کر انسانی شکل میں آیا تھا اس نے ابو جہل کی پیٹھ تھپ تھپائی کہ یہ بڑی اچھی رائے ہے۔ (الطبقات الکبری ۱/۶۷، شرح زرقانی ۲/۹۵) ادھر تو یہ ہو رہا تھا اور ادھر آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کا حکم دیا گیا چنانچہ آپ مکہ سے مدینہ کی طرف نکلے قریش کو جب اس کا پتہ چلا تو انہوں نے سو اونٹ انعام مقرر کیا کہ جو محمد کو پکڑ کر لائے گا اسے سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے جو اس وقت کا بہت بڑا انعام تھا آج کے حساب سے آپ ایسا سمجھ لیں جیسے سو بہترین موٹر کاریں کسی کیلئے مقرر کر دی جائیں، تو سو اونٹ انعام میں مقرر کیے گئے، نبی کریم ﷺ کے تعاقب میں سراقہ چلے اور قریب پہنچ گئے تاریخ میں لکھا ہے کہ سراقہ کے گھوڑے کے پیر پتھریلی زمین میں دھنسے اور دھواں نکلنا شروع ہوا تو وہ ڈر گیا اور کانپ گیا کہ پتھریلی زمین میں گھوڑے کے

پاؤں دھنس رہے ہیں، دھواں نکل رہا ہے اور اس نے درخواست کی کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ مجھے معاف کردیجئے میں وعدہ کرتا ہوں کہ نہ میں آپ کو پکڑوں گا اور نہ کسی اور کو اس طرف آنے دوں گا، خیر نبیٔ کریم ﷺ کی دعا کی برکت سے اس کی جان چھوٹی (رواہ الشیخان) تو آپ اندازہ لگایئے کہ پیغمبر کے گرفتار کرنے پر سو اونٹوں کا انعام تھا اور پیغمبر کو گرفتار کرنا گناہ کی بات تھی تو جب خواہش کا جذبہ غلط طریقہ سے چلا تو زمین نے عادت کے خلاف دھنسنا شروع کیا اور زمین کی عادت عام طور پر اور خاص طور سے پتھریلی زمین میں اس طور سے گھوڑے کو دھنسانے کی نہیں ہے مگر زمین کے مزاج میں حق تعالیٰ کی طرف سے تبدیلی پیدا ہوئی اور پتھریلی زمین نے گھوڑے کے پیر کو دھنسانا شروع کیا اور جب توبہ کی تو حق تعالیٰ کی طرف سے نجات اور نصرت ہوئی اور پھر نبیٔ کریم ﷺ نے انہیں بشارت بھی سنائی ہے کہ کسریٰ کے کنگن تمہارے ہاتھ میں آئیں گے (السنن الکبریٰ ۳۵۸/۶، منتخب الکنز ۴۱۲/۴) گویا سو اونٹ انعام کے عوض حق تعالیٰ تمہیں ایک بڑا انعام عطا فرمائیں گے چنانچہ حضرتِ عمرؓ کے زمانہ میں کسریٰ کے کنگن ان کے ہاتھ میں آئے اور جو نبیٔ کریم ﷺ کی بشارت تھی وہ ان کے حق میں سچی ثابت ہوئی (حوالہ بالا) تو کہنے کا منشا یہ ہے کہ حق تعالیٰ خلافِ عادت چیزیں ظاہر فرماتے ہیں، چنانچہ ایک موقع پر صحابہ سفر کررہے تھے اور ان کے پاس کشتیاں نہیں تھیں سامنے سمندر تھا انہوں نے یہ سوچا کہ ہم دین کی نصرت کیلئے نکلے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد ہے لہٰذا ہمیں چاہئے کہ پانی میں گھوڑے ڈالدیں اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائیں گے چنانچہ تاریخ میں موجود ہے کہ پانی پر صحابہ کرام کے گھوڑے چلے ہیں اور اس شان کے ساتھ چلے ہیں کہ ان کا پیالہ گر گیا تو اسے بھی سمندر کی موج نے ان تک پہنچا دیا (ترجمان السنۃ ج۴ ص۳۳۲) دیکھئے پانی ڈبوتا ہے مگر اس مقام پر حق تعالیٰ کی نصرت ایسے ہوئی کہ پانی نے اپنے مزاج کے خلاف کام کیا یہ حق

تعالیٰ کے امر سے ہوا گویا خدا تعالی نے اس کی خاصیت کو کھینچ لیا، تو زمین اس طرح نہیں دھنساتی ہے مگر وہاں نافرمانی ہوئی تو زمین نے اپنے مزاج کے خلاف کام کیا، یہاں فرمانبردار بندے تھے تو پانی نے اپنے مزاج کے خلاف کام کیا، چنانچہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں زلزلہ آیا تو آپ نے زور سے زمین پر قدم مارا اور فرمایا کہ اے زمین! ٹھہر جا، تجھ پر عمر جیسا انصاف کرنے والا موجود ہے پھر تو حرکت میں آتی ہے، تو فوراً زمین ساکن ہوگئی (زلزلہ حادثہ یا عذاب ص۸۰ بحوالہ عمدۃ القاری) اسی طرح ایک موقعہ پر آگ لگی تو حضرت عمرؓ نے اپنا کرتہ بھیجا اور وہ کرتہ لیجا کر آگ میں ڈالا گیا تو بھڑکتی آگ بجھ گئی، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ کرتہ بھیجنے میں ادھر اشارہ تھا کہ کرتہ کا تعلق تھا حضرت عمرؓ کے سینہ سے اور حضرت عمرؓ کے سینے میں دل تھا اور دل میں عشقِ الٰہی کی آگ جل رہی تھی بھلا اس کرتہ کے آگ میں ڈالے جانے پر مادّی آگ اس پر کیا اثر کرسکتی تھی لہٰذا وہ آگ بجھ گئی۔ (ملفوظاتِ خطیب الامت جلد اول ص۱۱۴) پھر جب حضرت یوسف علیہ السلام پر تہمت لگائی گئی تو خلاف عادت ایک شیر خوار بچہ نے آپ کی براءت پر گواہی دی یہ حق تعالی کی قدرت کی نشانی تھی۔ پھر بچہ کا ایسا عادلانہ اور عاقلانہ کلام کرنا یہ بھی اللہ تعالی کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کی دلیل ہے۔

زبان قدرتِ الٰہی کا ایک نمونہ

یہ زبان گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اس کا کلام کرنا یہ حق تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے، آپ نے ٹائپ رائٹر کو دیکھا ہوگا کہ اس میں کچھ حروف بنا دیئے جاتے ہیں اس کے بعد انگلیاں ان کو ٹچ کرتی ہیں جس سے ٹائپنگ ہوتا ہے اسی طریقہ سے قدرت نے پہلے منہ میں دانتوں کی فٹنگ کردی اس فٹنگ کے بعد زبان یہاں ٹکرائی تو ''ث'' نکلا (اس موقعہ پر حضرتؒ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے وہ کیفیت حاضرین کو بتلائی) پھر یہاں

جا کرٹکرائی تو ''ش'' نکلا،، یہاں ٹکرائی تو ''ن'' نکلا غرض یہ کہ حق تعالیٰ کی طرف سے اولاً فٹنگ کی ایک شکل ہوئی اور پھر زبان کے ذریعہ سے ٹچنگ ہوتی رہتی ہے اور اس سے حروف بن بن کر نکلتے رہتے ہیں اور جملے تیار ہوتے رہتے ہیں بہر حال زبان تو صرف گوشت کا لوتھڑا ہے یہ حق تعالیٰ کی قدرت ہے کہ وہ ناطق بھی ہوتی ہے اور ساکت بھی ہوتی ہے اور آپ اندازہ لگائیے کہ رگوں کے آپس میں کتنے گہرے تعلقات ہوتے ہیں دماغ سے زبان کا مستقل جوڑ ہے اگر دماغ متاثر ہو تو زبان کام نہیں کرتی، تو بچہ کا کلام کرنا تو اپنی جگہ تعجب خیز ہے ہی ویسے انسان کا زبان سے کلام کرنا بھی تعجب خیز بات ہے، ناک آپ کی اس طرح نہیں بولتی، کان آپ کے اس طرح نہیں بولتے اور پھر بچہ کا ایسے زمانہ میں کلام کرنا کہ جس زمانہ میں بچے کلام نہیں کرتے کہ وہ اس زمانہ میں یا تو اماں کو یاد کرتے ہیں یا دودھ کو یاد کرتے ہیں لیکن یہاں ایک بچہ کا حضرت یوسف علیہ السلام کی تائید میں اتنا عادلانہ اور منصفانہ کلام کرنا یہ حق تعالیٰ کی نصرت تھی۔

یہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے

اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ جو آدمی تنہائیوں میں پاکدامنی کا لحاظ کرے گا حق تعالیٰ اس کے لئے عفّت کی شکلیں پیدا کریں گے اور حق تعالی اس کے ساتھ تائید و نصرت کے باب میں خصوصی معاملہ فرمائیں گے، یہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے یہاں ایسا نہیں ہوتا کہ جرم کرتے ہی پکڑ لیا جائے اور جو نیک ہو اس کے لئے ہمیشہ خیر ہی خیر ہو بعض دفعہ نیک لوگوں پر بھی حالات آتے ہیں اور بعض دفعہ مجرمین کیلئے بھی چھٹکارے کی شکل ہو جاتی ہے یہ آزمائش کی جگہ ہے اس میں مختلف قسم کے حالات آتے ہیں البتہ سنت اللہ یہی ہے کہ نتیجہ اور انجام کے اعتبار سے حق اور صداقت کا غلبہ ہوتا

ہے۔

حق مغلوب ہوسکتا ہے، مٹ نہیں سکتا

اس کو آپ ایک مثال سے سمجھ لیں جیسے ہنڈیا میں تیل اور پانی ہو اور آپ چمچا ہلا کر اس تیل کو دبانا چاہیں تو جب تک خارجی دباؤ رہے گا وہ تیل نیچے رہے گا اور جیسے ہی وہ دباؤ ہٹے گا تو وہ فوراً اوپر آجائے گا، اس سے یہ معلوم ہوا کہ جو چیز اپنی اصلی حالت میں جس جگہ پر ہونا چاہیئے وہ وہیں پہنچتی ہے، بہرحال حق وصداقت کو ہمیشہ کامیابی ہوتی ہے، بزرگوں نے لکھا ہے کہ حق مغلوب ہوسکتا ہے، مٹ نہیں سکتا یہ ہوسکتا ہے کہ باطل کسی موقعہ پر غالب آجائے اور حق دب جائے، تو حق دب سکتا ہے مغلوب ہوسکتا ہے مگر حق مٹ جائے یہ نہیں ہوسکتا۔

آپ مجھے شرمندہ نہ کریں

تو حضرت یوسف علیہ السلام سے عزیز مصر نے کہا "یوسف اعرض عن ھذا" اے یوسف! اس واقعہ سے تو آپ صرفِ نظر کرلیں اس کو تو ابھی آپ فراموش کرلیں اور اپنی بیوی زلیخا سے کہا "واستغفری لذنبک" "تم معافی چاہو" "انک کنت من الخطئین" "کہ بیشک تم خطا کاروں میں ہو، حق تعالیٰ نے گویا شوہر کی زبان سے بھی یہ کہلا دیا کہ یوسف! تم تو پاکدامن ہو اور اے زلیخا! تیرا کام خطا کا تھا اور آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ زلیخا نے بعد میں حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے واقعہ کی تفصیل بیان کی تھی کیونکہ بعد میں زلیخا کی شادی حضرت یوسف علیہ السلام سے ہوئی ہے جب حضرت یوسف علیہ السلام نے زلیخا سے تنہائی کے وقت پوچھا کہ: زلیخا یہ بتاؤ اس وقت ہم جو عمل قضاءِ شہوت کا کریں گے یہ صحیح ہے، یا وہ جسے تم نے چاہا تھا؟ تو زلیخا نے کہا کہ اب آپ مجھے شرمندہ نہ کریں، میں ایک بات آپ کو بتلاتی ہوں میں شاہی محل میں رہتی تھی

وہاں غذا اعلیٰ قسم کی تھی اور ادھر آپ کا شباب تھا جو پھوٹا پڑتا تھا اور میرا شوہر نامرد تھا ان ساری مجبوریوں کی وجہ سے میں نے وہ قدم اٹھایا تھا (گلدستۂ تفاسیر ج ۳ ص ۴۷۷) تو غرض یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حسن، پاکدامنی اور حکومت سے نوازا جس کے عجیب عجیب واقعات آگے آرہے ہیں۔

کسی خبر کو عام کرنے کی ایک ترکیب

لیکن بہرحال یہ واقعہ تو پیش آ گیا، شوہر نے چاہا کہ اس واقعہ کو دبا دے مگر شاہی گھرانے کی کچھ عورتوں کو معلوم ہو گیا اور یہ آپ جانتے ہی ہیں کہ بی بی سی لندن وہ کام نہیں کرتی جو بعض عورتیں کر لیتی ہیں، اگر کسی خبر کو آپ کو عام کرنا ہو تو کسی عورت سے کہدو اور ساتھ میں یہ بھی کہدو کہ کسی کو کہنا مت اور بعض مردوں کا بھی یہ حال ہوتا ہے کہ ان کو کوئی بات کہو اور ساتھ میں کہو کہ کسی کو کہنا مت تو وہ بھی دوسرے کو یہ بات پہنچا دیتے ہیں اور ساتھ میں یہ بھی کہتے ہیں کہ مجھے یہ بھی کہا ہے کہ کسی کو کہنا مت لیکن میں آپ سے کہہ رہا ہوں، تو عورتوں کے پیٹ میں بات رہنا بڑا مشکل ہے، اس لئے اس بات کا چرچا ہوا اور خاص طور سے کچھ عورتوں نے اس میں خاص کردار ادا کیا ہر جگہ کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو خوشی سے چمچے ہلانے کا کام انجام دیتے ہیں اور میں تو کہا کرتا ہوں کہ اس دور میں پیالے تو شیشہ کے ہوتے ہیں اور چمچے اسٹیل کے پیالے تو ٹوٹ جاتے ہیں چمچے باقی رہ جاتے ہیں۔

جبل گردد جبلت نہ گردد

عبد الملک بن مروان کے زمانہ کا واقعہ ہے، ایک غلام تھا اس میں یہی عادت تھی یہاں کی بات وہاں اور وہاں کی بات یہاں لگاتا تھا چمچے ہلانے کی عادت تھی اور اپنی طرف سے بھی کچھ لگا دیتا تھا بڑا دلچسپ واقعہ ہے آقا غلام کو بازار لے گیا تاکہ اسے بیچ

دے ایک آدمی آیا اس نے پوچھا کہ اس غلام کی کیا قیمت ہے اس نے قیمت بتلائی خریدار سوچنے لگا کہ بہت کم قیمت ہے لہٰذا خرید لیا، غلام کے مالک نے خریدار سے کہا کہ اس کی قیمت تو بہت کم ہے لیکن اس میں ایک عیب ہے کہ وہ اِدھر کی بات اُدھر اور اُدھر کی بات اِدھر کرتا ہے اس عیب کے باوجود تم خریدتے ہو تو تم جانو، خیر وہ خرید کر لے گیا غلام تھوڑے دن تو ٹھیک رہا لیکن آپ جانتے ہیں کہ آدمی کی پڑی ہوئی عادت نہیں جاتی جیسے ایک چور تھا اسنے چوری سے توبہ کی اور شیخ کے ساتھ خانقاہ میں رہنے لگا، اب ہوتا یہ کہ صبح کے وقت کسی مرید کا جوتا یہاں ہوتا کسی کا وہاں ہوتا، کسی نے تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ فلاں صاحب یہ کام کرتے ہیں، شیخ نے ان کو تنہائی میں بلاکر پوچھا کہ تم نے یہ کیا لگا رکھا ہے؟ اس نے کہا حضرت! برسوں کی پڑی ہوئی عادت ایک دن میں کیسے چھوٹ سکتی ہے جب رات ہوتی ہے تو اندر کھلبلی مچتی ہے چونکہ میں نے چوری سے تو توبہ کر لی ہے اس لئے میں چوری تو نہیں کر سکتا لیکن اپنے دل کی تسکین کیلئے کسی کی جوتی یہاں تو کسی کی وہاں کر دیتا ہوں (ملفوظات فقیہ الامت) بہر حال کہنے کا منشا یہ ہے کہ لگائی بجھائی غلام کی پرانی عادت تھی اس لئے اس نے کچھ دن بعد سوچا کہ میاں بیوی میں تھوڑی سی لگائی جائے تو جا کر اس نے شوہر سے کہا کہ آپ کی بیوی کے تعلقات غیر سے ہیں پھر اس نے اپنا منہ بگاڑ کر کہا کہ آپ اتنے شریف آدمی ہیں ایسے ہیں ویسے ہیں اور وہ اس طرح کے کام کرتی ہے اس نے شوہر کے خوب کان بھرے اور یہ کہا کہ اب تو پانی سر سے گزر چکا ہے اگر میں جھوٹا ہوں تو مجرم کی جو سزا ہے وہ آپ مجھ کو دیں اور اگر آپ چاہیں تو اس کا تجربہ اس طرح کریں کہ آج اپنے گھر جائیں اور سونے کا ڈھونگ کریں اس لئے کہ آج تو اس نے اپنے چاہنے والے کے ساتھ مل کر پلان تیار کر لیا ہے اور وہ آپ کو قتل

کرنے والی ہے اور پھر اس کے ساتھ بھاگ جانے والی ہے، آقا نے کہا کہ کیا ایسی بات ہے؟ تو اس نے کہا کہ ہاں بالکل، تو آقا جلال میں آگیا، تو غرض یہ ساری بات آقا سے کہی اور ادھر منہ بگاڑ کر گھر پہنچا، عورت نے پوچھا کہ کیا بات ہے، اس نے کہا کہ بس رہنے دو بات کہنے کے قابل نہیں ہے، عورتوں کا مزاج ہے کہ ایسی بات کہو تو ان کو اور زیادہ شک ہوتا ہے، جب عورت نے زور ڈالا تو وہ کہنے لگا کہ تم تو شریف عورت ہو، عزت کے ساتھ گھر میں رہتی ہو اور آپ کے شوہر ادھر ادھر کے چکر میں رہتے ہیں، ایک عورت سے انہوں نے تعلق قائم کرلیا ہے اور آج تم کو طلاق دیدینے والے ہیں، آج پورا مشین گن استعمال ہوجائے گا، اس نے کہا کہ ارے یہ بات ہے؟ اس طرح کی بات پر عورتوں کے جلال کا کیا پوچھنا، خیر وہ جلال میں آگئی، پھر غلام نے کہا کہ میرے پاس ایک ترکیب ہے جس سے آقا آپ کے ہوجائیں گے اور وہ بہت آسان ہے اور وہ یہ کہ جب آقا سوجائیں تو استرہ لیکر اس طرح جانا کہ ان کو پتہ نہ چلے اور ان کی ڈاڑھی کے دوچار بال کاٹ لینا میں اسکی تعویذ بنادوں گا اور اسے تم باندھ لوگی تو آقا غلام کی طرح تمہارے تابع ہوجائے گا اس نے کہا کہ کیا ایسا ہوگا؟ اس نے کہا کہ بالکل، اب وہ اسی انتظار میں رہی کہ شوہر آئے کھانا کھائے اور سوئے تاکہ میں اس کی ڈاڑھی کے بال کاٹوں اور اس کی تعویذ بنواؤں تاکہ وہ میرے ہاتھ میں آجائے، اب یہ جناب (شوہر) گھر گئے تو تیور بدلے ہوئے تھے، کھانا کھایا نہ کھایا اور اس کے بعد آزمائش کیلئے لیٹ گئے کہ دیکھے غلام کی بات سچی ہے یا جھوٹی؟ آنکھ بند کرکے ایسے ہی سوگئے اور خواہ مخواہ خرّاٹے لینے لگے، بعض لوگ تو نیند میں بھی جنریٹر چلاتے ہیں، میرے برطانیہ کے پہلے سفر میں ایک صاحب میرے ساتھ ہوگئے اور وہ مجھ سے پہلے سوگئے، اب انہوں نے

اتنی زور سے جنریٹر چلانا شروع کیا کہ میرے لئے سونا مشکل ہوگیا اب میں جاگتا ہوں تو پورے دن کا پروگرام خراب ہوتا ہے اور ان کو اٹھاتا ہوں تو اس بیچارے کی نیند خراب ہوتی ہے، پھر میں نے سوچا کہ ان کو اٹھا ہی دوں کہ وہ تو تھوڑی دیر میں پھر سو جائیں گے، خیر میں نے ان کو اٹھایا تو وہ اٹھے انہوں نے پوچھا کیا بات ہے؟ میں نے کہا کوئی بات نہیں، ذرا میں سوجاؤں اس کے بعد آپ سوجایئے، خیر شوہر آ کر سویا تو بیوی کے سامنے تو پورا فارمولا تھا ہی، اس نے دیکھا کہ شوہر سوگیا ہے تو وہ استرہ لیکر پہنچی، اب جب وہ استرہ لیکر قریب پہنچی تو شوہر کو غلام کی بات پر یقین آ گیا کہ وہ سو فیصد سچا ہے چنانچہ شوہر نے اٹھ کر غصہ میں استرہ ہاتھ سے لیا اور اسی استرہ سے عورت کا گلا کاٹ دیا، جب عورت کے رشتہ داروں کو پتہ چلا تو ان کے تیور بدلے، وہ جلال میں آئے اور انہوں نے شوہر کو قتل کردیا، پھر شوہر کے رشتہ دار آئے اور عورت کے رشتہ داروں سے بھڑ گئے اور اس طرح خوب خون خرابہ ہوا۔ (الجواہر الزواہر ص ۵۵۷) دیکھئے اس نے صرف چمچا ہلایا تھا لیکن کتنا زبردست تماشہ ہوا۔

میں صرف اشارہ کرتا ہوں

جیسے ابلیس نے ایک بزرگ سے کہا تھا کہ میں انسانوں کو لڑانے کیلئے زیادہ محنت نہیں کرتا صرف تھوڑا سا اشارہ کردیتا ہوں اور وہ لڑنے لگتے ہیں اس بزرگ نے کہا کیسے؟ اس نے کہا آپ کو سمجھنا ہو تو میرے ساتھ چلئے میں ابھی آپ کو بتلاتا ہوں چنانچہ وہ ایک حلوائی کی دکان پر گیا اور تھوڑی سی چاشنی لی اور دیوار پر لگادی، جب چاشنی دیوار پر لگائی تو وہاں مکھی آئی، مکھی کی وجہ سے چھپکلی آئی اور چھپکلی کی وجہ سے بلی آئی اور بلی کو دیکھ کر کتا دوڑا، بلّی والوں نے کتے کو مارا اس طرح کتے والے اور بلّی والوں کی آپس میں چلی اور ہوتے ہوتے باقاعدہ جنگ چھڑ گئی، تو دیکھئے ذرا سی چیز لڑائی کا بہانہ بن گئی،

ذراسی چیز تھی وہ آسمان پر جا پہنچی۔

یہ تو کوئی فرشتہ ہے

تو وہاں بھی مصر میں ذرا سا مسئلہ تھا لیکن یہ شکل ہوئی کہ کچھ عورتوں کو پتہ چلا تو انہوں نے کہا کہ یہ اچھا موقع ہے پھر انہوں نے بات چلائی کہ دیکھئے بادشاہ کی بیوی ہے اور ایک غلام سے تعلق قائم کیا، اگر تعلق قائم کرنا ہی تھا تو کسی اونچے خاندان والے سے قائم کرتی، یہ تو ایک غلام اور ملازم ہے اور یہ بات شریف لوگوں کیلئے مناسب نہیں ہے یہ تو ''شر'' ''آفت'' ہے، زلیخا نے سوچا کہ ان ظالموں کو کیا پتہ کہ میں کتنی مشکلات میں مبتلا ہوں اسنے چاہا کہ کسی طریقہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کا جمال انہیں بھی دکھلائے، لہٰذا اس نے ایک دعوت کا پروگرام رکھا جس میں پھل اور میوے رکھے گئے اور وہ مخصوص عورتیں بلائی گئیں، اس وقت مصر میں بھی کھانا کھانے میں چھری کانٹے کا چلن تھا اور پھر یہ تو شاہی گھرانہ تھا، غرض یہ کہ یہ سارا انتظام کیا گیا، پھر جب ان عورتوں نے چھری اور پھل ہاتھ میں لئے تو زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو آواز دی کہ ذرا ادھر آنا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ سارا نظام معلوم نہیں تھا وہ ادھر سے نکلے اور جب ان پر عورتوں کی نظر پڑی تو انہوں نے پھل کاٹنے کے بجائے اپنے اپنے ہاتھ اور انگلیاں کاٹ لیں قرآنِ کریم میں ہے ''وقطعن ایدیھن'' انہوں نے اپنے ہاتھوں کو (انگلیوں کو) کاٹ لیا اور اس کے بعد وہ عورتیں کہنے لگیں کہ یہ تو کوئی فرشتہ معلوم ہوتا ہے، یہ تو انسان ہے ہی نہیں، چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کا جمال ایسا تھا کہ وہ حور و غلمان کے جمال کا پرتو اور عکس تھا، وہ جدھر رخ کرتے اس طرف کی دیوار پر روشنی پڑتی تھی، سڑک پر رات کے وقت تشریف لے جاتے تو چاند کی روشنی ایک طرف پڑتی تھی اور ایک طرف ان کے رخسار کی روشنی پڑتی تھی ایسا جمال اللہ تعالیٰ نے دیا تھا چنانچہ جب ان عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن دیکھا تو وہ عورتیں حضرت یوسف علیہ السلام سے کہنے لگیں کہ تم کو اپنی مالکن اور عزیزہ کی بات ماننی چاہیئے۔

اِ نّکُنّ اَنتنّ لصواحب یوسف

اب سنئے مسلم شریف کی حدیث ہے کہ آپ ﷺ بیمار ہوئے مرض الوفات کا وقت تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ابوبکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، حضرت عائشہؓ نے سوچا کہ میرے والد حضور ﷺ کے مصلے پر کھڑے ہوں گے اور اگر آپ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے تو لوگ کہیں گے کہ ابوبکر کے قدم مصلے پر پڑے اس لئے آپ ﷺ کی وفات ہوگئی گویا لوگ فالِ بد لیں گے کہ ان کے قدم بابرکت نہیں تھے کہ یہ مصلے پر آئے اور حضور ﷺ کا انتقال ہوگیا چنانچہ حضرت عائشہؓ نے بڑی حکمت سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے والد بڑے نرم دل ہیں وہ آپ کی جگہ پر کھڑے ہوں گے تو برداشت نہیں کرسکیں گے ان پر بکثرت گریہ طاری ہوگا، بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کثرت سے روتے تھے اور ان کو آنکھوں پر قابو نہیں تھا آپ زاروقطار روتے تھے حتی کہ آپؓ قرآنِ کریم پڑھتے تھے تو مشرکین کی عورتوں اور بچوں کا ہجوم ہوجاتا تھا، جب آپؓ روتے تھے تو ان پر بھی کیفیت طاری ہوجاتی تھی، تو غرض یہ کہ حضرت عائشہؓ نے یہ بات کہی، پھر آپ ﷺ سے حضرت حفصہؓ نے بھی یہ عرض کیا اس لئے کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت حفصہؓ سے کہا تھا کہ تم کہو کہ آپ ﷺ حضرتِ عمرؓ کو حکم فرمائیں کہ وہ نماز پڑھائیں، اس لئے کہ وہ مضبوط طبیعت کے آدمی ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا ''انکن انتن لصواحب یوسف'' کہ تم لوگوں کی مثال ان عورتوں کی ہے جو زلیخا کے پاس تھیں (سیرت عائشہؓ ص ۹۳ بحوالہ بخاری شریف) نبی ﷺ نے ان کو ''لصواحب یوسف'' سے تعبیر کیا، کیا مطلب اس کا؟ مطلب یہ ہے کہ وہ عورتیں کہہ تو رہی تھیں کہ یوسف تم زلیخا کی بات مان لو مگر ان سب عورتوں کی دلی تمنا یہ تھی کہ یوسف ہماری طرف متوجہ ہوجائیں، کہہ رہی تھیں کچھ اور منشا ان کا کچھ اور تھا اس لئے آپ ﷺ نے ان کو ''صواحب یوسف'' سے تشبیہ

دی کہ تمہارا حال بھی اِس وقت یہ ہے کہ گویا تم کہہ تو یہ رہی ہو کہ ابوبکر اس مقام پر نہیں ٹھہر سکیں گے مگر مقصد تمہارا کچھ اور ہے کہ لوگ اس سے بدفالی لیں گے، تو تمہارے دل میں کچھ ہے اور زبان پر کچھ اور ہے اس لئے نبیٔ کریم ﷺ نے یہ تشبیہ دی۔

عشق کی دنیا عجیب ہے

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ دنیائے عشق عجیب ہے کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک شخص شاہی محل میں کام کرتے تھے وہاں بیگمات رہتی تھیں، بیگمات میں سے کسی نے اوپر سے کوئی چیز ڈالی اس خادم کی نظر اس کے ہاتھ پر پڑ گئی اور اس سے عشق کی کیفیت پیدا ہوگئی کسی کو آواز پر عشق ہو جاتا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ٹرائے (کوشش) کریں بلکہ یہ بلائیں ہیں ان سے بچیں، اسی لئے کتاب وسنت میں جن گناہوں پر سزا ہے وہاں یہ نہیں فرمایا کہ اس کا یہ طریق ہے، مثلاً جوا اور سٹہ حرام ہے تو وہاں یہ نہیں بتلایا کہ اس کا یہ طریق ہے، حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے رسموں پر ایک کتاب "اصلاح الرسوم" لکھی ہے جس میں یہ بیان کیا ہے کہ فلاں فلاں رواج کی اصلاح ہونی چاہئے، ایک بے وقوف نے حضرت سے کہا کہ حضرت! آپ نے بڑا احسان کیا کہ یہ کتاب لکھی ہمیں جو رسمیں معلوم نہیں تھیں وہ اس کتاب سے معلوم ہوگئیں اب اس میں دیکھ دیکھ کر ہم ان رسموں کو انجام دیتے رہیں گے، خیر اس میں عشق کی کیفیت پیدا ہوئی، جب بادشاہ کو پتہ چلا تو اسنے آزمائش کیلئے تمام کو حاضر کیا اور سب کے ہاتھ دکھلائے چونکہ اس میں عشق کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی اس لئے اس کے سامنے آتے ہی فوراً ادراک ہوگیا، خیر وہ تو باندیوں میں سے ہی کوئی ہوگی بادشاہ نے اس کو اس کے ساتھ منسوب کر دیا اور منسوب کر دینے کے بعد پھر اس کے ساتھ شب باشی ہوئی، درمیان میں قصہ یہ ہوا کہ اس کو بادشاہ نے زہر دلوایا لیکن اس کا کوئی اثر اس پر نہیں ہوا اس لئے کہ

طبیعت جب کسی شئ کی طرف قوت کے ساتھ متوجہ ہوتی ہے تو دوسری طرف التفات نہیں ہو پاتا، اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ ایک مریض کو آپ دنیا بھر کی عمدہ سے عمدہ چیزیں کھلائیں اور ساتھ میں کوئی بڑی فکر وغم کی بات سنا دیں تو سارا کھایا پیا بیکار ہو جائے گا، خیر اب ہوا یہ کہ غلام کی اس باندی سے شادی ہو گئی، شادی کے بعد ہمبستری بھی ہو گئی اور جب فارغ ہو گئے تو دونوں کا انتقال ہو گیا، اب اس زمانہ میں جو اطباء وغیرہ تھے ان کو جمع کیا گیا اور تحقیق کی گئی کہ اس کا انتقال زہر کی وجہ سے جو اس کو شب باشی سے پہلے دیا گیا تھا کیوں نہیں ہوا اور شب باشی کے بعد کیوں ہوا؟ تو انہوں نے کہا کہ عشق کی وجہ سے اس کی طبیعت محبوبہ کی طرف کلی طور پر مائل تھی اس لئے زہر کے اثرات اس پر ظاہر نہیں ہوئے لیکن جب اس کو اس کی محبوب شئی مل گئی تو اسکو تسکین ہو گئی اور محبوبہ کی طرف توجہ کم ہو گئی اور زہر نے اپنا اثر اولاً غلام پر کیا اور پھر یہ اثرات باندی کی طرف منتقل ہوئے اور نتیجۃً دونوں دنیا سے رخصت ہو گئے اور سارا قصہ ہی ختم ہو گیا۔

حضرت خالد بن ولیدؓ کا واقعہ

چنانچہ حضرت خالد بن ولیدؓ سے کسی نے کہا کہ اگر آپ ایمان رکھتے ہیں تو یہ زہر کا پیالہ پی لیجئے، انہوں نے کہا کہ بہت اچھا اس نے آزمائش کیلئے کہا تھا، حضرت نے بسم اللہ پڑھی اور زہر کا پیالہ پی لیا لیکن ان کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا (ترجمان السنۃ ج۴ص ۳۳۶ بحوالہ تہذیب التہذیب) بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ بطورِ تکریم بعض چیزوں کی خاصیت ان سے سلب کر لیتے ہیں۔

ہر عمل کا آدمی کے قلب پر اثر پڑتا ہی ہے

مجھے تو یہ بتلانا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت کے لئے حق تعالیٰ کی طرف سے نصرت ہوئی کہ ایک معصوم بچہ نے گواہی دی اور گواہی بھی ایسی دی کہ وہ واقعہ

پر بالکل فٹ ہونے والی تھی اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی حق تعالیٰ کا خوف ملحوظ رکھے اور معاصی سے بچے تو حق تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے غیبی نصرتیں ہوگی اور دنیا کے سامنے اصلی حقائق آجائیں گے اور اگر کسی وجہ سے یہاں ان کا ظہور نہیں ہوا تو قیامت میں تو وہ حقائق ضرور کھل کر سامنے آئیں گے اور حقیقت یہ ہے کہ ہر عمل کا آدمی کے قلب پر اثرات پڑتے ہیں اور اب تو دنیا اتنی ترقی کر چکی ہے کہ آپ دروازہ پر ہاتھ لگائیں تو اس پر اثر آجاتا ہے آپ شیشہ پر ہاتھ لگائیں تو اس پر اس کا اثر آجاتا ہے اور ہومیو پیتھک دوا پر تو انسان کی کھال کا بھی اثر ہوتا ہے اور خوشبو بدبو کا بھی اثر ہوتا ہے، اسی طرح انسانی افعال کے نیتوں کے اور احوال کے بھی روح پر اثرات پڑتے ہیں، اسی لئے فرمایا گیا کہ: جس قوم میں زنا عام ہوگا اس میں ناگہانی موت کی کثرت ہوگی (درمنثور ج۶ص۵۲) اور زنا کے باب میں مشہور ہے کہ وہ سر چڑھ کر بولتا ہے، کچھ چیزیں ایسی ہیں جو عموماً نہیں چھپتیں ان میں ایک قتل بھی ہے، عشق بھی ہے اور حضرت کھانسی بھی نہیں چھپتی اور زنا بھی عموماً نہیں چھپتا اس کی نحوستیں ہوتی ہیں، بہرحال حضرت یوسف علیہ السلام یقیناً پاکدامن رہے تو حق تعالیٰ نے بعد میں ان کی براءت کی عجیب شکل پیدا فرمائی، اللہ پاک ہم تمام کو عفت نصیب فرمائیں اور تمام کو ایسے مواقع سے بچائیں جہاں مبتلائے معصیت ہونے کا اندیشہ ہو، آمین ۔

درس نمبر اکیس سے حاصل ہونے والی چار اہم ہدایات

(۱) آدمی ان مواقع سے اور ان جگہوں سے بچے جہاں اسے گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو اس لئے کہ انسان کی طبیعت میں خواہشات بھی ہیں پھر نفس کا اپنا ایک کام ہے، پھر شیطان کی کوششیں اور کاوشیں اپنے مقام پر الگ ہیں اس لئے ان وجوہ سے انسان کو ان تمام مواقع سے بچنے کی ضرورت ہے جہاں پر مبتلائے معصیت

ہونے کا اندیشہ ہو اور گناہ میں پھنس جانے کا خطرہ ہو۔

(۲) کبھی ایسا موقع آجائے جس سے انسان کی آبرو پر آنچ آنے والی ہو اور اس میں وہ واقعۃً قصور وار نہ ہو تو جو صحیح بات ہے اس کا اظہار ضروری ہے اس لئے کہ جس طرح اپنی جان کی حفاظت ضروری ہے اسی طرح اپنی آبرو کی حفاظت بھی ضروری ہے۔

(۳) جو آدمی تنہائیوں میں پاکدامنی کا لحاظ کرے گا حق تعالیٰ اس کے لئے عفّت کی شکلیں پیدا کریں گے۔

(۴) چغلی سے بالکل اپنے آپ کو بچائیں کیونکہ اسکے نتائج دونوں جہاں میں بڑے خطرناک ہیں۔

درس نمبر (۲۲)

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم،امابعد!

فاعوذ بالله من الشیطن الرجیم ، بسم الله الرحمن الرحیم☆

ودخل معه السجن فتیٰن الخ

ایک تحقیقی بات

بزرگانِ محترم! گفتگو یہ چل رہی تھی کہ مصر کی عورتوں کی جانب سے حضرت یوسف علیہ السلام پر یہ اصرار ہوا کہ زلیخا کی بات مان لو جب حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ بہت بری طرح پیچھے پڑی ہیں اور زلیخا نے یہ بھی دھمکی دی تھی کہ اگر میری بات نہیں مانی تو قید خانہ میں بھیجد یئے جاؤ گے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ قید خانہ مجھے بہ نسبت اس کے کہ میں اس معصیت میں مبتلا ہوں زیادہ پسندیدہ ہے اور پھر عزیز مصر نے یہ طے کیا کہ لوگوں میں اس بات کا چرچا ختم کرنے کیلئے ان کو ایک مدت کیلئے جیل میں بھیج دیا جائے چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل خانہ میں بھیجا گیا تحقیقی بات یہ ہے کہ انہوں نے جیل خانہ میں جانے کی دعا نہیں مانگی جیسا کہ مشہور ہے، بعض آثار سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ اس گناہ میں مبتلا ہونے سے جیل خانہ میں جانا زیادہ پسند ہے، بہرحال انہیں جیل خانہ بھیج دیا گیا، حضرت یوسف علیہ السلام جیل خانہ میں مجرموں کی جگہ پر پہنچائے گئے ایسا شریف انسان جس کا جمال، جس کا کمال، جس کی خوبیاں اور جس کے اخلاق انتہائی اعلیٰ ہوں اللہ تعالی کی شان دیکھئے کہ وہ جیل خانہ بھیجے گئے اور وہ قید خانہ بھی ان کے قدمِ مبارک سے خانقاہ بن گیا۔

مجھ سے محبت کا انجام

جب حضرت یوسف علیہ السلام قید خانہ میں تشریف لے گئے اور جیلر نے ان

کو دیکھا تو کہا کہ مجھے آپ سے بڑی محبت معلوم ہوتی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھ سے محبت مت رکھنا جس نے بھی مجھ سے محبت کی اس کی وجہ سے مجھ کو پریشانی پیش آئی مثلاً میری پھوپی نے مجھ سے محبت کی اور وہ چاہتی تھیں کہ یوسف میرے ساتھ میرے گھر پر رہے لہذا وہ مجھے اپنے گھر لے گئیں جب والد نے مجھ کو ان سے واپس لینا چاہا تو پھوپی نے ایک حیلہ کیا وہ حیلہ یہ تھا کہ ایک پٹہ ان کے گلے میں باندھ دیا اور یوں کہا کہ میرا پٹّہ گم ہو چکا ہے اور اس کی تلاشی شروع ہوئی اور ان کی شریعت میں یہ حکم تھا کہ جس کے پاس سے وہ گمشدہ چیز مل جائے اس کو روک لیا جاتا تھا چنانچہ تلاشی کے بعد وہ پٹہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس ملا اور پھوپی نے اس حیلہ سے ان کو اپنے پاس رکھ لیا (معارف القرآن ادریسی ج۴ص ۱۵۶/۱۵۵) تو گویا چوری کا الزام ان کے سر لگا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے پھوپی نے محبت کی وجہ سے اپنے پاس رکھنا چاہا اور مجھ پر چوری کا الزام لگا، پھر باپ نے محبت کی تو بھائیوں نے ستایا اور کنویں میں مجھے ڈالا اور بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور زلیخا نے مجھ سے محبت کی تو اس کی برکت یہ دیکھ رہا ہوں کہ جیل خانہ میں ہوں، تو جس نے بھی مجھ سے محبت کی تو اس کی وجہ سے مجھ پر حالات آئے، خیر حضرت یوسف علیہ السلام جیل خانہ میں تشریف لے گئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا دونوں قیدیوں کو تعبیرِ خواب سے پہلے توحید کی دعوت دینا

قرآنِ کریم میں ہے ”ودخل معه السجن فتیٰن“ (یوسف، آیت: ۳۶) ان کے ساتھ دو جوان بھی جیل میں آئے اور وہ دونوں درحقیقت بادشاہ کے خادم تھے ان پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے بادشاہ کو زہر کھلانے کی سازش کی ہے ایک تو بادشاہ کا ساقی تھا جو شراب پلاتا تھا اور دوسرا بادشاہ کا باورچی تھا جو کھانا پکاتا تھا تو الزام ان پر یہ تھا کہ انہوں

نے زہر ملایا ہے اس کی خبر بادشاہ کو کسی طریقہ سے پہنچ گئی اور خبر پہنچنے کے نتیجہ میں بادشاہ نے تحقیقِ حال کیلئے ساقی کو پہلے شراب پینے کیلئے دی اور کھانے کا تعلق پکانے والے سے تھا تو کھانا اس سے کھانے کو کہا گیا، تو ساقی نے تو فوراً شراب پی لی چونکہ اس نے شراب میں زہر نہیں ملایا تھا اور ساقی نے چونکہ کھانے میں زہر ملایا تھا اس لئے اس نے کھانے سے انکار کیا، خیر وہ کھانا جانور کے سامنے ڈالا گیا جانور نے کھانا کھایا تو وہ ہلاک ہو گیا، اب شاہی پیمانہ پر تحقیق و تفتیش شروع ہوئی اور ایک مدت کیلئے جب تک کہ تحقیق مکمل ہو دونوں کو نظر بند کر دیا گیا اور جیل میں بھیجدیا گیا، اس طرح یہ دونوں جیل خانہ میں آئے، انہوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان ہے نہایت خوبصورت، اخلاق سب سے اعلیٰ، غم میں لوگوں کا ساتھ دیتے ہیں، پریشان حالوں کو تسلی دیتے ہیں اور عجیب وغریب ان کے اندر کمالات ہیں اور پھر خواب کی تعبیر بھی بتلاتے ہیں، تو انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس آکر اپنا خواب بیان کیا اور یہ خواب حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تحقیق کے مطابق واقعۃً انہوں نے دیکھا تھا اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا فرمان ہے کہ واقعۃً وہ خواب نہیں تھا بلکہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی آزمائش کیلئے ایک بات کہی تھی۔ (معارف القرآن ادریسی ج۴ص ۱۲۷) بہرحال حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر دی اور ان سے فرمایا کہ "قُضِی الامر الذی فیہ تستفتیٰن" (یوسف، آیت: ۴۱) یہ بات تو طے ہو چکی ہے جو تم پوچھنا چاہتے ہو اور جاننا چاہتے ہو اور ایسا ہی ہو کر رہے گا اور ایسی اس کی تعبیر ہوگی ساقی نے تو یہ خواب دیکھا تھا کہ میں شراب تیار کر رہا ہوں اور بادشاہ کو پلا رہا ہوں اور باورچی نے یہ خواب دیکھا تھا کہ میرے سر پر روٹیوں کا ٹوکرا ہے اور پرندے اس میں سے نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں ان دونوں نے اپنا یہ خواب حضرت یوسف علیہ السلام سے ذکر کیا اور اس کی تعبیر چاہی، اب یہ موقعہ تھا حضرتِ یوسف علیہ

السلام کیلئے دعوت وتبلیغ کا اور پیغمبر کی شان یہ ہوتی ہے کہ جب انہیں موقع مل جاتا ہے تو وہ دعوت دیتے ہیں اور اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہیں، تو جب ان دونوں نے حضرت یوسف علیہ السلام سے تعبیر پوچھی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر بتلانے سے پہلے توحید کی دعوت پیش کی اور پہلے تو ان سے یہ فرمایا کہ تمہارے پاس روزانہ جو کھانا آتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں اس کا حال بتلا دیتا ہوں کہ ٹفن میں کھانے کی کیا کیا چیزیں ہوں گی، گویا بطورِ اعتماد اپنے اس جوہر اور کمال کا تذکرہ کیا تاکہ اُن کو تعبیر پر پورا اعتماد ہو، پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں توحید کی دعوت دی اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر اس کوشش میں رہتے ہیں کہ انہیں کوئی موقع مل جائے تاکہ وہ قوم کے سامنے دعوت پیش کریں اور قوم کو توحید کی طرف بلائیں خیر آپ نے ان کے سامنے حق تعالیٰ کی وحدانیت کی دعوت پیش کی اور یہ فرمایا کہ: میں نے اس قوم کو شروع ہی سے چھوڑ رکھا ہے جو شرک کرتی ہے میں نے ان لوگوں کا اتباع کیا ہے جو ملتِ ابراہیمی پر قائم تھے یعنی اسمٰعیلؑ اسحٰقؑ یعقوبؑ وغیرہ وغیرہ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی اولاً آپ نے سوال یوں فرمایا کہ ’’ ء ارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القھار ‘‘(یوسف ،آیت: ۳۹) بہت سارے معبود بہتر ہیں یا صرف ایک ہی معبود جو قہّار اور سب پر غالب آجانے والا ہے، تو پہلے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کو توحید سمجھائی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سارے دین کا دار ومدار توحید پر ہے اور اگر آدمی توحید کو سمجھ لے تو اس دنیا کی ساری مشکلات اس کے لئے سہل ہو جائیں۔

توحید کی حقیقت ایک مثال کے ذریعہ

اسی لئے حضرت جی مولانا یوسف صاحبؒ مثال دیتے تھے کہ ایک آدمی نے دیکھا کہ ایک تالاب ہے اور تالاب میں سورج دکھائی دے رہا ہے یعنی اس کا عکس دکھلائی

دے رہا ہے، دوسری دفعہ دیکھا کہ اس میں چاند دکھائی دیتا ہے تو وہ یہ سمجھا کہ چاند سورج تالاب سے نکل رہے ہیں اس نے ساتھیوں سے کہا کہ میں اسے نکالوں گا اور اس پر قبضہ کرلوں گا، اب تدبیر یہ کی کہ ایک بالٹی لاکر اس تالاب کو خالی کرنا شروع کیا اور پانی نکالنے لگا اور جب سارا پانی نکال چکا تو اس نے دیکھا کہ نیچے تو کیچڑ ہے اسکے سوا کچھ بھی نہیں، تو اس کو بڑی پریشانی لاحق ہوئی، اس بیوقوف کو یہ پتہ نہیں چلا کہ وہ جو اندر دکھلائی دے رہا تھا وہ تو صرف عکس تھا حقیقی چاند اور حقیقی سورج اس کے اندر نہیں تھے حقیقی چاند اور حقیقی سورج اس کے اندر کیسے آسکتے تھے ظاہر بات ہے کہ سورج جو زمین سے نو کروڑ گنا بڑا ہے وہ تالاب میں کیسے آ سکتا تھا سورج کے سامنے تالاب کی بساط کیا ہے؟ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے ایک آدمی آئینہ اپنے ہاتھ میں لے اور سورج کے سامنے کرے تو سورج اس میں دکھلائی دے گا، چاند کے سامنے کرے تو وہ اس میں دکھلائی دے گا، تو کسی چیز کے عکس کا کسی چیز میں آجانا اور چیز ہے اور کسی چیز کی ذات کا آجانا وہ اور چیز ہے اور جو لوگ حقیقتاً حلول کے قائل ہیں کہ وہ چیز اس کے اندر گھسی ہوئی ہے وہ پرلے درجہ کی نادانی ہے، تو اہلِ اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ حق تعالیٰ کے کمالات کا عکس ہے، حقیقی کمال ذاتِ باری میں ہے کہ حق تعالیٰ حقیقی کمال کو لئے ہوئے ہیں اور کرنے دھرنے والی ذات بس خدا تعالی کی ہے۔ اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ حق تعالیٰ کے ارادے اور مشیت سے ہو رہا ہے۔

دنیا میں بہت سے ایسے نادان پیدا ہوئے ہیں
جنہوں نے جہاں نفع دیکھا وہاں گردن جھکادی

ہمارے یہاں دھولیہ میں ایک مارواڑی کے گھر کے سامنے ایک سادھو آیا بالکل ننگا اور کالا کلوٹا، سنگھوڑا بھی اس سے پریشان ہوجائے بالکل سیاہ فام اور ساتھ میں

چودہ طبق روشن یعنی جسم پر کسی قسم کا کپڑا نہیں تو مارواڑی کی حسین وجمیل عورتیں نکلیں اور انہوں نے اس کا طواف کیا، طواف کرنے کے بعد اس کو اپنے گھر پر لے گئیں اور گھر لے جانے کے بعد چارپائی پر اس کو بٹھایا ہمارا بچپن تھا دیکھنے تو ہم بھی نہیں گئے تھے لیکن ہم نے سنا کہ بٹھانے کے بعد چارپائی کے نیچے طشتری رکھی اور اس کے عضو مخصوص کو دھویا اور پھر سب نے اس کو تبرک سمجھ کر پیا'' لا حول ولا قوۃ الا باللہ، ،اب آپ سوچئے کہ یہ خرابی کہاں سے آئی، انسانوں کا یہ جو تصور ہے کہ جہاں سے نفع ہو وہاں گردن جھکا دینا چاہئے اس سے ایک طبقہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ انسان کے وجود کا ذریعہ یہ عضو مخصوص ہے اس سے توالد وتناسل کا سلسلہ چلتا ہے لہٰذا انہوں نے اس کی عبادت (پوجا پاٹ) شروع کردی، کسی نے پانی کو مفید سمجھا تو اس کی عبادت (پوجا پاٹ) شروع کردی، اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے ایک آدمی نے شادی کی اور اسنے اپنی بیوی کیلئے ایک مکان بنایا اور اس میں روشنی کا انتظام کیا اور دوسری ضروریات کی چیزیں مہیا کیں اب بیوی کا کام یہ ہے کہ اس کا تعلق صرف شوہر سے رہے، نہ یہ کہ پانی والے سے اور روشنی والے سے تعلق قائم کرلے، اگر اس نے ایسا کیا اور شوہر کو پتہ چل گیا تو یقیناً اس کو غصہ آئے گا اور وہ مکان کو بھی منہدم کردے گا اور بیوی کو بھی طلاق دیدے گا۔

یہ ساراجہاں انسانوں کیلئے ہے

اسی طریقہ سے اس دنیا کا سارا نظام رب العلمین نے انسانوں کیلئے بطورِ خادم بنایا ہے، اگر پانی معبود ہے تو آپ اس سے استنجاء کیوں کرتے ہیں؟ سبحان اللہ، اس معبود پر قربان جایئے جس سے آپ استنجاء کرتے ہیں، زمانۂ جاہلیت میں لوگ مٹی کا ڈھیلا اپنے ساتھ لے جاتے تھے، مٹی کا ڈھیلا ساتھ میں ہے اور اس کی عبادت ہورہی ہے اور جب قضاء حاجت کی اور پانی نہ ہوا تو اس سے استنجاء کرلیا (امداد الباری ج۲ ص۴۳۴)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب عقل بٹ رہی تھی تو اس قسم کے لوگ چھلنی لیکر پہنچے تھے۔

غیر توحید پرست پہلے درجہ کا احمق ہے

اسی لئے جو توحید پرست نہیں ہے اس کے احمق ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے وہ بڑا ہی بے وقوف ہے چاہے ظاہر میں وہ کتنا ہی عقلمند کیوں نہ ہو اور جس نے ایک ذاتِ عالی کو مان لیا اور ایک خدا تعالی سے ہونے کا یقین رکھتا ہے وہ چاہے دیہات کا رہنے والا ہو نہایت معمولی نظر آتا ہو لیکن وہ بڑے بڑے سلاطین سے بہتر ہے۔

کاش! ہم نجاست کے کیڑے ہوتے

امام غزالیؒ لکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد جب مشرکین کو عذاب شروع ہوگا تو بڑے بڑے سلاطین تمنا کریں گے کہ کاش! ہم نجاست کے کیڑے ہوتے، کاش ہم کتے اور خنزیر ہوتے تو یہ تکلیف ختم ہو جاتی، بہر حال توحید بہت بڑی چیز ہے، صرف ایک خدا تعالی سے ہونے کا یقین آدمی میں پیدا ہو جائے یہ بہت بڑی دولت ہے۔

اللہ کے بندے! تو نے تو ہماری آنکھیں کھولدیں

قحط کا زمانہ تھا ایک امیر صاحب اپنے گھر کے باہر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے پاس کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا اور وہاں قریب سے ایک غلام گزر رہا تھا جس کے ہاتھ میں کچھ اناج کے دانے تھے وہ پھانکتا ہوا بہت خوش خوش جا رہا تھا اور ساری دنیا پریشان تھی انہوں نے اس کو بلایا اور کہا کہ قحط ہے اور لوگ اتنے پریشان ہیں اور تم بڑے خوش خوش جا رہے ہو اس کی کیا وجہ ہے؟ تو اس نے کہا کہ میں جس کا غلام ہوں اس آقا کے پاس دس گاؤں ہیں اس لئے مجھے اطمینان ہے، اس نے کہا اے اللہ کے بندے! تو نے تو ہماری آنکھیں ہی کھولدیں اس لئے کہ تم جس آقا کے غلام ہو اگر اس کے قبضہ میں دس گاؤں ہیں تو ہم جس آقا کے غلام اور بندے ہیں یعنی حق تعالی ان کے قبضہ میں تو

آسمان وزمین کے خزانے ہیں، تو ہم کیوں پریشان ہوں اور مطمئن نہ ہوں (خطبات حکیم الامت ج۶ص۲۰۰) تو توحید سے آدمی کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

غلام کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ ایک آدمی نے بازار سے غلام خریدا اور خریدنے کے بعد گھر لایا، پھر اس سے پوچھا کہ بھائی بتاؤ! تم کیا کھاؤ گے ؟ اس نے کہا تم جو کھلادو، پھر پوچھا یہ بہت سارے کمرے بنے ہیں تم کہاں رہو گے؟ اس نے کہا کہ جہاں آپ مجھے ٹھہرادیں، پھر پوچھا کہ تم کپڑے کیسے پہنو گے؟ اس نے کہا جیسے آپ پہنادیں، آقا نے کہا تم کیسے آدمی ہو نہ تمہیں کوئی کھانے کا شوق ہے نہ رہنے کا شوق ہے، نہ کوئی خاص قسم کے کپڑے کا شوق ہے تو اس نے کہا میں تو غلام ہوں اور کیا غلام کی بھی کوئی مرضی ہوتی ہے اگر میری اپنی کوئی مرضی ہوتی تو میں غلام کیوں ہوتا؟ حقیقت یہ ہے کہ غلام کی کوئی مرضی نہیں ہوتی، جو آقا کی مرضی وہی غلام کی مرضی ہوتی ہے اور جو آقا کا حکم ہے وہی غلام کی مرضی ہے (تسہیل المواعظ ج۱ص ۴۲۵، خطبات حکیم الاسلام ج۳ص۵۸۹) یہ سن کر آقا نے کہا کہ تم نے تو ہماری آنکھیں کھولدیں ہم نے تم کو چند روپیوں میں چند دن کے لئے خریدا ہے اس کے بعد ہم دونوں ختم ہوجانے والے ہیں پھر بھی تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم تو اپنی کوئی رائے نہیں رکھتے جب کہ ہم تو حق تعالیٰ کے حقیقی غلام ہیں ہم کو بدرجہ اولی چاہیئے کہ ہم اس کے حکم کے سامنے اپنی رائے کو فنا کردیں اور مٹادیں تمہارے ایک جملہ نے تو ہماری حالت ہی بدل دی اور خدا تعالی سے ہمارا تعلق صحیح کردیا، تو میں یہ عرض کررہا تھا کہ سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل میں بھی تبلیغ کا کام کیا۔

سورج اور پیغمبر کا مزاج

اب دیکھئے! جب صبح میں سورج نکلتا ہے تو اگر اس کو کہیں ذرا سا سوراخ بھی مل جائے تو وہاں بھی اپنی روشنی پہنچا دے گا، حتیٰ کہ چھت میں ذرا سا سوراخ ہو تب بھی وہاں سے سورج کی روشنی آئے گی سورج کا مزاج یہ ہے کہ اس کو اپنی روشنی اور کرنیں کسی بھی مقام پر پہنچانے اور بھیجنے کا موقع ملے گا تو وہ فوراً وہاں اپنی روشنی اور کرنیں پہنچا دے گا تاکہ وہاں تاریکی ختم ہو جائے، یہ اس کا مزاج ہے اور پیغمبر کا بھی یہی مزاج ہے کہ انہیں ذرا سا بھی موقع دعوت کا مل جاتا ہے تو وہ دعوت کی بات کرتے ہیں۔

ایک غلام دو آقا کو راضی نہیں رکھ سکتا

حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے تعبیر بتلانے سے پہلے دعوت کا بہترین موقع تھا اس لئے کہ وہ اپنی ضرورت لیکر آئے تھے پس آپ نے ان کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی اور فرمایا کہ ایک زبردست خدا بہتر ہے یا ہزاروں خدا؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ: ایک غلام دو آقا کو خوش نہیں رکھ سکتا، اس لئے کہ اگر وہ ایک کو راضی کرے گا اور دوسرے کو ضرورت ہوئی تو وہ ناراض ہو جائے گا۔

ایک احمق کی بوکھلاہٹ

اسی لئے تو ایک مرد چار بیویاں رکھ سکتا ہے لیکن ایک بیوی چار مرد نہیں رکھ سکتی، ہندوستان میں ایک گدھا تھا عبدالحمید دلوائی اس کو گدھا ہی کہنا چاہئے اس نے مالیگاؤں میں ایک تقریر میں کہا کہ میں اعلان کرتا ہوں کہ جس طرح ایک مرد چار بیویاں رکھ سکتا ہے اسی طرح ایک عورت بھی چار مرد رکھ سکتی ہے اور کبھی کبھی اللہ تعالی فوری پکڑ فرماتے ہیں جب اس نے کہا کہ میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ جس طرح ایک مرد چار بیویاں رکھ سکتا ہے اسی طرح ایک عورت بھی چار مرد رکھ سکتی ہے اس کا یہ کہنا تھا کہ ایک

جوان کھڑ ہوا اور یہ کہا کہ آپ لوگ گواہ رہیں میں عبدالحمید صاحب کی بیوی سے شادی کرنے کیلئے تیار ہوں، ادھر سے دوسرا کھڑا ہوا اور ادھر سے تیسرا کھڑا ہوا اور کہا کہ تین ہم ہوئے اور چوتھے آپ، ہم چاروں مل کر آپ کی بیوی کو استعمال کریں گے، یہ سن کر وہ بوکھلا گیا (سبق آموز بیانات ص۸۹) تو یہ بات فطرت کے خلاف ہے۔

امام ایک ہی ہوگا

اسی لئے آپ دیکھتے ہیں کہ نماز کی جماعت میں افراد جتنے بھی زیادہ ہوں، چاہے تہہ خانہ بھر جائے، جماعت خانہ بھر جائے اوپر کا ہال بھر جائے کیا آپ نے کبھی یہ سنا کہ لوگ بہت زیادہ ہیں تو دو امام ہونے چاہئے، مکبر تو زیادہ ہوتے ہیں جس کو بعض لوگ متنکبر بھی کہہ دیتے ہیں مکبر یعنی تکبیر کہنے والا وہ تو ایک سے زیادہ ہوتے ہیں لیکن امام ایک ہی ہوگا، کیونکہ اس کے اندر مقتدا ہونے کی حیثیت ہے اور مقتدا ایک ہی ہوتا ہے، امت کا نبی ایک، بیوی کا شوہر ایک، جماعت کا امام ایک اسی لئے ایک مملکت کے اندر بادشاہ ایک ہی ہوگا دو بادشاہ نہیں ہوں گے، تو غرض یہ کہ توحید انسانوں کا فطری مزاج ہے۔

توحید انسان کا مزاج ہے

شیخ ابوبکر جصاص رازیؒ نے احکام القرآن میں بڑی اچھی بات لکھی ہے، فرماتے ہیں کہ: توحید انسان کا مزاج ہے اور ہمیشہ انسان کے ساتھ توحید ہے، دیکھو اس کو میں ایک مثال سے سمجھاؤں مثلاً آپ کی دُکان ہے اور اس دوکان میں مختلف سامان مختلف جگہوں پر رکھے ہوئے ہیں اب آپ کہیں تشریف لے جارہے ہیں تو آپ چاہتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے بکسوں کو ایک جگہ کردیں اور اگر وہ ایک بکس میں آسکتے ہوں تو اس میں کردیں اور سات جگہ پر سات کپڑے لٹکے ہوئے ہوں تو آپ چاہتے ہیں کہ ان کو

ایک جگہ کردیں اور اگر کوئی بڑا بکس ہو تو اس میں رکھدیں گویا آپ چاہتے ہیں کہ کثرت وحدت کی طرف چلے، اچھا! اب دوکان میں جو مال سامان تھا آپ نے اس کو مرتب کرنے کے بعد اس کو تالا لگا دیا اور تالا لگانے کے بعد چابی اپنے جیب میں رکھ لی تو کنجی اور چابی کی حیثیت توحید کی ہے، دیکھئے آپ ساری دکان لیکر ہر جگہ نہیں جا سکتے، ہاں! آپ چابی اپنے ساتھ لیکر گھوم پھر سکتے ہیں جس سے آپ پوری دُکان سے انتفاع کر سکتے ہیں، چابی ایک ایسی چیز ہے کہ وہ ہر وقت آپ کے ساتھ رہ سکتی ہے، تو اسلام کی ستر (۷۰) سے اوپر جو شاخیں ہیں ان کو ہر وقت آپ انجام نہیں دے سکتے لیکن ان سے فائدہ اٹھانے کی کنجی جو توحید ہے وہ ہر وقت آپ کے ساتھ ہے، آپ جاگتے ہیں تب بھی آپ موحّد ہیں، آپ سو رہے ہیں تب بھی آپ موحد ہے، یہ توحید ہر وقت آدمی کے ساتھ ہے، یہ نہیں کہ آپ ہوائی جہاز میں بیٹھیں تو توحید چلی جائے اور آپ بیت الخلاء گئے تو توحید رخصت ہو جائے ایسا نہیں ہوتا بلکہ توحید ہر وقت آدمی کے ساتھ رہتی ہے۔

زنا کاری بدترین عمل ہے

البتہ حدیث شریف میں نبیٔ کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: زانی جب زنا کرتا ہے تو اس حالت میں وہ مؤمن نہیں رہتا اور شرابی جب شراب پیتا ہے تو اس حالت میں وہ مؤمن نہیں رہتا (مسلم شریف ۱/۵۶) اور چور جب چوری کرتا ہے اس حالت میں وہ مؤمن نہیں رہتا (معارف الحدیث ج ۱ ص ۱۰۱ بحوالہ بخاری و مسلم) اس وقت مؤمن نہیں رہتا ہے اس کا کیا مطلب؟ اس کے بیسیوں مطلب محدثین نے بیان کئے ہیں ان کو اگر ہم چھیڑیں تو مغرب کی اذان ہو جائے گی اور یہ بھی سن لو کہ جب زمین پر زنا ہوتا ہے تو زمین پروردگارِ عالم سے کہتی ہے کہ آپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس نافرمان بندے کو اپنے اندر ہڑپ کرلوں تو غیب سے بتایا جاتا ہے کہ صبر کر وہ تجھی میں آنے والا ہے (اللہ تعالی بندوں

سے کتنی محبت کرتے ہیں، بحوالہ فرشتوں کے عجیب وغریب حالات) تو زمین بھی زنا کرنے والے سے ناراض ہوتی ہے اور جہاں معصیت ہوتی ہے وہاں ظلمت ہوتی ہے۔

جس جگہ معصیت ہوتی ہے وہاں ظلمت چھا جاتی ہے

جیسے آپ کسی کمرے میں چراغ جلادیں تو اس کے دھوئیں سے اس کمرے کے درودیوار سیاہ ہوجائیں گے، ایسے ہی جہاں معصیت ہوتی ہے اس کے درودیوار پر ظلمت چھا جاتی ہے اگر آدمی کی آنکھ ہو تو وہ اسے محسوس کرسکتا ہے، ایک مقام پر ایک صاحب کشف بزرگ تھے وہ ایک جگہ گئے جہاں کسی نوجوان نے زنا کیا تھا اور ان کو پتہ نہیں تھا لیکن انہوں نے گھر میں قدم رکھتے ہی کہا کہ اس مقام پر زنا ہوا ہے اس لئے کہ ظلمتیں درودیوار پر چھائی ہوئی تھیں جیسے برف گرے تو فضا میں ٹھنڈک پھیلتی ہے ایسے ہی جہاں اللہ تعالیٰ کا قہر برستا ہے اس کے بھی آثار ظاہر ہوتے ہیں۔

کمالِ ایمان کی نفی ہے

تو حضرت ابو ہریرۃؓ فرماتے ہیں کہ: ایمان زانی کے دل سے نکل کر اس کے اوپر سائبان کی طرح چھا جاتا ہے۔ (مشکوۃ حدیث نمبر ۵۳ بحوالہ ترمذی وابوداؤد) گویا قہرِ خداوندی سے اس کی حفاظت کررہا ہے کہ خدا تعالیٰ کا قہر کہیں اس کو ہلاک نہ کردے تو کامل مؤمن اس حالت میں نہیں رہتا گویا زنا سے اس کے ایمان میں نقصان پیدا ہوجاتا ہے اس حدیث میں کمالِ ایمان کی نفی ہے (مظاہر حق) اس کی اور بھی بہت ساری توجیہات ہیں۔

گناہ کی بنیاد یقین کی کمزوری ہے

حافظ ابنِ قیمؒ نے لکھا ہے کہ: گناہ کی بنیاد یقین کی کمزوری ہے اور آپ نے مثال کیسی اچھی دی فرمایا کہ: مثلاً کوئی آدمی آگ جلائے اور وہ آدمی صاحبِ حیثیت بھی ہو پاور بھی رکھتا ہو اب وہ کسی سے کہے کہ اگر تم نے فلاں کام کیا تو ہم اس آگ میں تم کو

جلا دیں گے، میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ جس شخص کو اس کام کے کرنے پر جلائے جانے کا یقین ہو کیا وہ اس کام کو انجام دے گا؟ ہرگز نہیں، تو حافظ ابنِ قیمؒ لکھتے ہیں کہ معصیت کی بنیاد حقیقۃً ذہول ہے ورنہ اگر آدمی کا یقین قوی سے قوی تر ہو جائے تو آدمی ہرگز معصیت نہیں کرسکتا، ہاں! کبھی ذہول ہو جاتا ہے ورنہ یہ نہیں کہ مومن کو یقین نہیں ہوتا چونکہ شیطان یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں گے اس لئے وہ معصیت کر بیٹھتا ہے، ورنہ حق یہ ہے کہ اگر یقین کی بنیادیں مضبوط ہوں تو آدمی معصیت کا اقدام نہیں کرسکتا۔

جیل خانہ دعوت کا میدان بن گیا

بہرحال حضرتِ یوسف علیہ السلام نے ان کو توحید کی دعوت دی، حضرت یوسف علیہ السلام کی برکت سے وہ جیل خانہ اچھا خاصہ مدرسہ اور خانقاہ اور اچھا خاصہ دعوت کا میدان بن گیا۔

لوگ مولویوں کا بھی امتحان لیتے ہیں

حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کے بعد خواب کی تعبیر دی اور یہ کلمات ارشاد فرمائے کہ جس نے یہ دیکھا کہ میں بادشاہ کو شراب پلا رہا ہوں وہ تو رِہا ہو جائے گا اور دوسرا مارا جائے گا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تعبیر سن کر یہ کہا کہ ہم نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا بس ایسے ہی ایک بات کہی تھی لوگ مولوی کو بھی آزماتے ہیں تاکہ دیکھیں مولوی صاحب کتنے پانی میں ہیں، خاص طور سے دیہات والے جن کو بہشتی زیور کے چند مسئلے یاد ہوتے ہیں پھر جب مولوی صاحب مسئلہ بتاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ فلاں مولوی صاحب تو یوں کہتے تھے اور آپ یوں کہہ رہے ہیں تو لوگ چار لفظ پڑھ کر مولویوں کا امتحان لیتے ہیں اور بیچارے مولوی لوگ بھی امتحان

دیتے رہتے ہیں، ان کی بھی تواضع ہے کہ وہ امتحان دیتے رہتے ہیں۔

ایک لطیفہ

میں آپ کو ایک لطیفہ سناؤں ایک سانپ ایک بزرگ کے ہاتھ پر بیعت ہوا اس کو پیر صاحب نے کہا کہ کسی کو ڈسنا مت، تھوڑے دن کے بعد پیر صاحب کا ادھر سے گذر ہوا تو دیکھا کہ سانپ بالکل دبلا پتلا ہوگیا ہے پوچھا کہ تمہارا یہ کیا حال ہے؟ تو کہا کہ حضرت! میں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی کہ کسی کو ڈسوں گا نہیں، کاٹوں گا نہیں جنگل کے جانوروں کو اس بات کا پتہ چل گیا تو اب ہر جانور مجھ کو کوستا ہے، تو پیر صاحب نے کہا کہ میں نے کاٹنے اور ڈسنے سے منع کیا تھا پھنکارنے سے کہاں منع کیا تھا صرف پھوں پھوں تو کرنا چاہئے تھا تا کہ تمہاری ہیبت تو محفوظ رہے (ملفوظات حکیم الامت حصہ ہشتم ص ۳۶۰) آپ لوگ کچھ سمجھ رہے ہیں، یہ اشارات کی دنیا ہے، ایک صاحب ایک شخص کے پاس گئے وہ اپنی مٹھی بند کئے ہوئے تھے انہوں نے کہا کہ بتاؤ میری مٹھی میں کیا ہے اگر آپ بتادیں تو دس کے دس بادام آپ کو دیدوں گا، اب وہ سوچ رہے ہیں، بہت دیر سوچنے کے بعد کہا کہ آپ کی مٹھی میں قلم ہے، ظاہر ہے کہ ان پر علم کا کتنا غلبہ ہوگا کہ قلم ہی کی طرف ان کا دھیان گیا تو بعض ایسے بھی ہوتے ہیں۔

ماحول انسان خود بناتا ہے

تو بات اس پر چل رہی تھی کہ سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام سے انہوں نے کہا کہ حضرت! کوئی خواب ہم نے نہیں دیکھا تھا تو آپ نے فرمایا کہ: ’’قضی الامر الذی فیہ تستفتین ‘‘ جس امر کے بارے میں تم پوچھ رہے تھے وہ تو طے پاچکا ہے وہ تو ہونا ہی ہے اس کے بعد آپ کو جس کی نجات کی امید تھی اس سے کہا کہ ’’ اذکرنی عندربک ‘‘(یوسف ،آیت: ۴۲) بادشاہ سے میرا ذکر کرنا، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ’’فانسہ

الشیطن ذکر ربہ‘‘ (یوسف ،آیت: ۴۲) شیطان نے اس کو اپنے آقا سے ذکر کرنا ہی بھلا دیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو ایک مدت تک جیل میں رہنا پڑا ،اس سے معلوم ہوا کہ ماحول انسان خود بناتا ہے لوگ کہتے ہیں کہ ماحول ٹھیک نہیں یہ درست نہیں ماحول تو بنایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ کو جو ماحول دیا گیا وہ سب سے بدتر ماحول تھا اتنا گیا گذرا ماحول کہ اس وقت کی دو بڑی طاقتیں قیصر و کسریٰ بھی ادھر رخ نہیں کرتی تھیں وہ کہتی تھیں کہ ان پر قابو پا کر ہم کیا کریں گے؟ وہ تو عاجز کرنے والی قوم ہے، اتنے گئے گذرے تاریک ماحول میں آپ ﷺ نے تبلیغ کا کام کیا، تاکہ کوئی داعی یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ اب ماحول اچھا نہیں ہے، تو نبیٔ کریم ﷺ کو جو ماحول دیا گیا وہ بڑا اخطرناک قسم کا ماحول تھا ،تو حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل خانہ میں دعوت دی داعی جہاں پہنچتا ہے وہ دعوت کا کام کرتا ہے جیسے ہمارے تبلیغی بھائی ان پر ایک غلبہ اور ایک دھن ہوتی ہے وہ جہاں پہنچتے ہیں دعوت کی بات کرتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ ان کی یہ دھن قابلِ تعریف ہے میں اس کو بہت پسند کرتا ہوں ویسے ہر کام میں بہت سی کمزوریاں بھی ہوتی ہیں لیکن یہ دھن ان کی قابلِ تعریف ہے، گرمی ہو، سردی ہو، بارش ہو، کڑکی ہو گھر کے حالات ٹھیک نہ ہوں کچھ بھی ہو بس دعوت کا کام کرنا ہے، یہ جو اس وقت اعلان کیا گیا ہے کہ ہم سب کی کامیابی اللہ تعالی اور رسول ﷺ کے فرمان میں ہے، تو واقعہ یہ ہے کہ اس کے بغیر چھٹکارا نہیں۔

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمہ اللہ کا ایک قیمتی ملفوظ

مگر ایک بات بہت پتہ کی سن لیں ’’یـافتن‘‘ ایک فارسی لفظ ہے جس کے معنی ہیں پانا، اسی سے ایک لفظ ہے’’ یـابی ،،تو حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ ’’کامیابی‘‘ میں بھی ’’کام‘‘ پہلے ہے ’’یابی‘‘ بعد میں ہے آپ لوگوں کے کچھ پلّے

پڑ رہا ہے لفظِ ’’کامیابی‘‘ میں ’’کام‘‘ پہلے ہے اور ’’یابی‘‘ بعد میں ہے، اسی کو خواجہ صاحب فرماتے تھے کہ ؎

کامیابی تو کام سے ہوگی نہ کہ حسن کلام سے ہوگی
ذکر کے التزام سے ہوگی فکر کے اہتمام سے ہوگی

بہر حال ہم کو دین کی فکر کرنا ہوگی، ذکر سے دل کو منور کرنا ہوگا، خالی (صرف) بات سے کام نہیں چلے گا، آج اس بات کی بہت ضرورت ہے۔

اہلِ اسلام کے تین دور گذرے ہیں

اسی لئے جو قومیں دنیا میں کمزور ہیں وہ صرف اس لئے کہ وہ باتوں پر اکتفاء کئے ہوئے ہیں، حضرت مولانا عبد الشکور لکھنویؒ فرماتے تھے کہ: اہلِ اسلام کے تین دور گذرے ہیں، ایک دور وہ تھا کہ لوگ بولتے کم تھے کام بہت زیادہ کرتے تھے وہ دور تھا سلف کا، صحابہ کا اور تابعین کا، دوسرا دور وہ آیا کہ بولتے بھی تھے اور کام بھی کرتے تھے، زبان بھی تھی، عمل بھی تھا اور فرماتے تھے کہ: بدنصیبی سے یہ تیسرا دور آیا ہے کہ بولنا زیادہ ہے کام ختم، کہ بات ہے عمل نہیں۔

امت کی جان نکل چکی ہے اس لئے صرف بول رہ گیا ہے

ایک دفعہ الٰہ آباد میں ہمارے حضرتؒ نے عجیب لطیفہ سنایا فرمایا کہ: ایک مرتبہ میں فجر کی نماز پڑھ کر سائیکل رکشہ میں تفریح کے لئے گیا تو زور سے آواز ہوئی معلوم ہوا کہ پنکچر ہوا سائیکل والا گیا دُکان پر اور جا کر اس کو سی کر واپس لایا اور حضرت واپس اپنی خانقاہ تشریف لائے اشراق کی نماز پڑھی اور اسکے بعد مجلس ہوئی اس میں جو لطیفہ سنایا وہ سننے کے لائق ہے فرمایا کہ: وہ جو آواز ہوئی تو میں نے پوچھا کہ یہ آواز کیسی ہے؟ تو بتایا کہ ٹائر میں جو ہوا تھی پنکچر ہونے کی وجہ سے وہ نکل گئی، اب حضرت نے اس سے جو نتیجہ نکالا

وہ سننے کے لائق ہے، فرمایا کہ: جب کسی چیز کی ہوا نکلتی ہے تو اسوقت آواز ہوتی ہے چونکہ امت کی ہوا نکل چکی ہے اور امت کی جان نکل چکی ہے اس لئے صرف بول رہ گیا ہے عملی حیثیت ان کی کمزور ہوگئی، حضرتؒ نے کتنا زبردست نتیجہ اخذ کیا ہے، تو ہمیں ضرورت ہے اس بات کی کہ عملی کوشش کریں، جدوجہد کریں، عمل کی طرف دھیان دیں لہٰذا دعوت کی اہمیت، اس کے نتائج اور اس کے فوائد سے انکار نہیں۔

اللہ تعالی تک پہنچنے کی جتنی راہیں خدا تعالی نے بتائی ہیں ان میں ایک راہ یہ بھی ہے

اور میں تو کہا کرتا ہوں کہ ان بزرگوں کو اللہ تعالی جزائے خیر دے بہت ہلکا اور سہل سودا ہے، جس کے جتنے جتنے تقاضے ہیں ان کو چھوڑ کر آدمی لگ سکتا ہے بوڑھا بھی لگ سکتا ہے تاجر بھی لگ سکتا ہے، آجر (ملازم) بھی لگ سکتا ہے، ظاہر ہے کہ ہر شخص تو مدرسہ میں دس بارہ سال نہیں لگا سکتا، اس لئے اس کام میں جتنا جس سے ہوسکے وہ لگے اور اپنے اندر حقیقت پیدا کرنے کی کوشش کرے اور اللہ تعالی تک پہنچنے کی جتنی راہیں خدا تعالی نے بتائی ہیں ان میں ایک راہ یہ بھی ہے، اخلاص کے ساتھ اگر آدمی کام کرے گا تو خدا تعالی کا قرب نصیب ہوگا اور انشاء اللہ وہ خود بھی جنت میں جائے گا اور اس کے واسطہ سے جن جن کو دین پہنچا ہے وہ بھی جنت میں جائیں گے، اللہ پاک ہمیں دین کی صحیح حقیقت سمجھنے کی توفیق نصیب فرمائیں اور دین کی دعوت کا صحیح جذبہ عطا فرمائیں تاکہ ہم کسی اور سے متأثر نہ ہوں، حضرت جی مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ: آدمی جس سے بات کرتا ہے یا تو وہ اس پر اثر ڈالے گا یا اس کا اثر قبول کرے گا، تو کوشش کرو کہ دینی اعتبار سے سامنے والے پر اثر ہو، اب بتایئے! کون کون اللہ تعالی کے راستہ میں جانا چاہتا ہے وہ اپنے نام لکھوانا شروع کریں۔

درس نمبر بائیس سے حاصل ہونے والی چھ اہم ہدایات

(۱) پیغمبر کو جب موقع مل جاتا ہے وہ قوم کے سامنے دعوت پیش کرتے ہیں۔

(۲) ایک خدا کو چھوڑ کر اوروں کو بھی خدا کے ساتھ عبادت میں شریک کرنا یہ خرابی یہاں سے شروع ہوئی کہ انسانوں نے جہاں سے نفع ہوتا ہوا دیکھا وہاں گردن جھکا دی، ایک طبقہ نے یہ سوچا کہ انسان کے وجود کا ذریعہ عضوِ مخصوص ہے اس سے توالد وتناسل کا سلسلہ چلتا ہے لہٰذا انہوں نے اس کی عبادت (پوجا پاٹ) شروع کر دی، کسی نے پانی کو مفید دیکھا اس کی عبادت (پوجا پاٹ) شروع کر دی، کسی نے آگ کو مفید سمجھا تو اسکی عبادت (پوجا پاٹ) شروع کر دی وغیرہ وغیرہ۔

(۳) کبھی کبھی اللہ تعالیٰ فوری پکڑ بھی فرماتے ہیں جیسے عبدالحمید دلوائی کی فرمائی جس کا قصہ اس درس میں موجود ہے۔

(۴) توحید انسان کا مزاج ہے اور ہمیشہ انسان کے ساتھ توحید لگی ہوئی ہے۔

(۵) زمین بھی زانی سے ناراض ہوتی ہے اور جہاں معصیت ہوتی ہے وہاں ظلمت ہوتی ہے۔

(۶) گناہ کی بنیاد یقین کی کمزوری ہے۔

درس نمبر (۲۳)

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم،امابعد!

فاعوذ بالله من الشیطن الرجیم ، بسم الله الرحمن الرحیم☆

ودخل معه السجن فتین قال احدهما انی ارٰنی اعصر خمرا وقال الاٰخر انی ارٰنی احمل فوق راسی خبزا تاکل الطیر منه نبئنا بتاویله انا نرٰک من من المحسنین ☆(یوسف ،آیت: ۳۶)

الدنیا سجن المؤمن

بزرگانِ محترم !کل یہ گفتگو چل رہی تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل خانہ جانے میں مصلحت سمجھی اور وہاں تشریف لے گئے وہاں جانے کے بعد انہوں نے اپنے شریفانہ برتاؤ سے لوگوں کے دلوں کو جیت لیا آپ بیماروں کی تیمارداری اور پریشانوں کی غمخواری کرتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال آپ نے ان دونوں کوخواب کی تعبیر دی اور جسکی رہائی ہونے والی تھی اس سے کہا کہ اپنے مولیٰ سے ہمارا ذکر کرنا لیکن شیطان نے اس کو بھلا دیا اور تقریباً بارہ سال حضرت یوسف علیہ السلام جیل میں رہے ہیں،حق یہ ہے کہ یہ دنیا خود ایک مستقل جیل خانہ ہے،حدیث شریف میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:''الدنیا سجن المؤمن وجنة الکافر''(ریاض الصالحین حدیث نمبر۴۷۰،مسلم شریف۴۰۸/۲) دنیا مؤمن کے حق میں قید خانہ ہے اور کافر کے حق میں جنت ہے،اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ جیل خانہ میں آدمی کا اپنا نظام نہیں چلتا جیل خانہ کا جودستور اور نظام ہوتا ہے اسی کے مطابق آدمی کو رہنا پڑتا ہے،اس لئے انسان کو بھی اس دنیائے قید خانہ میں حق تعالیٰ کی طرف سے جو دستور بھیجے گئے ہیں اسی کے مطابق زندگی گذارنا چاہئے آدمی اس کا مکلّف ہے،حتی کہ بعض

جیلوں میں اس کا اہتمام ہوتا ہے کہ قیدیوں کو خاص قسم کی وردی پہنائی جاتی ہے، وہاں آپ اپنا ذاتی لباس بھی نہیں پہن سکتے، اسی لئے اپنے بعض بزرگوں سے سنا ہے کہ اس عالم میں بھی مؤمن کے لئے دو چیزیں ہیں، ایک تو اس کی وردی ہے، دوسرے اس کی ڈیوٹی ہے جیسے پولیس والا کہ اگر وہ اپنی وردی نہ پہنے تو اس کے لئے پریشانی کھڑی ہوگی اسے برطرف کردیا جائے گا، گورمینٹ اسے برداشت نہیں کرے گی اور اگر وہ وردی تو پہن لے مگر سردی کے خوف سے گھر ہی میں بیٹھا رہے اور ڈیوٹی پر نہ جائے تو وہ بھی اس کے لئے پریشانی کی بات ہے کہ اسے برطرف کردیا جائے گا (مجالس خطیب الامت ص۲۱۶/۲۱۷) ہاں اگر وہ وردی بھی پہنے اور ڈیوٹی بھی انجام دے تو وہ صحیح معنی میں حکومت کا وفادار اور خیر خواہ سمجھا جائے گا، تو مسلمان کی ڈیوٹی تو اسلامی احکام ہیں کہ جس موقعہ پر جس کام کا حکم ہے آدمی اس کو انجام دے اور مسلمان کی وردی اسلامی لباس ہے وہ لباس جو شریعت کے خلاف نہ ہو ایسا لباس نہ ہو کہ جس میں شرمگاہ نظر آتی ہو اور اوباش اور فاسق قسم کے لوگوں جیسا لباس نہ ہو، اسی لئے فقہاء لکھتے ہیں کہ صالحین کا لباس اختیار کرنا مستحب اور پسندیدہ ہے (ملفوظات فقیہ الامت قسط ۵) حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ میں جو جادوگر آئے تھے ان کو جو ایمان کی توفیق نصیب ہوئی اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے لباس کو حضرت موسیٰؑ کے لباس سے تشابہ تھا (خطبات حکیم الامت ج۶ ص۴۰۰) اس سے معلوم ہوا کہ اگر صورت پسندیدہ ہو تو حق تعالیٰ اس میں حقیقت پیدا فرما دیتے ہیں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

بادشاہ کا خواب اور اس کی تعبیر

تو غرض یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل خانہ کو ترجیح دی اور ایک روایت کے مطابق تقریباً وہاں بارہ سال رہے (معارف القرآن ادریسی ج۴ ص ۱۲۷) اس

درمیان میں مصر کے بادشاہ نے ایک بڑا عجیب خواب دیکھا، اس نے یہ دیکھا کہ سات انتہائی تنگڑی موٹی اور فربہ گائیں ہیں اور انہیں سات دبلی گائیں کھا جاتی ہیں اور اس نے یہ بھی دیکھا کہ سات سرسبز وشاداب بالیاں ہیں اور سات انتہائی خشک بالیاں ہیں اور وہ سبز بالیوں کو کھا جاتی ہیں، اس خواب کو دیکھ کر بادشاہ کو تشویش لاحق ہوئی کہ یہ عجیب وغریب خواب ہے چنانچہ صبح اسنے اپنے درباریوں سے جن کے متعلق اسے یہ اندازہ تھا کہ وہ خواب کی تعبیر بتلائیں گے ان سے اپنے خواب کا تذکرہ کیا اور کہا: ’’افتونی فی رؤیای ان کنتم للرؤیا تعبرون ‘‘(یوسف، آیت: ۴۳) میرے اس خواب کی تعبیر دو اگر تم جانتے ہو، انہوں نے جو خواب سنا تو ان کے پلّے تو کچھ نہیں پڑا اور واقعہ یہ ہے کہ وہ حقیقی معبر نہیں تھے ایسے ہی ان کو معبر سمجھ لیا گیا تھا، قرآن کریم میں ہے ’’قــالــوا اضغــاث احــلام، ‘(یــوسف ،آیــت: ۴۴) انہوں نے کہا کہ یہ ایسے ہی خیالات کا ایک گٹھر ہے جیسے گھاس پھوس کا گٹھڑ ہوتا ہے اس میں واقعیت اور حقیقت نہیں ہے آپ اس کی وجہ سے کسی پریشانی میں نہ پڑیں اور اگر یہ واقعۃً خواب ہوتا تو ہم ضرور اس کی تعبیر دیتے اور ہم اس قسم کے خیالات کی تعبیر کو جاننے والے نہیں ہیں، جب اس خواب کا تذکرہ چل رہا تھا تو اللہ تعالیٰ کی شان کہ وہ شخص جو جیل خانہ میں رہ چکا تھا (ساقی) اور مجرم ہونے کے شبہ میں پکڑا گیا تھا اور بعد میں جس کی رہائی ہوگئی تھی اس کو یاد آیا کہ جیل خانہ میں یوسف صدیق موجود ہیں جو خواب کی تعبیر کے امام ہیں اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے کہ اس عالم میں کوئی چیز وجود میں لانا چاہتے ہیں تو اس کے اسباب پیدا فرماتے ہیں (معارف القرآن ادریسی ج ۴ص ۱۳۰) اسی لئے جو عارفین ہوتے ہیں وہ اس بات کو خوب سمجھتے ہیں میں نے آپ کو اس روز کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ خود آسمان سے آکر تو نہیں کہیں گے کہ میں یہ کرنا چاہتا ہوں، حق تعالیٰ کی سنت کی معرفت جسے ہو وہ یہ سمجھ سکتا ہے اور اسے اندازہ

ہوجاتا ہے کہ مشیت خداوندی کا رخ کس طرف ہے، تو یہ حق تعالیٰ کا ایک نظام ہے۔

مصائب آنے کی حکمتیں

اور یہ بھی ذہن میں رہے کہ انبیاء کرامؑ اللہ تعالیٰ کے خواص ہیں اور ان پر اس عالم میں بڑے حالات آئے، ذاتی طور پر بھی حالات آئے اور دعوت کے سلسلہ میں بھی بڑے حالات آئے، حضرتِ نوح علیہ السلام کے متعلق مشہور ہے کہ لوگ ان کو مارنا شروع کرتے اور اتنا مارتے اتنا مارتے کہ وہ بیہوش ہوجاتے اور قوم بیہوش ہوجانے کے بعد ان کو دور کسی جگہ ڈال آتی، حضرت ہوش میں آنے کے بعد پھر ان کو دعوت دینا شروع کرتے وہ پھر ان کا یہی حال کرتے اور بعض دفعہ چٹائی میں لپیٹ دیتے بعض دفعہ یہ شکل ہوتی کہ آپ پر اتنے پتھر پڑتے کہ آپ ان پتھروں میں ڈھک جاتے آپ کی زندگی باقی تھی اس لئے بچتے اور اللہ تعالی کا کرم تھا اس لئے آپ پھر سرگرم عمل ہوجاتے اور اپنا کام انجام دیتے (گلدستۂ تفاسیر ج۷ص۴۰۱/۴۰۲) حدیث پاک میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''اشد الناس بلاء الانبیاء، ثم الصالحون' (جواہرالاحادیث ص۹۷ بحوالہ کنز حدیث نمبر ۶۷۸۰) انسانوں میں سب سے زیادہ بلائیں اور مصیبتیں نبیوں پر آتی ہیں' ثم الامثل فالامثل '' پھر جو جتنا درجہ میں قریب ہوتا ہے اس پر اتنے حالات آنا شروع ہوتے ہیں اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس عالم میں جو مصائب انسانوں پر آتے ہیں وہ اسلئے تاکہ اس عالم میں انسانوں کا جی نہ لگے، اس لئے کہ جہاں آدمی رہتا ہو اور ہر شئ اس کی طبیعت کے موافق ہو تو اس کی طبیعت وہاں لگ جاتی ہے اور جب طبیعت کے خلاف حالات پیش آئیں گے تو اس کا دل وہاں نہیں لگے گا جیسے کسی شہری کو دیہات میں بھیج دیں تو اسے وہاں سنّاٹا اور قبرستان معلوم ہوگا اور اسے وہاں وحشت معلوم ہوگی اور کسی دیہاتی کو شہر میں لے آئیں تو وہ سمجھے گا کہ یہ اچھا خاصا میدان حشر برپا ہے اور وہ اپنے

مقام پر پہنچ کر ہی سکون محسوس کریگا تو آدمی جس چیز کا عادی ہو اس کے خلاف بات پیش آئے تو آدمی کو گرانی ہوتی ہے، تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس عالم کی ہر چیز آدمی کی طبیعت کے موافق نہیں ہے اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ بندے کی طبیعت دنیا سے نہ لگے، بندہ چاہتا ہے کہ ہر چیز طبیعت کے موافق ہو اور حکمتِ خداوندی اور اس کی شفقت کا تقاضہ یہ ہے کہ بندے کا دل اس دنیا سے لگنے نہ پائے، بہر حال بندہ پر دنیا میں حالات آتے ہیں وہ اس لئے تا کہ اس کا جی دنیا میں نہ لگنے پائے اور یہ کہ اس کے لئے ترقیٔ درجات کا سبب بھی ہو۔

اسی لئے علماء کرام نے لکھا ہے کہ مشقتوں میں مبتلا ہو جانے سے اور مصائب کا شکار ہو جانے سے علوم ومعارف کی بارش ہوتی ہے کہ مشقت سے قلب میں جلا پیدا ہوتا ہے اور جب قلب میں روشنی آئے گی تو پھر اس کے بعد نتیجۃً علوم وحقائق اس پر کھلنا شروع ہوں گے، پھر گویا اندر علم کا ایک منبع ہوگا اور باہر اس کے آثار ظاہر ہوں گے اور اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے آپ ایک حوض تیار کریں اور پائپ کا سسٹم لگا کر اس میں پانی پہنچا دیں اور ایک شکل یہ ہے کہ اتنی کھدائی کریں اتنی کھدائی کریں کہ اندر سے پانی خود اُبلنا شروع ہو جائے تو اب باہر سے پانی لانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اندر سے خود پانی اُبل رہا ہے، تو غرض یہ کہ پھر قلب کا یہ حال ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے اس سے علم پھوٹنے لگتا ہے اور اس کا براہِ راست غیب سے تعلق ہو جاتا ہے، انسان کے جسم میں حواس کے پانچ پائپ لائن لگے ہوئے ہیں، آنکھ، کان، ناک، زبان اور ہاتھ لیکن خارجی لائنوں سے جو علم آتا ہے اس کی کچھ حقیقت نہیں اُس علم کے سامنے جو اندر سے اُبلتا ہے اس لئے کہ اس کا تعلق عالم غیب سے ہوتا ہے، بہر حال انبیاء کرامؑ پر حالات آتے ہیں۔

تکلیف کا مدار شدتِ احساس پر ہے

اسی لئے نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا کہ مجھے خدا کی راہ میں جو تکلیفیں پہنچائی گئیں وہ کسی نبی کو نہیں پہنچائی گئیں (خطبات حکیم الاسلام ج ۴ ص ۴۸۹) اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ کی نبوت کے بعد کی زندگی ۲۳ سالہ ہے اوراس میں بھی مکی زندگی میں حالات زیادہ آئے ہیں اور مدنی زندگی میں حالات مکی زندگی سے کم آئے ہیں جب کہ پچھلے پیغمبروں کی عمریں دیکھو تو کوئی پانچ سو سال، کوئی نوسوسال کی عمر رکھتا ہے تو انہوں نے طویل طویل زمانہ تک مشقتیں برداشت کیں، تو ان کی مشکلات بظاہر زیادہ معلوم ہوتی ہیں بہ نسبت نبیٔ کریم ﷺ کے کہ آپ کی کل عمر ۶۳ سال ہوئی۔ ان میں سے پہلے ۴۰ سال تک تو آپ لوگوں کے منظورِ نظر تھے، پھر جب آپ نے حق بات کہی ہے تو لوگوں کا رنگ بدل گیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ پر مشکلات کا وقت کم گذرا ہے اور دوسرے نبیوں پر مشقتوں والے اوقات زیادہ گذرے ہیں اور حضور ﷺ فرما رہے ہیں کہ مجھے سب سے زیادہ تکلیفیں دی گئیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تکلیف کی بنیاد شدتِ تعلق اور شدتِ احساس پر ہوتی ہے، اسی لئے اگر آپ کے بدن میں کوئی چیز لگ جائے اور آپ کا احساس صحیح ہے تو آپ کو تکلیف ہوگی اور اگر آپ کا بدن سُن کر دیا جائے یا آپ کو بیہوش کر دیا جائے تو پھر کسی چیز کے چبھانے سے بلکہ کاٹنے سے بھی کچھ اثر نہیں ہوگا، تو مدارِ تکلیف شدتِ احساس پر ہے، تو آپ ﷺ کے قلب مبارک کے احساسات پچھلے انبیاء کرامؑ کے مقابلہ میں بہت قوی تھے نیز آپ ﷺ کو امت کے ساتھ جو شفقت اور لگاؤ تھا وہ بہت زیادہ تھا جس کی وجہ سے آپ بہت زیادہ بے چین رہتے تھے، حتی کہ قرآنِ کریم میں یہاں تک فرمایا گیا کہ ”لعلک باخع نفسک“ (کھف، آیت: ۶) شاید آپ اپنا گلا گھونٹ لیں گے، تو آپ

کے قلب اطہر میں اتنی زیادہ بیقراری اور بے چینی تھی اور حدیث پاک میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ میری مثال اور تمہاری مثال ایسی ہے جیسے آگ روشن کی گئی ہو اور پتنگے اس میں آکر گر رہے ہوں، تو گویا تم پتنگوں کی طرح آگ میں بے تحاشہ گرنا چاہتے ہو اور میں تمہیں کمر پکڑ پکڑ کر بچا رہا ہوں (مشکوۃ حدیث نمبر ۱۴۱ بحوالہ بخاری ومسلم) تو نبیٔ کریم ﷺ کا شدتِ احساس سبب بن گیا زیادہ تکلیفوں کا، چاہے تکلیفوں کا زمانہ پچھلے نبیوں کی بہ نسبت آپ ﷺ کا کم ہے۔

شدتِ احساس کے متعلق میں آپ کو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا ایک واقعہ سناؤں یہ وہ بزرگ ہیں جن کی خدمت میں حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلویؒ اکثر تشریف لے جاتے تھے اور حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کو ان سے عشق کا تعلق تھا، حضرت گنگوہیؒ ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند تشریف لائے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کا دورِ اہتمام تھا انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! چائے پیشِ خدمت کروں؟ حضرت نے فرمایا کہ شوق سے، حضرت گنگوہیؒ نے چائے پی کر فرمایا کہ: چائے میں کچّا پن معلوم ہوتا ہے، ان کو بڑا تعجب ہوا پھر دوبارہ چائے بنا کر حضرت کی خدمت میں پیش کی مگر اب کے بھی حضرت نے وہی بات فرمائی، چنانچہ انہوں نے تیسری مرتبہ چائے بنائی اور اب کہ غور کیا تو معلوم ہوا کہ چائے کی پیالی میں پانی کا جو معمولی اثر رہ جاتا ہے غالبًا اس کا احساس حضرت کو ہو رہا ہے چنانچہ تیسری مرتبہ انہوں نے پیالی کو اچھی طرح خشک کیا اور پھر اس میں چائے پیش کی تو حضرت نے فرمایا کہ: ہاں اب ٹھیک ہے، جب اولیاء اللہ کا احساس اتنا تیز ہوتا ہے تو اب آپ اندازہ لگایئے کہ حضور ﷺ کا احساس کتنا تیز ہوگا۔

مجھے اس پر ایک اور بزرگ کا واقعہ یاد آیا حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمہ اللہ

کے حالات میں ہے کہ حضرت جب دہلی کی جامع مسجد جاتے تھے تو پالکی کے پردے ڈالدیتے تھے اور فرماتے تھے کہ: دہلی کی دکانیں کچھ ٹیڑھی ہیں ان کو دیکھ کر سر میں درد ہوجاتا ہے، ایک مرتبہ صبح کے وقت حضرت کی آنکھوں میں سرخی تھی کسی نے پوچھا حضرت کیا بات ہے؟ فرمایا رات کو نیند نہیں آئی، نیند نہ آنے کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا کہ: جس لحاف کو میں نے اوڑھا تھا اس کی سلائی پر نظر پڑگئی جو کہ ٹیڑھی تھی تو اس سے سر میں درد شروع ہوگیا اور نیند نہیں آئی (حکایات اولیاء ص۲۴) تو ایسی بھی طبیعتیں ہوتی ہیں، مجھے یہ بتلانا ہے کہ اولاً آپ ﷺ کے قلب مبارک کا احساس بہت قوی تھا اور پھر امت کے ساتھ شفقت بہت زیادہ تھی اسی لئے آپ ﷺ چاہتے تھے کہ امت کسی طریقہ سے راہ پر آجائے، اسی لئے حجۃ الوداع کے خطبہ میں نبی کریم ﷺ نے جو کلمات ارشاد فرمائے ہیں وہ اس شان کے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ایک شفیق باپ ہیں اور باپ کی شفقتیں پیغمبر کی شفقتوں کے آگے کچھ نہیں ہیں، پیغمبر امت کے حق میں ماں باپ سے بھی زیادہ شفیق ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ نماز کی حالت میں ماں باپ بلائیں تو نماز توڑنے کا حکم نہیں ہے لیکن اگر پیغمبر آواز دے تو نماز توڑ دینی چاہئے، معلوم ہوا کہ نبی کا درجہ ماں باپ سے بہت زیادہ بلند ہے، ماں باپ اگر کہیں کہ تم فلاں مقام پر جاؤ اور اپنے آپ کو ہلاک کردو تو اس پر عمل کرنا جائز نہیں لیکن اگر نبی کہے تو اس کی گنجائش ہے۔

حضرت طلحہ بن براءؓ کا واقعہ

حضرت طلحہ بن براءؓ کا واقعہ ہے یہ ایک نوعمر صحابی ہیں وہ قبا میں رہتے تھے، جب نبی کریم ﷺ کے ہجرت فرمانے کی خبر مشہور ہوئی تو لوگ آپ ﷺ کے استقبال کیلئے نکلتے تھے اور آپ ﷺ کی آمد کا انتظار کرتے تھے اور جب دیکھتے کہ تشریف آوری نہیں ہوئی تو پھر مایوس ہوکر چلے جاتے، ایک مرتبہ یہی حال تھا کہ کسی نے کہا کہ نبی ﷺ

تشریف لے آئے تو لوگ بے تحاشہ آپ پر نثار اور قربان ہونا چاہ رہے تھے ان میں یہ جوان انصاری صحابی بھی تھے ان کا تو جوش قابو سے باہر معلوم ہو رہا تھا، حدیث و تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تمہارا ایک امتحان کرنا چاہتا ہوں انہوں نے عرض کیا، کیا امتحان؟ فرمایا کہ: جاؤ اور اپنے باپ کا سر کاٹ کر لے آؤ، بس اتنا سننا تھا کہ وہ فوراً روانہ ہو گئے کچھ دور پہنچے تھے کہ آپ ﷺ نے آواز دے کر بلایا اور فرمایا کہ: میں دنیا میں اس غرض سے نہیں آیا ہوں، میں تو تمہاری محبت کا امتحان کر رہا تھا اور کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب نبیٔ کریم ﷺ ہجرت فرما کر تشریف لائے تو آپ ﷺ نے اولاً قبا میں قیام فرمایا اور پہلا کام یہ کیا کہ مسجد کی تعمیر شروع کی اس لئے کہ مسلمانوں کی اصل زندگی مسجد ہی سے ہے بلکہ اگر ہم یہ کہیں کہ انسان کی اصل مسجد ہے تو بھی صحیح ہے، اس لئے کہ پہلے اس عالم میں پانی تھا جیسا کہ روایت سے معلوم ہوتا ہے اس کے بعد جہاں آج بیت اللہ ہے وہاں ایک بلبلہ اٹھا اس میں ایک قسم کی سختی کی کیفیت پیدا ہوئی اور وہیں سے گویا زمین بنائی گئی اور وہ پورے عالم میں پھیلا دی گئی (خطبات حکیم الاسلام ج۳ص۱۹۶) بہر حال زمین وہاں سے پھیلائی گئی اور انسان زمین سے بنا ہے اس طرح انسان کا مادہ زمین ہے اور زمین کا ابتدائی مادہ بیت اللہ ہے جو تمام مسجدوں کی اصل ہے لہٰذا یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی اصل جو خلیفۃ اللہ ہے وہ بیت اللہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اصل گھر اس عالم میں وہ بیت اللہ ہی ہے اور دوسرے گھر اس کے نمونے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ساری مسجدیں جو بیت اللہ کی شاخیں ہیں وہ بیت اللہ کی طرف متوجہ ہیں اور بقول میرے حضرت حکیم الاسلامؒ کہ ہم اور آپ تو مسجد میں جانے کے بعد بیت اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں مسجد تو پہلے ہی سے بیت اللہ کی طرف متوجہ رہتی ہے اور بعد میں بھی متوجہ ہے، تو انسان کی اصل در حقیقت بیت اللہ قرار

پاتی ہے۔

تو بات یہ چل رہی تھی کہ قبا میں آپ ﷺ نے مسجد کا نظام فرمایا پھر دن گذرتے گئے یہاں تک کہ یہ صحابی جو عاشق رسول تھے وہ بیمار ہوئے اور ضمناً ایک مزید ارشعر سن لے کسی نے بہت پتہ کی بات کہی ہے کہ حضور ﷺ جس دن مدینہ منورہ تشریف لائے ہیں تو مدینہ والوں کیلئے اس سے زیادہ کوئی مبارک اور روشن دن نہیں تھا اور جس دن آپ ﷺ دنیا سے رخصت ہوئے تو مدینہ والوں کے لئے اس سے زیادہ غم کا دن اور تاریک دن کوئی نہیں تھا، شاعر نے تو اپنے محبوب کے باب میں نقشہ کھینچا ہے مگر نبیٔ کریم ﷺ جو انسانوں میں سب سے زیادہ محبوب ہیں ان پر وہ شعر بالکل فٹ ہوتا ہے شاعر کہتا ہے۔

وقت دو گزرے ہیں مجھ پر سب سے مشکل ساری عمر میں

ایک تیرے آنے سے پہلے ایک تیرے جانے کے بعد

کہ جب آپ کی آمد نہیں ہوئی تھی تو فراق تھا بے قراری تھی اور جب آپ تشریف لے جا چکے تب بھی فراق اور بے قراری ہے، خیر یہ صحابی قبا میں رہتے تھے ان کی علالت کا دور شروع ہوا وہ بیمار ہوئے جب نبیٔ کریم ﷺ کو علم ہوا تو آپ ﷺ اپنے اخلاقِ کریمانہ سے ان کی عیادت کیلئے تشریف لائے وہ کیسے سعادت مند تھے کہ حضور ﷺ ان کی عیادت کیلئے تشریف لائے، جب آپ ﷺ تشریف لائے اور ان کو دیکھا تو آپ ﷺ نے محسوس فرمالیا کہ یہ ان کی زندگی کا آخری وقت ہے تو وہاں سے چلتے (جاتے) وقت صحابہ کرام سے فرمایا کہ ان کی موت کا وقت قریب ہے اگر ان کا انتقال ہو جائیں تو مجھے اطلاع کرنا مگر محبت کی بھی ایک عجیب وغریب دنیا ہے، ادھر خود انہوں نے بھی محسوس کیا کہ میرا دنیا سے جانے کا وقت قریب ہے تو انہوں نے اپنے قریبی رشتہ دار اور احباب سے کہا کہ دیکھو ایک مسلمان کیلئے بہت بڑی سعادت ہے کہ آپ ﷺ اس کے جنازہ میں

حاضر ہوں مگر رات کا وقت ہے یہودیوں کی آبادی ہے حاسدین یہاں رہتے ہیں ممکن ہے کہ آپ ﷺ کو ایذا پہنچائیں، غرض یہ کہ انہوں نے تاکید فرمائی کہ تم لوگ مجھے غسل دیدینا اور تم لوگ ہی مجھے دفن بھی کر دینا رات کے وقت حضور ﷺ کو تکلیف نہ دینا، اب آپ اندازہ لگائیے کہ ان کو کیسی معرفت بھری محبت تھی، ایک طرف تو بالکل نثار تھے اور ادھر یہ کیفیت تھی، خیر ان کا انتقال ہو گیا اور انہیں رات کے وقت دفن کر دیا گیا، نبیِ کریم ﷺ کو جب پتہ چلا تو گرانی کا اظہار فرمایا اور اپنے کچھ اصحاب کے ساتھ ان کے مزار پر تشریف لائے اور حق تعالیٰ سے دعا کی اے پروردگارِ عالم! یہ آپ سے اس حال میں ملیں کہ یہ آپ کو دیکھ کر اور آپ انہیں دیکھ کر ہنس رہے ہوں، تو مورخین لکھتے ہیں کہ یہ ایسا وقت تھا کہ حضرت طلحہ بن براءؓ کی روح پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی ہوگی کہ خاتم الانبیاء ﷺ دعا فرما رہے ہیں کہ یا اللہ! آپ ان سے اس حال میں ملیں کہ آپ ان کو دیکھ کر ہنس رہے ہوں یعنی آپ کی طرف سے ان پر رحمت و رضوان کی بارش ہو رہی ہو، تو یہ محبت کی بات تھی۔

پیغمبر باپ سے زیادہ شفیق ہوتا ہے

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ: میرے بعد ایک دوسرے کی گردن نہ مارنا (ریاض الصالحین حدیث نمبر ۶۹۸ بحوالہ بخاری و مسلم، کنز العمال ۵/۱۶۶) دیکھئے پیغمبر ماں باپ سے زیادہ شفیق ہوتا ہے، جس طرح باپ رخصت ہوتے وقت اپنے بیٹوں کو نصیحت اور وصیت کرتا ہے اس سے بہت زیادہ شفقت بھرے انداز میں حضور ﷺ نے خطبہ دیا، اب تو نصاریٰ کوشش کر رہے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے حواریّین کے سامنے جو خطبے دیئے تھے اور وہ فضا میں سلامت ہیں ان کو حاصل کریں اگر وہ دستیاب ہو گئے تو حجۃ الوداع کا خطبہ ضرور دستیاب ہوگا اس لئے کہ وہ تو بہت بعد کا ہے مگر فضاؤں

کے اندر اتنی کثرت سے آوازیں ہیں کہ تمیز دشوار ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے معاملات ہیں جو مبنی بر حکمت ہیں۔

میں جس زمانہ میں ڈابھیل میں پڑھاتا (مدرس) تھا تو اس زمانہ میں ایک صاحب بیرون ملک سے تشریف لائے اور انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ جتنی درسگاہیں ہیں ان میں تاروں کا کوئی ایسا نظام ہونا چاہئے کہ دفتر میں بیٹھ کر مہتمم صاحب سب اساتذہ کا درس سن سکیں تاکہ یہ پتہ چلے کہ مدرس پڑھارہا ہے یا باتیں کررہا ہے یا قصہ کہانیاں چل رہی ہیں، تو میں نے اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات کہی کہ ایک مدرس برابر محنت سے پڑھاتا رہا پھر اس بیچارہ نے پانچ منٹ کا ایک لطیفہ سنایا اور اسی وقت مہتمم صاحب اپنے دفتر میں تشریف لائے تو مہتمم صاحب کو اس مدرس کے بارے میں یہ بدگمانی پیدا ہوگی کہ آج مدرس نے سبق نہیں پڑھایا، دوسری بات یہ کہ بیرون سے لوگ آتے ہیں افریقہ سے موریشش سے اور دوسری جگہوں سے وہ درسگاہوں میں حاضر ہوکر قرآن وحدیث سنتے ہیں، اب کیفیت یہ ہوگی کہ جو آئے گا وہ دفتر میں پیر لمبے کرکے بیٹھے گا اور وہیں اس مشین کا کان مروڑ کر قرآن وحدیث سننے کا شوق پورا کرے گا اور یہ چیز وقارِ علم کے خلاف ہے اس لئے میں نے کہا کہ یہ نامناسب بات ہے اور میں نے کہا کہ میری اپنی درسگاہ میں تو کم از کم یہ نہیں ہوسکے گا یہ آپ سن لیں، میں نے صاف بات کہی تھی اور اپنی یہ بات ذمہ داروں تک بھی پہنچائی تھی چونکہ اس کا تعلق وقارِ علم سے تھا، یہ سب اللہ تعالیٰ کے معاملات ہیں، اس زمانہ میں ٹیپ ریکارڈ نہیں تھا اور ایک وجہ اور بھی ہے اس دنیا کو حق تعالیٰ مادّی اعتبار سے مکمل فرمانا چاہتے ہیں، شرعی نظام نبیٔ کریم ﷺ کی ذات پر مکمل ہوگیا، مادّی تکمیل بھی ضروری ہے اور مادّیت کی تکمیل دجال کی ذات پر ہوگی اسی لئے روز بروز عجیب عجیب چیزیں ظاہر ہوتی جارہی ہیں اور عجیب عجیب انکشافات

اور عجیب عجیب تحقیقات سامنے آرہی ہیں اور دجال اتنے زیادہ تصرفات کرے گا کہ حد نہیں سورج کو روک لے گا، قبروں سے مردے اٹھنا شروع ہوں گے عجیب عجیب کیفیتیں ظاہر ہوگی یہ سب بھی امتحان کیلئے ہوگا اور جب مادیت کی انتہا ہوگی تو جو مسلمان مردے اپنی قبروں میں ہیں وہ بھی اس کی ظلمت کو قبروں میں محسوس کریں گے کہ زمین پر دجال ظاہر ہوگیا ہے، ہر نبی نے اپنی اپنی امت کو اور خاص طور سے نبیٔ کریم ﷺ نے اپنی امت کو دجال کے فتنہ سے ڈرایا ہے اور مادیت کا توڑ روحانیت ہی سے ہوتا ہے اور روحانیت میں خاص طور سے روح اللہ حضرت عیسیٰؑ کو حق تعالیٰ اوپر سے بھیجیں گے تا کہ اس کو ختم کرے، معلوم ہوا کہ مادّی نظام کو توڑنے کیلئے بھی روحانی نظام ہی ہے، تو بات اس پر چل رہی تھی کہ انبیاء کرامؑ کے عجیب معاملات ہوتے ہیں ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ایک خاص شان کی تربیت ہوتی ہے، تو غرض یہ کہ نبیٔ کریم ﷺ کو اپنی امت کے ساتھ خاص شفقت تھی، حضرت عائشہؓ آپ ﷺ کی بڑی چہیتی بیوی تھیں اور دنیا میں ہوتا یہ ہے کہ جب آدمی کسی میلے ٹھیلے میں جاتا ہے اور اپنے ملنے والوں سے علیحدہ ہوتا ہے تو بتا دیتا ہے کہ کہاں ملاقات ہوگی؟ تو ماں عائشہ صدیقہؓ کو آپ ﷺ سے بڑا بے تابانہ تعلق تھا، آپؓ نے پوچھا کہ یارسول اللہ! میدانِ محشر میں تو سارے اولین وآخرین جمع ہوں گے اتنے بڑے مجمع میں آپ سے ملاقات کہاں ہوگی؟ اب آپ نبی ﷺ کی بے چینی ملاحظہ فرمائیں، ایک موقعہ پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا میزانِ عمل قائم ہوگا میں اس مقام پر موجود ہوں گا (ترمذی۔کوکب دری ج۲ص۹۸) اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: مجھے تم حوض کوثر پر تلاش کرنا کہ میں امت کے پیاسوں کو پانی پلاتا ہوں گا (مسلم شریف ۲۴۹/۲ ترمذی۔کوکب دری ج ۲ص۹۸) اور اگر وہاں نہ پاؤ تو پل صراط پر دیکھنا (ترمذی۔کوکب دری ج ۲ص۹۸) تو آپ ﷺ وہاں بھی بے قرار ہوں گے اور امت کی سلامتی کے لئے دعا فرمارہے ہوں گے اور

بزرگوں نے اس کی ایسی مثال دی ہے جیسے ایک مکان میں ایک ماں ہواور ہم نے ایک قصہ سنا بھی تھا کہ ایک ماں کو اپنے بچوں سے بہت محبت تھی اس کے سات آٹھ بچے تھے تو وہ ان کے درمیان میں اس طرح سوتی تھی کہ کسی بچہ کو اس کا ہاتھ لگا ہوا ہے اور کسی بچہ کو اس کی کہنی لگی ہوئی ہے اور کوئی بچہ سر کے قریب ہے غرض یہ کہ اس کے سارے جگر پارے اس کے ساتھ سوتے تھے، تو ایک ماں کچھ بچوں کو اپنے ساتھ لیکر گھر میں رہتی ہواور وہ رات میں لیٹی ہو کہ مکان کے اندر آگ لگ جائے اور اس ماں کے بچے مکان کے مختلف کونوں میں لیٹے ہوں، کوئی یہاں ہو کوئی وہاں ہو تو اس ماں کی بے قراری کا آپ اندازہ لگائیے کہ وہ کبھی اُس کونے میں جائے گی کہ اس کو بچائے تو کبھی اس کونے میں جائے گی کہ اُس کو بچائے، غرض یہ کہ انتہائی بے قراری کی صورت ہوگی ٹھیک اسی طرح نبیٔ کریم ﷺ کو میدانِ محشر میں اپنی امت کے باب میں انتہائی بے چینی ہوگی اور یہ فکر ہوگی کہ امت کسی طرح عذابِ الٰہی سے بچ جائے، وہی بے چینی آپ ﷺ پر دنیا میں طاری تھی اس لئے چاہتے تھے کہ امت اعمالِ شرعیہ پر آجائے اور امت میں امت پن پیدا ہو جائے، اسی لئے خطبۃ الوداع میں یہ بات کہی کہ آپس میں ایک دوسرے کی گردن نہ مارنا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آپس میں حسد اور بغض نہ ہو اس لئے کہ اگر یہ باتیں پیدا ہوں گی تو امت ٹوٹ جائے گی، آج نبیٔ کریم ﷺ کی امت جو ٹکڑے ٹکڑے ہے اس کو دیکھ کر آپ ﷺ تڑپ جاتے ہوں گے، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مسلمان سب ایک ہو کر دنیوی اور دینی نظام انتہائی اخوت ومحبت کے ساتھ چلاتے تا کہ امت پن ختم نہ ہونے پائے۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اپنے ایک مرید کو عجیب وغریب نصیحت

اسی لئے نبیٔ کریم ﷺ نے فخر وغرور سے منع کیا ہے کیوں کہ متکبر آدمی کا اور غرور

کرنے والے کا کسی سے جوڑ نہیں ہوتا، آج عالم میں اتفاق اتفاق کا شور ہے حالانکہ بغیر تواضع کے اتفاق نہیں ہوسکتا، مجھے حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی نصیحت یاد آئی ان کے ایک خادم تھے حضرت نے ان کو اجازت وخلافت بھی دی تھی جب وہ جانے لگے تو حضرت نے فرمایا کہ: میں تمہیں دو باتوں کی تاکید اور نصیحت کرتا ہوں، ایک یہ کہ خدائی کا دعویٰ نہ کرنا، دوسرا یہ کہ نبوت کا دعویٰ نہ کرنا، خادم نے کہا کہ حضرت! آپ کی بات سر آنکھوں پر، لیکن عرض یہ ہے کہ میں اتنا عرصہ آپ کے پاس رہا آپ نے اجازت وخلافت عطا فرمائی کیا یہ ممکن ہے کہ میں خدائی یا نبوت کا دعویٰ کر بیٹھوں گا، حضرت نے فرمایا کہ تم میری بات کا مطلب نہیں سمجھے، آدمی جب یہ چاہے کہ میں جو چاہوں وہی ہو اس کے سوا کچھ نہ ہو تو یہ در پردہ خدائی کا دعویٰ ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور آدمی اپنے ہر قول وفعل کو سو فیصد صحیح سمجھے اور کبھی اس میں غلطی کا امکان ہی نہ سمجھے اور اپنی غلطی تسلیم نہ کرے تو گویا دوسرے لفظوں میں وہ اپنے کو معصوم سمجھ رہا ہے اور یہ نبی کی شان ہے (منتخب تقریریں ص۲۳) ویسے بالغ ہونے سے پہلے بچہ بھی معصوم ہوتا ہے (مجالس حکیم الاسلام ج۲ص۱۹۲) مگر بالغ ہونے کے بعد بھی معصوم رہنا یہ نبی کی شان ہے، تو گویا قولاً وفعلاً ہر اعتبار سے اپنے کو صحیح سمجھنا اور اپنی غلطی کو نہ ماننا یہ درحقیقت نبوت کا دعویٰ ہے اس لئے کہ نبی معصوم ہوتا ہے، اب آپ اندازہ لگا لیجئے ہمارے جتنے بھی دینی شعبے ہیں ان میں یہ ساری بلائیں موجود ہیں اور سارے فسادات اسی سے پیدا ہوتے ہیں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ میں جو چاہوں وہی ہو، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے مولانا الیاس صاحبؒ کو جہاں جہاں سے فتنے آسکتے تھے ان کی ناکہ بندی کی مثلاً آپ دیکھئے اعلان بہت معمولی بات ہے مگر اس کے لئے بھی مشورہ کیا جاتا ہے، مولانا کی نگاہیں ان فتنوں کو دیکھتی تھیں اس لئے ان کا دروازہ ہی بند کردیا کہ کوئی گڑبڑی آئندہ نہ ہو، اسی طریقہ سے جتنے بھی کام

ہیں سب مشورہ سے طے پاتے ہیں اور ان کے لئے دعا کی جاتی ہے اور اس کی برکات ظاہر ہو رہی ہیں اور جہاں بھی مسلمانوں میں جوڑ ہے وہ اتباعِ سنّت کی برکت ہے اور جہاں بھی توڑ ہے وہ در حقیقت نفسانیت کا اثر ہے۔

کبر ہی لڑائی جھگڑے کا سبب ہے

اسی لئے حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ فرماتے تھے کہ جہاں دو آدمی جھگڑتے ہوں ان میں ایک متکبر ضرور ہوتا ہے دونوں متواضع ہوں تو لڑائی کا سوال نہیں ہوتا رہی اجتہادی خطا تو وہ اس سے مستثنیٰ ہے جیسے صحابہ میں جنگیں ہوئیں تو ان میں بڑی حکمتیں ہیں جن کو تاریخِ اسلام میں دیکھا جا سکتا ہے۔

عبدیت ہی سب سے بڑا کمال ہے

غرض یہ کہ تواضع اور اپنے کو مٹانا سب سے بڑا کمال ہے جو انسان کو اس عالم میں نصیب ہوتا ہے اسی لئے پتھر پر بارش برستی ہے تو اس پر رنگ برنگی پھول نہیں اُگتے اور مٹی پر بارش برستی ہے تو اس سے رنگ برنگی پھول اُگتے ہیں، چنانچہ زمین نے ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ سے کہا کہ آپ نے آسمان کو بلندی دی، سورج کو روشنی دی اور دوسری چیزوں کو عزت دی اور میرے لئے ایسی ذلت ہے کہ پاؤں میں میں کچلی جاتی ہوں، مکانات مجھ پر بنائے جاتے ہیں اور عجیب وغریب میری حالت ہے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سن تجھ میں خاکساری اور انکساری ہے اس کو بعض لوگ انکم ساری سمجھتے ہیں، انکم ساری بھی خیر اچھی چیز ہے، لیکن یہ انکساری ہے، تو حق تعالیٰ نے اس سے فرمایا کہ ہم تجھ سے ایسی مخلوق پیدا فرمائیں گے کہ جس کے آگے آسمانوں میں رہنے والے بھی جھکیں گے چنانچہ زمین کی تواضع کی وجہ سے حق تعالیٰ نے آدمؑ کو مٹی سے پیدا فرمایا اور ملائکہ کو حکم دیا کہ ان کو سجدہ کرو اس سے معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام کا درجہ کتنا بلند تھا اور ذاتِ حق سے

ان کو کتنا قرب تھا، حضرت آدمؑ میں اللہ تعالی کی تجلیات تھیں فرشتوں میں بھی وہ استعداد نہیں تھی کہ وہ براہ راست تجلیات الٰہیہ کو دیکھ سکیں اوران کا مشاہدہ کرسکیں جب حضرتِ آدمؑ کے آئینہ پرنظر پڑی اوران میں تجلیات الٰہیہ کو دیکھا اورسجدہ کا حکم بھی ہوا تو وہ جھک گئے ،تو گویا حضرتِ آدمؑ کا فرشتوں پراحسان تھا کہ ان کے آئینہ میں وہ تجلیات ان کو دِکھ سکیں جن کا دیکھنا ان کے بس کی بات نہیں تھی ،بہر حال بے نفسی بڑی چیز ہے، یہ جو جماعت آئی ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ عبدیت پیدا ہوجائے ،خدا تعالی سے تعلق پیدا ہوجائے اوراپنے اندر بندگی آجائے اور خدا کے بندوں کو دین کی طرف متوجہ کریں تا کہ خدا تعالی سے تعلق ہو، یہ جو بیچارے دربدر مارے مارے پھرتے ہیں یہ ان کی تواضع کی بات ہے اوراس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب آپ جماعت میں جاتے ہیں اور گشت میں نکلتے ہیں تو بعضوں کو ناگواری بھی ہوتی ہے اورلوگ عجیب عجیب پھبتیاں کستے ہیں ،لوگ طعنہ بھی دیتے ہیں، استہزاء اور مذاق بھی کرتے ہیں، یہ درحقیقت اپنے کو مٹانے والا عمل ہے، حضرت مولانا الیاس صاحبؒ تو کسانوں کی ڈاڑھیوں میں ہاتھ ڈال ڈال کران کو دین سے جوڑنے کی کوشش کرتے تھے اوراس کام کا فائدہ آج پورے عالم میں ظاہر ہورہا ہے اس کا کون نادان انکار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کام کواور ترقی دے اوراس میں اور زیادہ روح اور جان پیدا فرمائے ،تو یہ دین کا کام اوردوسرے بھی دین کے کام صرف اسی لئے ہیں کہ خدا تعالی سے بندوں کا تعلق پیدا ہوجائے اور آدمی میں بندگی آجائے تا کہ وہ بندوں کے حقوق بھی ادا کرتا ہے، اگر ہم اس کام کے ذریعہ سے اپنے اندر تواضع پیدا نہ کرسکے تو یہ ہماری کمزوری ہوگی، دیکھو میں ایک مثال دوں مثلاً ایک آدمی نے نماز پڑھی یہ بہت اونچا عمل ہے مگر نماز تو تھی ہی اس لئے کہ آدمی اپنی ناک کو ختم کرے، یہی وجہ ہے کہ نماز میں اللہ تعالی نے دو سجدے رکھے ہیں سارے عالم میں اسی ’’اَنا‘‘ ،اور ناک کا

فساد ہے اسی لئے نماز میں بار بار اس کو زمین پر رگڑا جاتا ہے مسجد سجدے کی طرف منسوب ہے یعنی مٹانے کی جگہ حالانکہ اس میں رکوع، قیام سب ہوتا ہے لیکن اسکی نسبت سجدے کی طرف کی گئی ہے، اب نماز پڑھ کر آدمی نے کسی کو کمتر سمجھا اور اپنے کو بہتر سمجھا تو نماز سے جو تواضع اور عبدیت پیدا ہونی چاہئے وہ پیدا نہیں ہوئی، اب یہی کہا جائے گا کہ اس کے اس عمل میں نقص ہے۔

اعمال کی اصلاح ہوگی تو اخلاق کی اصلاح ہوگی

اسی لئے حضرت مولانا الیاس صاحبؒ فرماتے تھے کہ اعمال کی اصلاح ہوگی تو اخلاق کی اصلاح ہوگی اور بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ اخلاق کی اصلاح ہوگی تو اعمال کی اصلاح ہوگی، ہر ایک کے مستقل دلائل ہیں جو آپ کے لئے تشویش کا سامان ہے، یہاں صرف اتنی بات ذہن میں رہے کہ اگر ہمارے اعمال کا اثر ہمارے اخلاق پر نہیں پڑا تو یہ سمجھا جائے گا کہ ہمارے اعمال ہی ناقص ہیں اگر ہمارے اعمال جاندار بن جائیں تو ہمارے اخلاق درست ہوں گے غالباً ابوداؤد شریف کی روایت ہے عرض کیا گیا کہ: اے اللہ کے رسول! ایک آدمی رات میں نماز پڑھتا ہے اور دن میں چوری بھی کرتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ عنقریب اس کی نماز اسے اس کام سے روک دے گی (فضائلِ نماز ص ۶۷ بحوالہ درمنثور) چنانچہ بعد میں ایسا ہی ہوا کہ نماز نے اسے چوری سے روک دیا اور حدیث میں ہے کہ اگر کسی کی نماز اسے معاصی سے نہیں روکتی ہے تو یہ نماز بجائے قرب کے بُعد خداوندی کا سبب بنے گی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر زندگی میں کچھ گڑبڑی ہو تو آدمی نماز کو ہی موقوف کردے اور چھوڑ دے، نہیں، بلکہ اس آدمی کو نماز کو جاندار بنانے کی کوشش کرنا چاہئے، بہر حال حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل خانہ میں خواب کی تعبیر سے پہلے توحید کی دعوت دی اور پھر جیل خانہ سے رہائی کا سبب بادشاہ کا خواب بنا ہے،

اس کی تفصیل انشاء اللہ کل ذکر کی جائے گی، آپ کی بستی میں جماعت آئی ہوئی ہے، یہ حضرات تشکیل کرنا چاہتے ہیں، تو جو حضرات نام لکھوانا چاہتے ہیں وہ شوق سے اپنے نام پیش کریں اور میں تو کہا کرتا ہوں کہ اس ملک میں فرصت علی خاں کچھ کم نہیں ہیں، بعض حضرات تو وہ ہیں جن کی دستخط بڑی مضبوط ہے اور بعض کی کچھ اور چیز، پس اپنے اوقات کو غنیمت سمجھیں اور زیادہ سے زیادہ وقت دین کے کام میں لگائیں، انشاء اللہ اس کی برکتیں ظاہر ہوں گی، اللہ تعالیٰ ان باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

۞۞۞۞۞

درس نمبر ۲۳ سے حاصل ہونے والی پانچ اہم ہدایات

(۱) اگر صورت پسندیدہ ہو تو حق تعالیٰ اس میں حقیقت پیدا فرما دیتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے مقابلے میں آنے والے ساحرین کا واقعہ اسکی کھلی دلیل ہے۔

(۲) اس عالم میں جو مصائب انسانوں پر آتے ہیں وہ اسلئے تا کہ اس عالم میں انسانوں کا جی نہ لگے، اس لئے کہ جہاں آدمی رہتا ہے اور ہر شئ آدمی کی طبیعت کے موافق ہو تو اس کی طبیعت وہاں لگ جاتی ہے اور جب طبیعت کے خلاف حالات پیش آئیں گے تو طبیعت اس سے لگے گی نہیں اور آخرت کی طرف دل مائل ہوگا۔

(۳) پیغمبر باپ سے زیادہ شفیق ہوتا ہے اس کا ایک نمونہ آپ ﷺ کا حجۃ الوداع کا خطبہ ہے۔

(۴) بغیر تواضع کے اتفاق نہیں ہوسکتا۔

(۵) سارے فسادات کی جڑ اپنی رائے کو ہر ایک کی رائے سے بہتر سمجھنا ہے۔

درس نمبر (۲۴)

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم،امابعد!

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ، بسم اللہ الرحمن الرحیم

یوسف ایها الصدیق افتنا فی سبع بقرات سمان یاکلهن الخ

پیغمبر کا سینہ بڑا ہوتا ہے

بزرگانِ محترم! کل یہ بات چل رہی تھی کہ ملک مصر کے بادشاہ نے ایک خواب دیکھا اور اس کی تعبیر درباریوں سے پوچھی وہ لوگ اس خواب کو نہیں سمجھ سکے، انہوں نے کہا یہ خیالات ہیں اور اس قسم کے اوہام اور خیالات کی تعبیر ہم نہیں جانتے، تو وہ قیدخانہ میں جو دو آدمی تھے جن کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے ان میں ایک بادشاہ کا ساقی یعنی شراب پلانے والا تھا اور دوسرا باورچی یعنی کھانا پکانے والا تھا یہ دونوں شبہ میں گرفتار تھے پھر ان میں سے ایک تو کھانے میں زہر ملانے کی وجہ سے پکڑا گیا تھا اور دوسرا جو ساقی تھا وہ چھوڑ دیا گیا تھا اسے حضرت یوسف علیہ السلام کی بات یاد آئی اور اس نے بھرے مجمع میں یہ بات کہی کہ مجھے آپ کچھ وقت دیجئے میں ابھی اس خواب کی تعبیر لے آتا ہوں اور بادشاہ کے اجازت دینے پر وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا اور وہاں پہنچ کر عرض کیا ''یوسف ایها الصدیق افتنا فی سبع بقرت سمان الخ '' (یوسف ،آیت:۴۶) یوسف صدیق ایک خواب کی تعبیر ہمیں آپ سے پوچھنی ہے کہ سات موٹی گائیں ہیں اور ان کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات سبز بالیاں ہیں ان کو سات خشک بالیوں نے لپیٹ کر ختم کر دیا ہے اس کی کیا تعبیر ہے؟ اب یہاں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اس شخص پر بگڑے نہیں کہ ہم نے تم سے یہ کہا تھا کہ بادشاہ سے ہمارا تذکرہ کرنا تم نے وہ کیوں نہیں کیا اس پر کوئی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا، پیغمبر میں حلم اور ضبط

ہوتا ہے اور پیغمبر کا سینہ بہت بڑا ہوتا ہے۔

پیغمبروں سے بکریاں کیوں چروائی جاتی ہیں؟

اسی لئے عام طور سے پیغمبروں سے بکریاں بھی چروائی گئیں (ریاض الصالحین حدیث نمبر ۶۰۰ بحوالہ بخاری) اور بکری ایک ایسا جانور ہے کہ وہ کبھی یہاں منہ مارتی ہے، کبھی دوسری جگہ، کبھی تیسری جگہ تو اس میں منتشر (ادھر ادھر) ہوجانے کی عادت ہے، تو چرواہا (بکریاں چرانے والا) انہیں ایک مقام پر جمع کرنے کا کام کرتا ہے، تو انبیاء کرامؑ سے بکریاں چرائے جانے کی حکمت یہ ہے کہ امت کے افراد بھی مختلف طبیعت کے ہوتے ہیں، کوئی کفر کی طرف جا رہا ہے، کوئی شرک کی طرف جا رہا ہے، کسی کا کیسا مزاج، کسی کا کیسا تو ان مختلف مزاج کے انسانوں کو جمع کرنا تحمل اور برداشت کی قوت چاہتا ہے (تفسیر انوار البیان ج۴ ص۲۴۵) اسی لئے جب حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے پاس بھیجا گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''فقولا له قولا لينا'' (طٰہٰ، آیت:۴۴) اس سے نرم بات کہنا، یہی وجہ ہے کہ ہارون رشید کے سامنے کسی واعظ نے کسی شخص سے تلخ کلامی سے کام لیا اور سخت بات کہی، تو ہارون نے اس ذی علم آدمی سے کہا کہ تم سے بڑے واعظ حضرت موسیٰؑ تھے اور حق تعالیٰ نے انہیں تاکید کی تھی کہ نرم بات کرو اور تمہارا مخاطب بہر حال مؤمن ہے اور وہاں پر مخاطب کافر تھا بلکہ الوہیت کا مدعی تھا اور وہ فرعون تھا، تو نصیحت کرنے والے تو تم سے بڑھ کر تھے اور جس کو نصیحت کی جارہی تھی وہ الوہیت کا مدعی تھا (آداب الصالحین ص۲۳۹) پھر بھی حق تعالیٰ نے حکم دیا'' فقولا له قولا لينا'' کہ تم دونوں نرم اور ملائم بات کرو۔

ایک نادان کا قصہ

مگر نرم بات کا وہ مطلب نہیں جو ایک بے وقوف نے لیا تھا کہ ایک شخص کا انتقال ہوا اس نے بیٹے کو وصیت کی تھی کہ میرے مرنے کے بعد جو بھی تجھ سے ملنے آئے

اسے اونچے مقام پر بٹھانا اور ان سے میٹھی اور نرم بات کرنا وہ تھا عقل کا باردان (بیوقوف) پس جب باپ کا انتقال ہوگیا تو اس نے باپ کی وصیت پر اس طرح عمل کیا کہ بانس کا ایک اسٹیج تیار کیا اور جب کوئی آتا تو اسے اس کے اوپر بٹھاتا اور وہ کچھ بھی پوچھتا تو آپ کبھی گڑ کہتے اور کبھی روئی، کبھی شہد لوگ سوچتے کہ یہ عجیب آدمی ہے بٹھایا اونچے مقام پر اور کلام انتہائی عجیب، کسی نے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے؟ تو کہا کہ والد بزرگوار نے یہ نصیحت کی تھی کہ کوئی آئے تو اسے اونچے مقام پر بٹھانا، تو یہ مقام میں نے اونچا بنایا اور یہ کہا تھا کہ نرم اور میٹھی بات کرنا تو روئی سے زیادہ نرم اور گڑ اور شہد سے زیادہ کوئی میٹھی چیز نہیں ہے، تو میں انہیں باتوں پر عمل کرتا ہوں جس کی والد ماجد نے مجھے وصیت کی تھی (ملفوظات حکیم الامت، خطبات احتشام الحق ج۱ص۴۴۲)۔

بڑوں کی پکڑ چھوٹی بات پر بھی ہوجاتی ہے

تو غرض یہ کہ پیغمبر بڑے بااخلاق ہوتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہ کے ساقی پر بگڑے نہیں اور بڑوں کے معاملات بھی عجیب ہوتے ہیں کہ کبھی چھوٹی بات پر بھی پکڑ ہوجاتی ہے۔

انما انا لکم بمنزلة الوالد

خیر حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر بھی بتلائی اور تدبیر بھی بتلائی اسکی وجہ قوم پر شفقت تھی اس لئے کہ پیغمبر قوم میں ایسی حیثیت رکھتا ہے جیسے شفیق باپ ابوداؤد شریف کی حدیث ہے کہ ایک صحابی پر ایک یہودی نے طعن کیا کہ تمہارے پیغمبر کیسے ہیں کہ تمہیں استنجے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں، تو انہوں نے کہا کہ یقیناً وہ ہمیں اس کا طریقہ بھی بتلاتے ہیں (ابوداؤد شریف کتاب الطھارۃ حدیث نمبر ۷) ایک حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد بھی ہے ”انما انا لکم بمنزلة الوالد“ کہ میں تمہارے لئے باپ کی پوزیشن میں ہوں، (ابوداؤد

شریف کتاب الطھارۃ حدیث نمبر۸) اور آپ جانتے ہیں کہ ماں باپ بچے کو استنجے کا طریقہ بھی سکھلاتے ہیں، یہ تو پیغمبر کے کمال کی بات ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ اور شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے باب میں انہوں نے رہنمائی نہ فرمائی ہو، ورنہ آج کتنے لوگ ہیں جنہیں استنجے کا سلیقہ نہیں۔

استنجاء اور وضو پوری احتیاط سے کریں

یہاں ایک کام کی بات سن لیں بہت سے لوگ استنجے میں بڑی بے احتیاطی برتتے ہیں، استنجے سے ایسے واپس لوٹتے ہیں جیسے لمحوں میں کام ہوگیا ہو، اعضاء ان کے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے اسٹیل کے ہوں، حالانکہ اب ضعف کا زمانہ ہے چائے کا زمانہ کافی کا زمانہ، پیپسی کا زمانہ، ویجی ٹیبل کا زمانہ، ڈالڈا (گھی) کا زمانہ آرٹیفیشل چیزوں کا زمانہ قُوٰی چونکہ کمزور ہوچکے ہیں اسلئے استنجاء میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، ایک بات اور سن لیں، میں بہت سے لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ ان کا وضو صحیح نہیں ہوتا، بعض دفعہ پانی گرم ہوتا ہے تو ہاتھ ایسے بڑھایا (حضرت نے اشارہ سے وہ کیفیت بتائی) نہ پاؤں دھونے کی تکلیف کرتے ہیں، نہ ہاتھ ملتے ہیں، نہ خلال کی تکلیف ایک لمحہ میں عضو بھیگا نہ بھیگا اور بھاگے، سمجھ میں نہیں آتا کہ جب نماز پڑھنی ہے تو اتنی غفلت کیوں؟ حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے صحابہ کو دیکھا کہ انہوں نے عجلت میں وضو کیا ان کی ایڑیاں خشک تھیں، تو آپ ﷺ نے پکار کر فرمایا کہ ”ویل للاعقاب من النار“ (طحاوی شریف ج۱ص۲۳) جن کی ایڑیاں خشک ہیں ان کو جہنم کی آگ لگے گی اور ان کیلئے ہلاکت کی بات ہے، لہٰذا اہتمام سے پیر دھونا چاہئے اور میں تو کہا کرتا ہوں کہ مؤمن سے پوری زندگی منہ دھلوایا جاتا ہے اور پوری زندگی منہ دھوکر بھی اگر وہ خدا تعالیٰ کو منہ دکھانے کے قابل بن جائے تو کام بن جائے گا، تو وضو کی بڑی اہمیت ہے، اس لئے وضو

میں اہتمام ہونا چاہیئے۔

تعبیر بھی اور تدبیر بھی

تو حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر بھی دی اور تدبیر بھی بتلائی، فرمایا کہ: پہلے سات سال ایسے آئیں گے جن میں بارش خوب برسے گی اور غلّہ خوب پکے گا اور بڑی سرسبزی وشادابی ہوگی اور اس کے بعد جو سات دبلی گائیں یا خشک بالیں تھیں ان کی تعبیر یہ ہے کہ سات برس تک قحط ہوگا بارش بالکل نہیں ہوگی تو وہ سات سال جن میں خوب بارش ہوگی اور خوب غلّہ پکے گا ان میں یہ کرنا کہ جتنا غلّہ پیدا ہو اس میں سے بقدرِ ضرورت استعمال کرنا اور جو زائد از ضرورت ہو اس کو اسی حال میں چھلکے کے ساتھ رہنے دینا پھر اسکے بعد سات سال قحط کے ہوں گے ان کے بعد ایک سال ایسا آئے گا جس میں بارش خوب ہوگی، انگور خوب ہونگے، لوگ شراب نچوڑیں گے (معارف القرآن ادریسی ج ۴ص ۱۳۱) حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ: پہلے سات سال اور بعد کے سات سال یعنی چودہ سال کے متعلق جو خبر تھی وہ خواب سے بتلائی اور ایک چیز زائد جو تھی وہ بذریعۂ وحی بتلائی، بہرحال خواب کی تعبیر بھی بتلادی اور تدبیر بھی بتلائی کہ اس طرح کام کرنا ہے ساقی دربارِ شاہی میں پہنچا اور کہا کہ میں اس خواب کی تعبیر معلوم کر کے لایا ہوں، اس نے تعبیر بتلائی، بادشاہ نے اور درباریوں نے خواب کی تعبیر سنی تو وہ لوگ اس سے متاثر ہوئے اور بادشاہ نے کہا کہ ان کو جیل (قید خانہ) سے نکال کر یہاں لے آؤ، پس ساقی بادشاہِ مصر کا پیغام لیکر حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا کہ چلئے آپ کو بادشاہ سلامت بلا رہے ہیں۔

موعظت مقصود ہے

قرآنِ کریم کا ایک اسلوب یہ ہے کہ وہ درمیان کی ساری باتیں حذف کردینا ہے تاکہ کلام طویل نہ ہو قرآن کریم بیجا تطویل نہیں کرتا، جیسے ہم لوگوں کے کلام میں اور

خاص طور پر عورتوں کے کلام میں آپ بیجا تطویل بہت دیکھیں گے، جیسے میں ایک مثال دوں اگر ایک عورت یہ کہنا چاہتی ہے کہ میں یہاں سے فلاں کو ملنے گئی تھی، تو اولاً وہ کہے گی صبح کو ہم تیار ہوئے اور پھر تھوڑی دیر بیٹھے اور راستہ میں فلاں سے بات ہوئی وغیرہ وہ ہر ہر جزئی کو بیان کرے گی اور پھر اصل بات کہے گی عورتیں رائے کا پہاڑ بناتی ہیں اور لایعنی تطویل کرتی ہیں اور یہ بھی ذہن میں رہے کہ ہم جو بیچ میں کچھ ضمنی چیزیں بیان کرتے ہیں اس سے ہمارا منشا یہ ہے کہ کچھ نصیحت کی چیزیں اور کچھ کارآمد باتیں اس کی مناسبت سے آپ کے سامنے آجائیں اس سے ہمارا مقصود موعظت ہے، کوئی وقت گذاری مقصود نہیں ہے۔

شریف انسان محسن کا خیال رکھتا ہے

الغرض حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس بادشاہ کا قاصد پہنچا، تو حضرت یوسف علیہ السلام فوراً جیل سے نکلنے کے لئے تیار نہیں ہوئے بلکہ آپ نے فرمایا :'فاسئلهما مابال النسوة اللتی قطعن ایدیهن ''(یوسف،آیت:۵۰) کہ تم بادشاہ سلامت سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے حضرت یوسف علیہ السلام یہ بات واضح فرمانا چاہتے تھے اور قوم کو یہ بات بتلانا چاہتے تھے کہ زلیخا کے باب میں میرا ریکارڈ بالکل محفوظ ہے، میرا دامن داغدار نہیں ہے اور میں نے کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کی ہے، آپ چاہتے تھے کہ یہ بات دلائل کی روشنی میں قوم کے سامنے آجائے، اس میں بھی عجیب بات یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے زلیخا کا تذکرہ براہِ راست نہیں کیا بلکہ ان عورتوں کا تذکرہ کیا جنہوں نے ہاتھ یا انگلیاں کاٹ لی تھیں وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طبیعت میں شرافت تھی اور دوسری بات یہ کہ آپ زلیخا کے گھر میں پلے بڑھے اور رہے تھے اس کا آپ پر احسان تھا (معارف

القرآن ادریسی ج ۴ص ۱۳۳) جب شریف آدمی کوئی کلام کرتا ہے تو وہ اپنے کلام میں سارے پہلوؤں کا لحاظ کرتا ہے، بہرحال حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ بات کہی، اس سے آپ کا منشا یہ بھی تھا کہ بادشاہ مجھے بلا رہا ہے اگر وہ مجھے کسی منصب اور کسی عہدے پر فائز کرے گا تو ہوسکتا ہے کہ عزیزِ مصر جس کے یہاں میں رہا ہوں اس کو اس پر کچھ گرانی ہو، ویسے تو عزیزِ مصر حقیقت حال پہلے ہی مرحلے میں سمجھ گیا تھا چنانچہ اس نے زلیخا سے کہا تھا ''انک کنت من الخاطئین'' کہ بیشک تم ہی خطا کاروں میں سے ہو چنانچہ جب بادشاہ نے عورتوں سے پوچھا کہ کیا تم نے یوسف کے باب میں کوئی غلط چیز دیکھی ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ ہم نے ان کے باب میں کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی جس سے ان کے اخلاق اور کیریکٹر پر زد پڑتی ہو ہم نے ایسا کچھ بھی نہیں دیکھا، جب بادشاہ نے پوچھا تو عورتیں بھی سمجھ گئیں کہ بادشاہ کو یہ بات معلوم ہے پھر جب عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی تعریف کی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قصوروار تو زلیخا تھی، مگر چونکہ عورتوں نے بھی زلیخا کی تائید کی تھی اور تائید کرنے والا اصل کے حکم میں ہوتا ہے اس وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں ان عورتوں سے پوچھا گیا، انہوں نے کہا کہ ہم نے ان میں کوئی غلط بات نہیں دیکھی جب یہ سب کچھ ہوا تو زلیخا نے بھی سوچا کہ اب تو ساری بات کھل کر سامنے آگئی ہے اس لئے اس سے بھی رہا نہیں گیا اور اس نے صاف کہہ دیا ''الئٰن حصحص الحق'' کہ اب حق کھل کر سامنے آچکا ہے ''انا راودته عن نفسه'' کہ میں نے ہی ان کو پھسلایا تھا اور میں نے ہی ان کو بہکانے کی کوشش کی تھی ''وانه لمن الصادقین'' اور وہ تو سچے ہیں، الغرض عورتوں نے بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی تعریف کی اور ان کے ساتھ ساتھ زلیخا نے بھی آپ کی تعریف کی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی احتیاط

اس سے ایک بات یہ نکلی کہ جس آدمی کے ساتھ قومی خدمات وابستہ ہوں اور

اس کے بارے میں کسی کو شبہ ہو تو اس کو صاف کر دینا ضروری ہے جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کیا تا کہ آئندہ کوئی شخص آپ پر تہمت نہ لگا سکے اور اس کو کسی قسم کی بدگمانی پھیلانے کا موقع نہ ملے (معارف القرآن ادریسی ج ۴ ص ۱۳۳) قرآنِ کریم نے بھی اس کو عجیب انداز سے بیان کیا ''ذلک لیعلم انی لم اخنه بالغیب ''حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ: میں نے جیل سے رہا ہونے کے لئے یہ قید اس لئے لگائی تا کہ عزیزِ مصر کو معلوم ہو جائے کہ میں نے پسِ پردہ اور ان کی غیر موجودگی میں کوئی خیانت نہیں کی ہے'' وان اللہ لایھدی کید الخائنین' 'اور خیانت کرنے والوں کی چال کو اللہ تعالی چلنے نہیں دیتے، تو ایک تو عزیزِ مصر پر یہ بات واضح کرنی تھی اور دوسرے یہ وضاحت اس لئے بھی ضروری تھی کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام بڑے منصب پر پہنچ جاتے تو لوگ یہ سمجھتے کہ اس دنیا میں گڑبڑی کرنے کے باوجود نوازش ہوتی ہے، لوگ اس سے غلط نتیجہ نکالتے اور یہاں حضرت یوسف علیہ السلام یہ بتلانا چاہتے تھے کہ انسانوں کے درمیان محبوبیت کے ساتھ انسان کو جو منصب حاصل ہوتا ہے وہ سارے لوگوں کو حاصل نہیں ہوتا وہ تو صرف سچے لوگوں کو حاصل ہوتا ہے خیانت کرنے والوں کو یہ دولت حاصل نہیں ہوتی۔

چوری اور سینہ زوری

ہاں اگر داداگری کر کے زبردستی آدمی بڑا بن جائے تو وہ الگ بات ہے، چنانچہ ہندوستان میں بنگلور میں ایک لیڈر انتخاب میں کھڑے ہوئے اور انہوں نے لوگوں سے کہا کہ مجھے مت دو یعنی ووٹ دو (ووٹ کو گجراتی میں مت کہتے ہیں) مت دو کا مطلب ہے دو اور پھر اس نے کہا کہ میں جب پہلی مرتبہ جیت کر آیا تو میں نے اپنا اور اپنے رشتہ داروں کا جیب بھرا اور جب دوسری مرتبہ جیت کر آیا تو اپنے دوستوں اور ملنے والوں کا جیب بھرا، اب دس سال بعد موقعہ آیا ہے کہ میں پبلک کی سیوا اور جنتا کی خدمت کر سکوں

اس لئے مجھے ہی آپ لوگ ووٹ دیں، اگر آپ نے کسی اور کو ووٹ دیا تو دس سال اور انتظار کرنا پڑے گا، دیکھئے کیسی چوری اور سینہ زوری کہ اپنی ہی حماقت کو خود واضح کر رہا ہے ،تو آج کا دور تو ایسا ہے کہ جو جتنا بدمعاش ہو وہ اتنا ہی بڑا سمجھا جاتا ہے اور لوگ اتنی ہی اس کی رعایت کرتے ہیں۔

بدترین آدمی

حدیث شریف میں نبیٔ کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: بدترین آدمی وہ ہے جس کے ضرر سے بچنے کیلئے لوگ اس کا لحاظ کریں (ترمذی شریف ج۲/۴۴) چنانچہ ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ جو جتنا زیادہ بدمعاش ہوتا ہے لوگ اس کی اتنی ہی عزت کرتے ہیں، یہ درحقیقت عزت نہیں بلکہ اس کے شر سے بچنا ہے۔

بے داغ زندگی ایک بڑی نعمت ہے

بہرحال حضرت یوسف علیہ السلام یہ واضح فرمانا چاہتے تھے کہ میں خیانت کے راستے سے اس مقام اور پوسٹ پر نہیں پہنچا ہوں بلکہ میرا پچھلا ریکارڈ بالکل صاف ہے اور یہ بڑی نعمت ہے، آج ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ کوئی آدمی کسی اچھے مقام پر ہو اور پچھلی لائف اس کی رف ہو تو لوگ اس پر طعنہ کستے ہیں کہ ٹھیک ہے ہم اس کی پچھلی لائف کیسی تھی وہ جانتے ہیں، تو گویا اس کا بھی اثر پڑتا ہے، اسی لئے پیغمبروں نے نبوت ملنے کے بعد قوم سے یہ بات کہی ”فقد لبثت فیکم عمرا من قبله“ کہ ہم ایک زمانہ تک تمہارے درمیان رہے ہیں ہمارے شب و روز تم نے دیکھے ہیں، ہمارا اٹھنا بیٹھنا اور لین دین کے معاملات دیکھے ہیں ہم نے ہمیشہ پاکدامنی اور تقویٰ کا خیال کیا ہے، نبوت ملنے سے پہلے جو چالیس سالہ دور ہوتا ہے وہ نبی کی زندگی پر کھنے کے لئے ایک معیار ہوتا ہے اور پھر وہ نبوت کا دعویٰ کرتا ہے، اسی لئے جو انبیاء گذرے ہیں اور خاص طور سے نبیٔ کریم ﷺ

انہوں نے کسی معمولی شخص پر بھی جھوٹ نہیں باندھا، تو کیا وہ اتنی بڑی جرأت اور ہمت کر بیٹھیں گے کہ اللہ تعالی پر جھوٹ باندھیں؟ یہ ہو ہی نہیں سکتا، اس بات کا اعتراف ہر زمانہ کے سمجھدار لوگوں نے کیا ہے، بہر حال حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ بات کہی، حدیث میں آتا ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں یوسف کی جگہ ہوتا اور میں اتنی مدت جیل میں رہتا تو بلانے والے کی بات مان لیتا اور فوراً قید خانہ سے باہر آجاتا (گلدستۂ تفاسیر ج۳ص۴۶۸) یہاں حضرت یوسف علیہ السلام نے تحقیق کا مطالبہ کیا اس حدیث میں درحقیقت آپ ﷺ حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر وتحمل پر ان کی تعریف فرمارہے ہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرت یوسفؑ کا درجہ حضور ﷺ کے درجہ سے بڑھ کر ہے بلکہ آپ ﷺ کی نظر امت پر ہے، آپ ﷺ اپنی شفقت کے پیش نظر امت کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عام حالات میں مناسب یہ ہے کہ آدمی نکل آئے اس لئے کہ بادشاہوں کا مزاج عجیب ہوتا ہے کہ کبھی تو نواز دیتے ہیں اور کبھی ناراض ہوجاتے ہیں، تو گویا نبی کریم ﷺ نے آسانی کے پیش نظر یہ بات ارشاد فرمائی (حوالہ بالا) یا جواب یہ ہے کہ توکل وتفویض کا جو مقام نبیٔ کریم ﷺ کا ہے وہ دوسری شان کا ہے، جب انسان اپنے آپ کو مکمل طور پر خدا تعالی کے حوالے کر دیتا ہے تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ الٰہی! میں یہ چاہتا ہوں کہ کچھ نہ چاہوں اور میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ کچھ تجویز نہ کروں اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے مردہ غسل دینے والے کے ہاتھ میں کہ وہ اسکو جدھر پلٹنا چاہے پلٹ دے اور عجیب بات ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر دینے سے پہلے یہ قید نہیں لگائی بلکہ بعد میں جب جیل سے نکلنے کا موقعہ آیا تو یہ بات کہی۔

علم بہت بڑا جوہر ہے

بہر حال حضرت یوسفؑ کو جیل خانہ سے بادشاہِ مصر نے بلوایا، امام رازیؒ کو اللہ

تعالیٰ جزائے خیر دے تفسیرِ کبیر میں لکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے جیل خانہ سے باعزت نکلنے کا سبب خواب کی تعبیر کا علم بنا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ اگر نبیٔ کریم ﷺ کی امت کے افراد قرآن وحدیث کی صحیح تعبیر کریں گے اور قرآن وحدیث کا صحیح مطلب سمجھیں گے اور سمجھائیں گے تو وہ دنیا کے شکوک وشبہات کے جیل خانہ سے نجات پائیں گے اور آخرت میں جہنم سے نجات پائیں گے کہ اس میں جانے کی نوبت ہی نہیں آئے گی، تو تعبیر خواب کا علم قید خانہ سے نکلنے کا سبب بنا اس سے معلوم ہوا کہ علم بہت بڑا جوہر اور بہت قیمتی شئ ہے کہ اس کی برکت سے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ سے نجات مل گئی۔

انسان کا نفس اس کا سب سے بڑا دشمن ہے

پھر اس کے ساتھ عجیب بات یہ ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام جیل سے باہر تشریف لائے تو آپ نے فرمایا کہ: میں نے یہ جو کچھ کیا ہے یعنی معاملہ کی تحقیق وغیرہ کا مطالبہ تو وہ اس وجہ سے نہیں کہ مجھے اپنے نفس پر اعتماد ہے اور میں اپنے نفس پر ناز کرتا ہوں، یا مجھے اس پر فخر وغرور ہے، نہیں نہیں، میں نے اس لئے یہ کام نہیں کیا بلکہ آپ نے فرمایا: ’’وما ابرئ نفسی ان النفس لامارة بالسوء ‘‘میں اپنے نفس کو پاک قرار نہیں دیتا نفس تو برائی ہی کا حکم دیتا ہے’’الا مارحم ربی ‘‘ مگر میرے رب کا رحم وکرم جس کے شامل حال ہو وہ ایسے نازک موڑ پر بچ سکتا ہے، گویا آپ نے قوم کو یہ بتلایا کہ میں اپنی پاکدامنی پر فخر وغرور نہیں کرتا بلکہ میں اس کو حق تعالیٰ کا فضل اور انعام سمجھتا ہوں، اس سے ایک مسئلہ یہ نکلا کہ اگر کسی شخص کو کسی نیک کام کی توفیق ہو جائے، چاہے برائی سے بچنا ہو، چاہے نیکی کا کرنا ہو اسے حق تعالیٰ کا فضل سمجھے، اس لئے کہ آدمی کی نظر اپنے نفس اور ذات پر ہو جائے گی تو خود پسندی پیدا ہوگی اور اللہ تعالیٰ سے نظر ہٹے گی، اس لئے ضروری

ہے کہ اگر برائی سے بچے تو یوں نہ سمجھے کہ میں بچا بلکہ اللہ تعالیٰ نے بچایا اور کوئی نیک کام کرے تو یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے یہ کام ہوا اس لئے کہ اپنے پر نظر کرنے کی وجہ سے انسان کا عمل چوپٹ ہو جاتا ہے، حدیث شریف میں ہے کہ جب بندہ کوئی نیک کام کرتا ہے اور نیک کام کرنے کے بعد یہ کہتا ہے کہ میں نے یہ نیک کام کیا، تو غیب سے آواز دی جاتی ہے کہ اے بندے! تو نے کیا کیا؟ ارادہ ہم نے پیدا کروایا، قوتِ عمل ہم نے دی، عمل ہم نے کروایا، تو نے کیا کیا؟ اور جب بندہ نیک کام کر کے یہ کہتا ہے کہ مولیٰ مجھ سے کچھ بھی نہیں ہوا میں تو کوتاہ ہوں، قاصر ہوں، عاجز ہوں تو غیب سے آواز دی جاتی ہے کہ نہیں نہیں، بندے! خیال تو نے کیا ارادہ تو نے کیا اور عمل تو نے کیا (خطبات حکیم الاسلام ج۳ص۳۳۵) تو گویا اس کے عمل کی قدر ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ اگر گناہ سے کوئی آدمی بچا ہے تو وہ یہ سمجھے کہ میری تو صرف کوشش تھی اصل تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اگر وہ نہ ہو تو کوئی آدمی گناہ سے نہیں بچ سکتا ایک سیکنڈ کیلئے بھی آدمی گناہ سے نہیں بچ سکتا، حدیث میں ہے نبیِ کریم ﷺ نے دعا فرمائی ''اللھم ارحمنی بترک المعاصی ابدا'' (ترغیب ج۲ص۲۱۴، ترمذی ج۲ص۱۹۷) اے اللہ! گناہوں کے چھوڑنے اور اس کے ترک کرنے کے ذریعہ آپ مجھ پر رحم فرمائیں کہ میں ہمیشہ گناہوں سے دور رہوں، معلوم ہوا کہ جو گناہوں سے بچا وہ مرحوم ہے حقیقتاً، تو فرمایا کہ: ''الا ما رحم ربی ان ربی غفور رحیم'' معلوم ہوا کہ نفس میں تو حقیقۃً شر ہے، حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے اس کی مثال دی ہے کہ پانی کو چولھے پر رکھے تو جب تک خارجی گرمی کا اثر ہے پانی گرم ہوگا، جوش میں آکر اُبلنا بھی شروع ہوگا، مگر جہاں اس کو چولھے پر سے اتار کر نیچے رکھ دیا تو پھر وہ اپنی اصلی حالت کی طرف چلنا شروع کرے گا (خطباتِ حکیم الاسلام ج۵،ص:۱۸۲) تو جماعت میں آدمی نکلا ہو، کسی بزرگ کے پاس جا کر ٹھہرا ہو، تو انسان کا نفس اس ماحول کی وجہ سے دبا رہتا ہے،

پھر جب آدمی وہاں سے اپنے ماحول میں پہنچتا ہے تو پھر ابھرتا ہے اب ضرورت ہے اس بات کی کہ آدمی اپنے آپ کو سنبھالے، اس لئے کہ وہاں کی گرمی وہ عارضی تھی اور ٹھنڈک اس کی ذاتی صفت ہے لہٰذا نفس ادھر جانا چاہتا ہے، نفس کے بارے میں قرآن کریم میں ہے ''ان النفس لامارة بالسوء '' اور شیطان کے بارے میں ہے ''انما یامر کم بالسوء والفحشاء'' تو شیطان تو آمر ہے اور نفس امّارہ ہے شیطان سے ایک قدم آگے بڑھا ہوا، اسی لئے بزرگوں نے لکھا ہے کہ انسان کو شیطان بہکاتا ہے مگر شیطان کو بہکانے والا خود اس کا نفس تھا۔ (مجالس خطیب الامت ص۱۱۲) معلوم ہوا کہ بڑا گرو گھنٹال نفس ہی ہے، تو فرمایا کہ: ''ان النفس لامارة بالسوء الا مارحم ربی ان ربی غفور رحیم '' اور میرا رب مجھے معاف کرنے والا ہے۔

کسی بھی کام کی بنیاد حسن و جمال پہ نہ ہو

الغرض بادشاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بلایا اور حضرت یوسف علیہ السلام سے براہ راست خواب کی تعبیر سنی، خواب کی تعبیر سن کر بادشاہ کہنے لگا کہ یہ سارا نظام کرے گا کون؟ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ '' اجعلنی علیٰ خزائن الارض '' آپ مجھے ملکِ مصر کے خزائن کا متولی بنادیں ''انی حفیظ علیم '' اس سے ایک مسئلہ یہ نکلا کہ کسی مقام پر کوئی کام بگڑ رہا ہو اور آپ کو خدا تعالیٰ نے صلاحیت دی ہے اور آپ اس کو سنبھال لیں تو اس کی گنجائش ہے، جیسے مثال کے طور پر مسجد ہے اس کا نظام چوپٹ ہو رہا ہے، یا کسی مدرسہ کا نظام خراب ہو رہا ہے، یا کسی انجمن اور سوسائٹی کا نظام گڑ بڑ ہے اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے صلاحیت دی ہے اور آپ اس کے ٹھیک کرنے کی صلاحیت رکھتے ہے آپ آگے بڑھ کر اس کو سنبھال لیں تو کوئی قباحت کی بات نہیں ہے، تو میں عرض کر رہا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ ''اجعلنی علی خزائن الارض ''

آپ مجھے ملکِ مصر کے خزائن پر والی اور منتظم بنا دیجئے میں اس کا انتظام کروں گا ’’انــی حـفـیـظ عـلـیم‘‘ بیشک میں حفاظت کرنے والا اور جاننے والا ہوں، تو دو صفتیں بیان کیں، ایک حفاظت اور دوسرا علم، حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ فرماتے تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے یہ نہیں فرمایا کہ: ’’انی حسین جمیل ‘‘(خطبات حکیم الاسلام ج ۳ ص ۳۱۴) مجھے ملکِ مصر کا والی بنا دیجئے کیوں کہ میں حسین وجمیل ہوں کیونکہ حسن و جمال ان کا خلقی اور پیدائشی تھا اور یہ کمال کی بات تو تھی مگر حضرت یوسف علیہ السلام کے اختیار سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا، کیوں کہ حسن و جمال من جانب اللہ صرف عطاءِ الٰہی ہے، اس سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ حضرت یوسف علیہ السلام گویا دنیا کو بتلانا چاہ رہے ہیں کہ صرف حسن و جمال پر بنیاد نہ ہو، اس میں نوجوانوں کیلئے بڑا سبق ہے کہ وہ آئے دن نئی نئی ہیئتیں اختیار کرتے ہیں اور بعض تو بالکل کارٹون بنے ہوئے ہوتے ہیں ان کی شکل دیکھنے کے لائق ہوتی ہے، آج کا نوجوان ایکٹر کے پیچھے بھاگ رہا ہے ایکٹر جیسی ہیئت بناتے ہیں نوجوان بھی ویسا ہی کرتا ہے۔

نوجوان کدھر جا رہے ہیں

ہمارے یہاں ہندوستان میں ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ جس کو دیکھو اس کے سر پر ٹوپی، بعد میں اس کی وجہ معلوم ہوئی کہ وہاں ایک ایکٹر ہے جس کا نام یوسف خان ہے اس نے کسی فلم میں ٹوپی پہن لی ہوگی تو سب جوانوں کے سر پر ٹوپی آگئی، کسی موقعہ پر ایکٹر نے ڈاڑھی رکھ لی تو سب نے ڈاڑھی رکھ لی، کسی نے پنجابی ڈریس پہن لیا تو سب نے پنجابی ڈریس پہن لیا اگر وہ ننگا پھرے تو شاید نوجوان اس کے لئے بھی تیار ہو جائے، تو سچی بات یہ ہے کہ آنکھ بند کر کے ان کا اقتداء کیا جا رہا ہے، حالانکہ سوچنے کی بات ہے کہ ایکٹر ہمارے خیر خواہ نہیں ہے، وہ بداخلاق بھی ہوتے ہیں، بدکردار بھی ہوتے ہیں،

بے علم بھی ہوتے ہیں اور پکّے دنیادار اور خدا تعالی سے غافل ہوتے ہیں اور جو نبی امت کیلئے زندگی بھر راتوں کو روتے رہیں اور جو دنیا سے جاتے ہوئے بھی امت کیلئے مغفرت کی دعائیں فرماتے رہیں ان کی تقلید اور ان کا فالو کرنے کی بجائے مسلمان ایکٹروں کی تقلید کر رہے ہیں، یہ کس قدر محرومی کی بات ہے، ریئیون کے ایک سفر میں ایک جگہ جانا ہوا وہاں میں نے دیکھا کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں نے کپڑے سلائے ابھی اس کو سلائے ایک مہینہ نہیں گذرا تھا کہ فرانس کے اندر ایک نیا لباس شروع ہوا تو انہوں نے بھی اس کو سلایا تو وہ جو پہلے کپڑے سلائے تھے وہ سب بیکار ہو گئے، یہ نئی تہذیب اور نیا کلچر ہے جس پر اتنا اسراف ہوتا ہے۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہمارا مقتدا ایکٹر نہیں ہے ہمارا مقتدا تو پیغمبر ہے وہ ہمارے رہنما اور قائد ہیں، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے فرمایا ''اجعلنی علی خزائن الارض، انی حفیظ علیم'' چنانچہ بادشاہ نے اپنا تاج حضرت یوسف علیہ السلام کے سر پر رکھا اور حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کا نظام سنبھالا اور کس شان کے ساتھ نظام سنبھالا وہ انشاء اللہ آپ کو کل کے نظام میں بتلائیں گے، دعا کیجئے اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔۔

درس نمبر چوبیس سے حاصل ہونے والی نو اہم ہدایات

(۱) پیغمبر بڑے بااخلاق ہوتے ہیں چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام ساقی پر یہ کہ صرف بگڑے نہیں بلکہ اس کی بھول اور اس کی غلطی کا ذکر تک نہیں کیا۔

(۲) پیغمبر ہر باب میں امت کی رہنمائی فرماتے ہیں یہاں تک کہ استنجے تک کا طریقہ بھی سکھلاتے ہیں۔

(۳) وضوخوب اہتمام سے کرنا چاہئے فرائض میں سے کوئی ایک فرض بھی ایک بال کے برابر بھی خشک رہ گیا تو وضونہیں ہوگا اور اس سے کی گئی عبادت مقبول نہیں ہوگی۔ اور وضو میں خاص طور سے پنڈلیاں خوب اہتمام سے دھونا چاہئے عموماً پنڈلیاں خشک رہ جاتی ہے۔

(۴) شریف انسان محسن کا خیال رکھتا ہے چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے براہِ راست زلیخا کا تذکرہ نہیں کیا۔

(۵) بدترین آدمی وہ ہے جس کے ضرر سے بچنے کیلئے لوگ اس کا لحاظ کرے۔

(۶) بے داغ زندگی ایک بڑی نعمت ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسی زندگی نصیب فرمائے۔

(۷) علم بہت بڑا جوہر ہے۔

(۸) انسان کا نفس اس کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

(۹) اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال نہ ہو تو کوئی آدمی گناہ سے نہیں بچ سکتا۔

درس نمبر (۲۵)

الحمد لله و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی، امابعد!

فاعوذباللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظ علیم ☆(یوسف،آیت:۵۵)

صدق اللہ العظیم

اجعلنی علیٰ خزائن الارض

بزرگانِ محترم! کل یہ بات ہورہی تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کوحق تعالیٰ نے اپنے فضل سے جیل خانہ سے رہائی نصیب فرمائی اور بنیاد اس کی بنی ہے خواب کی تعبیر کا علم، یہ علم سبب بن گیا قید خانہ سے چھٹکارے کا، بعض کتبِ تفاسیر میں لکھا ہے کہ بادشاہ نے بڑے اہتمام سے حضرت یوسفؑ کو بلوایا اور تقریباً ستر (۷۰) سواریاں ان کی توقیر اور ان کے اکرام کیلئے بھیجی اور اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کی شاہی محل میں تشریف آوری ہوئی، جب بادشاہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کی گفتگو ہوئی تو کتب تفاسیر میں لکھا ہے بادشاہ ستر (۷۰) زبانیں جانتا تھا صرف دو زبانوں کا علم نہیں تھا اس کو ایک عربی زبان کا دوسری عبرانی زبان کا، حضرت یوسف علیہ السلام نے جب ان دو زبانوں میں کلام کیا تو اس نے لاعلمی ظاہر کی کہ میں ان دو زبانوں کو نہیں جانتا ہوں (گلدستۂ تفاسیر ج۳ص۴۷۳) حضرت یوسف علیہ السلام کی نوعمری اور جن حالات سے ان کو گذرنا پڑا ان سب کی وجہ سے بادشاہ پر ہیبت بھی تھی اور حیرت بھی تھی، ہیبت وحیرت بادشاہ پر یہ تھی کہ اتنی ساری زبانوں کا علم یہ شخص کیسے رکھتا ہے کہ جس زبان میں میں کلام کرتا ہوں اس میں یہ گفتگو فرماتے ہیں، جو چیز میں ان کے سامنے کہتا ہوں اسے سمجھتے ہیں، تو کمالِ علمی بھی عجیب تھا اور جمال بھی ان کا عجیب تھا، اس کے بعد بادشاہ نے ان

سے کہا کہ حضرت! میری خواہش یہ ہے کہ میں براہِ راست اور ڈائرکٹ آپ سے خواب کی تعبیر سنوں چنانچہ بادشاہ نے براہِ راست خواب کی تعبیر اور تدبیر حضرت یوسفؑ سے سنی جو اس نے غائبانہ قاصد سے سنی تھی، تو اس پر بادشاہ نے کہا کہ خواب کی تعبیر بھی دل لگتی ہے اور تدبیر بھی نہایت مستحکم اور اچھی معلوم ہوتی ہے مگر اب سوال یہ ہے کہ اس کو انجام کون دے گا؟ کام بہت بڑا ہے اور کسی شئ کو عملی طور پر انجام دینا وہ کارے دارد، بڑی چیز ہے، آپ کسی کے سامنے کوئی خاکہ پیش کردے کوئی تھیوری پیش کردے وہ تو آسان ہے، مگر کسی شئ کو پریکٹیکلی عملاً پیش کرنا یہ دشوار ہوتا ہے، تو بادشاہِ مصر نے یہ بات کہی کہ یہ سارا انظام کرے گا کون؟ تب حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ ’’اجعلنی علیٰ خزائن الارض‘‘ مجھ کو مصر کے خزائن کا آپ اختیار دیدیں (حوالہ بالا)۔

انی حفیظ علیم

’’انی حفیظ علیم‘‘ بیشک میں اس کی حفاظت بھی کروں گا اور میں اس کو جانتا بھی ہوں، تو آپ نے حفاظت اور علم کا ذکر فرمایا، اگر ذمہ دار میں صفتِ حفاظت نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ وہ ناس مارے گا کہ چور بن جائے خائن بن جائے بہت موقعہ ہے اس کے لئے جیسے اس وقت دنیا میں ہو رہا ہے کہ جتنے بھی حکام ہیں اور بعض ملکوں میں تو نیچے کے کلکٹر سے لیکر پریزیڈنٹ تک پورا کا پورا عملہ ہی بگڑا ہوا ہوتا ہے حمام میں سبھی ننگے اس قسم کی شکل ہوتی ہے سبھی رشوت خور ہوتے ہیں، تو غرض یہ کہ حفاظت کا ذکر فرمایا کہ: میری طرف سے ان خزانوں کے ضائع ہونے کی کوئی شکل نہیں ہوگی انشاءاللہ، میں حفاظت کروں گا اور ظاہر ہے کہ حفاظت کے ضمن میں یہ بات بھی ہے کہ میں خود اسے غلط مقام میں صرف نہ کروں اور جو اس کا حقیقی محل اور مصرف ہے کہ جہاں اسے خرچ کرنا ہے اس کا بھی تو آدمی کو علم ہونا چاہئے کہ جو خزانہ ہے اس کو ڈالے کہاں؟

لاخیر فی الاسراف ولکن لا اسراف فی الخیر

کیونکہ ہرشئ خداتعالی کے حکم کے ماتحت ہوتو ٹھیک ہے ورنہ وہی چیز معصیت ہوجاتی ہے، اسی لئے ایک بزرگ سے کسی نے کہا کہ آپ بہت اسراف کرتے رہتے ہیں اور''لاخیر فی ا لاسراف'' کہ اسراف میں کوئی خیرنہیں ہے انہوں نے فوراًفرمایا کہ ''ولااسراف فی الخیر''(خطبات حکیم الاسلام ج۴ص۳۸۳) خیر میں اسراف بھی نہیں ہے کہ مہمان کی خدمت کرنی ہے کسی غریب کا تعاون کرنا ہے تو وہ خیر کا مقام ہے اس میں اسراف نہیں اورانہوں نے یہ کہا تھا کہ اسراف میں خیرنہیں ہے۔

اسراف اورتبذیر کا فرق

تواسراف اورتبذیر دوالگ الگ چیزیں ہیں، اسراف تووہ ہوتاہے کہ کسی محل اورمصرف میں خرچ ہوزیادتی کے ساتھ (قاموس الفقہ ج۲ص۴۱۱) اورتبذیر یہ ہے کہ موقعہ ہی نہیں ہے(حوالہ بالا) جیسے مثال کے طور پرآپ کھانے کیلئے ہوٹل میں تشریف لے گئے اور دس روپیہ میں آپ کا پیٹ بھرسکتا ہے دس پاؤنڈ خرچ کرکے آپ کا پیٹ بھرسکتا ہے وہاں آپ نے پچاس پاؤنڈخرچ کیا یہ اسراف کہلائے گا،تبذیر یہ ہے کہ سرے سے محل ہی نہیں مثلاًکہیں ڈانس کی محفل ہورہی تھی اس میں آپ قدم رنجہ فرمارہے تھے تشریف لے جارہے تھے تو یہ تبذیر کہلائے گی جوابتداء ہی سے قطعاً غلط ہے(معارف القرآن ج۵ ص۴۵۸)۔

انی حفیظ علیم فرمانے کی وجہ

توحاصل یہ کہ بادشاہ سے انہوں نے گفتگو کی اور دوصفت کاذکرکیا ایک ''حفیظ''دوسرے''علیم' بقول حکیم الاسلامؒ کہ جیسا کل میں نے ذکرکیا تھا کہ حسن وجمال کا تذکرہ نہیں کیا کہ وہ فطری چیز ہےاور یہ کمالات ہیں (خطبات حکیم الاسلام ج۳ص۱۴)

حضرت یوسف علیہ السلام کی تاج پوشی

اب اس موقعہ پر ایک عجیب بات یہ پیش آئی بعض تفاسیر میں لکھا ہے کہ ایک سال تک بادشاہ نے انہیں اپنے یہاں مہمان رکھا پہلے تو مصر کے پرائم منسٹر عزیزِ مصر تھے ان کے یہاں رہے تھے اب یہ ملکِ مصر کا جو بادشاہ ہے ان کے یہاں انہوں نے رکھا ایک دم سے یہ عہدہ انہیں سپرد نہیں کر دیا بلکہ پہلے ان کے طور وطریق کو ان کے اطوار واخلاق کو اور ان کے افعال واعمال کو اور احوال کو جانچا، تو معلوم ہوا کہ بڑے پختہ کار نہایت تجربہ کار دنیوی شعور بھی دینی شعور بھی اخلاقی معیار بھی بہت بلند غرض یہ کہ بادشاہ نے محسوس کیا کہ آپ کمالات کا مرقع اور مجموعہ ہے، چنانچہ جب بادشاہ پورے طور پر مطمئن ہو گیا تو مطمئن ہونے کے بعد پھر ایک جلسہ بلایا جس میں افسران تھے حکمران تھے اور تمام بڑے قسم کے ذمہ داران تھے ان کو جمع کیا گیا اور اس کے بعد بادشاہ نے حضرت یوسفؑ کے سر پر تاجِ شاہی رکھا یہ ایک توقیر ہے اور تمام ذمہ داران کو یہ بتایا کہ اب میں ان کو پرائم منسٹر بنا رہا ہوں اور عزیزِ مصر کو معزول کر دیا (معارف القرآن ادریسی ج ۴ص ۱۴۰) اس لئے کہ ان کی عمر بھی ہوگئی تھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی بادشاہ کو دعوتِ توحید

حضرت یوسفؑ جب پرائم منسٹر بنے تو نہایت عمدہ اور بہتر انتظام انہوں نے کیا یہاں تک کہ پھر یہ بھی شکل ہوئی کہ بادشاہ کو بھی انہوں نے دین کی دعوت پیش کی جو مسلمان نہیں تھا اور نتیجۃً بادشاہ نے بھی اسلام قبول کیا (حوالہ بالا)۔

جواہرات کی اہمیت

ایک طرف تو عزیزِ مصر کو برطرف کیا اور کچھ دنوں بعد اس کا انتقال بھی ہو گیا اور زلیخا کی حالت یہ ہوئی کہ وہ ایک نہایت خستہ حال اور معمولی مکان میں رہتی تھی اور وہ

بت پرست تھی اور ویسے جوشاہی زمانہ اس پر گذرا ہے اس زمانہ کے ہیرے جواہرات اس کے پاس تھے اور جواہرات بڑے کام کرتے ہیں، جب برما کی آمدنی ایک دم بند ہوگئی تو راندیرا اور اس طرف کے بہت سے مقامات جو برما سے تعلق رکھنے والے تھے ان کے پاس جو جواہرات تھے وہ آج تک چل رہے ہیں بلکہ بعض گھرانوں کا خرچہ ہی اس پر چل رہا ہے، تو غرض یہ کہ زلیخا کے پاس بھی بہت سے جواہرات تھے۔

تقویٰ پر ادھار ہی نہیں نقد بھی ملتا ہے

حضرت یوسف علیہ السلام کی سواری شہر میں نکلتی تھی اور بڑی شان کے ساتھ نکلتی تھی اور حق تعالیٰ نے تقویٰ کی شان سے ان کو نوازا تھا، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ تقویٰ کی زندگی پر صرف ادھار ہی نہیں بلکہ نقد بھی ملتا ہے۔

متقی کا شرف

متقی کا سب سے بڑا شرف یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے قلوب میں اس کے لئے محبت اور احترام ہوتا ہے، طبیعتیں اس سے مانوس ہوتی ہیں اور فاسقوں سے مایوس ہوتی ہیں، تو لوگوں کے قلوب میں عظمت و توقیر کی کیفیت یہ تقویٰ کا اثر ہے، حتیٰ کہ نباتات پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔

حضرت بشرِ حافی رحمہ اللہ کا واقعہ

بشر حافیؒ کے متعلق ہے کہ وہ جس بستی میں رہتے تھے وہاں راستوں پر جانور بھی پیشاب اور لید وغیرہ نہیں کرتے تھے، ایک روز کسی صاحب نے دیکھا کہ جانور نے راستہ میں لید کی تو وہ سمجھ گئے کہ بشرِ حافی کا انتقال ہوگیا (الافاضات الیومیۃ جلد نہم ملفوظ ۲۴۰) اور لکھا ہے کہ بشر حافیؒ ننگے پیر پھرا کرتے تھے تواضع اور عبدیت بہت غالب تھی اس لئے ننگے پیر پھرتے تھے، یا شیخ سے بیعت ہوئے تھے اس وقت جوتے پیر میں نہیں تھے اس لئے

زندگی بھر ایسے ہی رہے، یہ استقامت کی بات تھی، تو اس آدمی نے یہ اندازہ لگایا کہ حضرت بشر حافی کا انتقال ہو گیا ہوگا، تو جانور تک ان کا احترام کرتے تھے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالی نے جمال کمال اور..............

تو حضرت یوسف علیہ السلام کی سواری نکلتی تھی اور گھوڑا بھی ان کا ایسا تھا جو خاص شان کے ساتھ ہنہناتا تھا لوگ راستہ میں صرف حضرت یوسف علیہ السلام کے دیدار کیلئے کھڑے رہتے تھے اس لئے کہ وہ باجمال بھی تھے وہ ایسے نہیں تھے جیسے بعض جگہ کے پرائم منسٹر ہوتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر طبیعت مکدر ہو جائے، بالکل عجیب سی کیفیت ہوتی ہے جیسے افریقن ممالک کے بعض پرائم منسٹر ہوتے ہیں، حضرت تو بڑے جمالیات کے مالک تھے، غرض یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا لشکر اور سواری شام کے وقت نکلتی تھی سیکوریٹی گارڈ ساتھ میں ہوتے تھے انتظامات تھے اور ساری شکلیں اور ادھر زلیخا کی کیفیت یہ تھی کہ وہ راستہ کے کنارے کھڑی ہو کر حضرت یوسف علیہ السلام کو پکارتی تھی مگر کوئی اسکی طرف دھیان نہیں دیتا تھا۔ (تفسیر ابن کثیر)

کم بخت میں آج سے تیری منکرہ ہوں اور یوسف کے رب............

ایک روز ایسا ہوا کہ اسے غصہ آیا اور وہ گھر پہنچی گھر میں جو بت تھا اس سے پہلے ایک بات سن لے روح البیان میں لکھا ہے کہ وہ وہاں سے منتقل ہو کر بانس کے گھر میں رہنے لگی تھی اور حالت انتہائی خستہ اور حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت ابھی دل سے گئی نہیں تھی وہ شعلہ اندر ہی تھا اور وہ تخم اور وہ پودا اندر ہی اندر پھل پھول رہا تھا، تو زلیخا کے دل میں محبت تھی اور وہ شام کے وقت جب حضرت یوسف علیہ السلام کی سواری نکلتی تھی حضرت یوسف علیہ السلام کو آواز دیتی تھی مگر اتنا ہجوم ہوتا تھا کہ ٹھیک اسکی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی، ایک روز اسے غصہ آیا اور جلال میں آ کر اس نے بت سے کہا کہ کمبخت!

آج سے میں تیری منکرہ ہوں میں تجھے نہیں مانتی ہوں اور میں یوسف کے رب پر ایمان لاتی ہوں، یہ بات اس نے کہی اور اس روز شام کو جو سواری نکلی اور وہ راستہ پر جا کر کھڑی ہوئی اور آواز لگائی تو اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حکم دیا کہ وہ آواز یوسفؑ کے کان میں پہنچے چنانچہ ان تک آواز پہنچی اور وہ متوجہ ہوئے اور لوگوں سے پوچھا کہ کس کی آواز ہے؟ تو بتایا گیا کہ راستہ کے کنارے ایک عورت کھڑی ہے وہ آپ کو آواز دے رہی ہے حضرت کے ساتھ جو سیکوریٹی گارڈ تھے وہ اس کے پاس پہنچے اور پوچھا کیا کام ہے؟ زلیخا کہنے لگی کہ کام تو ان ہی سے ہے میں تم سے بات کرنا نہیں چاہتی، حضرت یوسفؑ سے جب خادموں نے جا کر کہا کہ وہ تو صرف آپ سے بات کرنا چاہتی ہے تو آپ نے فرمایا کہ اچھا اسے محل پر لاؤ، ان کا فرمانا تھا تو پھر کیا دیر لگتی چنانچہ اس کو لیجایا گیا انتہائی بوڑھی عجیب شکل تھی نہ دانتوں کا ٹھکانہ نہ آنکھ کا ٹھکانہ اور رنگ بھی پھیکا پڑ گیا تھا، تو غربت بھی تھی اور پریشانی بھی تھی۔

عشق کے ہاتھوں آدمی کا برا ہی حال ہوتا ہے

اور حق یہ ہے کہ عشق کے ہاتھوں آدمی کا برا حال ہوجاتا ہے، حضرت حکیم الامت تھانویؒ جب مکہ مکرمہ پہنچے ہیں حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی خدمت میں تو سوانح نگار لکھتا ہے کہ جب گئے تھے تو شباب پھوٹا پڑتا تھا اور جب چھ مہینہ کے قیام کے بعد واپس لوٹے ہیں تو عشق کے ہاتھوں برا حال ہوگیا تھا، عجیب وغریب خستگی کی کیفیت تھی ان پر۔

تقویٰ کی برکت اور معصیت کی نحوست کا اثر

تو غرض یہ کہ زلیخا جب سامنے آئی ہے تو پوچھا تم کون ہو؟ وہ کہنے لگی تم مجھے نہیں پہچانتے؟ حضرت یوسفؑ نے فرمایا نہیں، زلیخا کہنے لگی کہ پاک ہے وہ ذات جس

نے معصیت کی وجہ سے بادشاہت جس کے پاس تھی اسے تو غلامی کی حیثیت دیدی اور تقویٰ کی وجہ سے غلام کو بادشاہت کی حیثیت دیدی اور حضرت یوسفؑ سے کہا کہ میں زلیخا ہوں جس کے گھر میں تم رہے تھے، حضرت یوسفؑ کواسکی یہ حالت دیکھ کر بڑا تاثر ہوااس لئے کہ شریف الطبع انسان تھےاور شریف آدمی اپنے محسن کو جب اس حالت میں دیکھے تو ظاہری بات ہے کہ طبیعت پر اثر ہوگا اور پیغمبر سے زیادہ نرم دل اور بااخلاق کون ہوگا۔

میری تین حاجتیں ہیں

حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ زلیخا نے کہا کہ میری تین حاجتیں ہیں ایک حاجت تو یہ ہے کہ آپ دعا کرے کہ میرا شباب واپس لوٹ آئے یعنی جوانی جا چکی ہے اور جوانی کو کہتے ہی ہیں جوانی اس لئے ہے کہ وہ جا وانی چھے (جانے والی ہے) شاعر کہتا ہے کہ ؎

ہم نے بھی سیل جہان فانی دیکھی
ہر شئی یہاں آنی جانی دیکھی
جو آکر نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
اور جو جاکر نہ آئے وہ جوانی دیکھی

بڑھاپا آتا ہے وہ جاتا نہیں ساتھ لے جانے کی بات کرتا ہے کہ آپ بھی ساتھ چلیے میں اکیلا کمزور کیسے جاؤں گا تو شاعر کہتا ہے کہ جوانی جا کر آتی نہیں ہے اور بڑھاپا آتا ہے تو ساتھ لیکر جاتا ہے ایک بڑے میاں کی کمر جھکی ہوئی تھی وہ جا رہے تھے کلپٹن کا کوئی منچلا جوان ہوگا اس نے پوچھا کہ بڑے میاں کیا تلاش کر رہے ہو؟ بڑے میاں نے کہا کہ جوانی گم ہوگئی ہے اس کو تلاش کر رہا ہوں اس لئے کہ جُھک کر آدمی کسی چیز کو

ڈھونڈھتا ہے (مجالس خطیب الامت ص۲۱۳) تو غرض یہ کہ ایک بات تو یہ کہی کہ میرا شباب واپس لوٹ آئے، جوانی واپس آجائے اور دوسری بات یہ کہی کہ شباب کے ساتھ ساتھ میرا جمال بھی واپس لوٹ آئے اور تیسری درخواست یہ ہے کہ آپ مجھ سے شادی کرلے میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں، زلیخا کی پہلی درخواست پر حضرت یوسف علیہ السلام نے دعا فرمائی تو جوانی لوٹ آئی اور دوسری درخواست پر دعا فرمائی تو جمال بھی لوٹ آیا تیسری کے بارے میں تأمل تھا اور سوچ رہے تھے تو جبرئیلِ امین تشریف لائے اور خدا تعالیٰ کا پیغام سنایا کہ آپ زلیخا کی بات مان لے اور اس سے شادی کرلے اس طرح زلیخا سے حضرت یوسف علیہ السلام کی شادی ہوگئی۔

نکاح بہتر ہے یا زنا؟

شادی کے بعد جب حضرت یوسفؑ کی زلیخا سے تنہائی ہوئی تو حضرت یوسفؑ نے زلیخا سے کہا کہ بتاؤ! یہ ملاقات جو حلال طریقہ سے ہورہی ہے یہ بہتر ہے یا وہ جس کی طرف تم نے مجھے دعوت دی تھی اس کے جواب میں زلیخا نے کہا کہ آپ مجھے شرمندہ نہ کرے اس لئے کہ اس وقت آپ کا شباب تھا اور ادھر میرے شوہر فرصت علی خاں (نامرد) تھے اس لئے مجبوری کی شکل تھی اس بنیاد پر مجھ سے یہ بات ہوئی ہے (گلدستۂ تفاسیر ج۳ص۴۷۷) خیر حضرت یوسف علیہ السلام نے پھر بات ٹال دی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی صحبت کی برکت

تفسیرِ روح البیان میں لکھا ہے کہ پھر ہوا یہ کہ حضرت یوسفؑ زلیخا کو بہت چاہنے لگے مگر زلیخا کی کیفیت یہ تھی کہ اس کی حضرت یوسفؑ کی طرف وہ توجہ جو جوانی کے زمانہ میں تھی وہ اب نہیں رہی، حضرت یوسفؑ نے زلیخا سے کہا کہ یہ عجیب بات ہے کہ اُس وقت تم ہم پر نثار تھیں اور ہمیں بہت چاہتی تھیں اور اب یہ رنگ ہے کہ وہ محبت نہیں

اور ہمارے اندر تمہاری محبت موجود ہے، تو زلیخا نے جواب دیا کہ آپ کی صحبت کی برکت سے میرے دل میں حق تعالیٰ کی محبت ایسی پیوست ہوگئی ہے کہ آپ کی طرف بھی توجہ کم ہوتی ہے۔

یہ بدلے کی شکل ہوگئی

اللہ تعالیٰ کی شان کہ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ دونوں میں بے تکلفی کی وجہ سے مسابقت کی شکل ہوئی مسابقت جو باب مفاعلہ سے ہے جس کے معنی ہے دوڑ کرنا کہ دونوں ایک ساتھ ایک جگہ کھڑے ہوجائیں اور دوڑیں اور یہ کوشش کریں کہ کون آگے بڑھ جائے، کون سبقت لے جائے حضرتِ یوسفؑ اور زلیخا دونوں نے دوڑ لگائی، زلیخا آگے نکل گئی، حضرت یوسفؑ بڑے لحیم وشحیم تھے اب جو حضرت یوسفؑ نے پیچھے سے زلیخا کا کرتہ پکڑا تو وہ پھٹ گیا اس پر زلیخا نے کہا کہ یہ بدلے کی شکل ہوگئی کہ کسی زمانہ میں آپ آگے تھے اور میں نے پیچھے سے کرتہ پکڑا تھا اور وہ پھٹ گیا تھا اور آج شکل یہ ہے کہ آپ نے میرا کرتہ پکڑا اور وہ پھٹ گیا۔

بیوی کے ساتھ بے تکلف رہنا چاہئے

ابوداؤد شریف کی حدیث ہے حضرتِ عائشہؓ فرماتی ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ دوڑ لگائی ہے مسابقت کی ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بیوی کے ساتھ بے تکلف رہنا یہ وقار اور پوزیشن کے خلاف نہیں ہے، ورنہ بعض لوگ گھر میں جا کر آفت مچاتے ہیں اور قیامت برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وہ تو مرچ کی طرح ہے

ایک جگہ دو عورتیں اپنے شوہر کے باب میں باتیں کرنے لگی ایک نے دوسری سے پوچھا کہ تمہارا شوہر کیسا ہے؟ اس نے کہا کہ بہت اللہ کا کرم ہے، اب اس نے اس

سے پوچھا کہ تمہارا شوہر کیسا ہے؟ تو وہ کہنے لگی کہ بات جانے دو بالکل مرچ جیسا ہے، تو بعض دفعہ ایسی بھی شکل ہوتی ہے۔

خیر کم خیر کم لاھلہ

تو بیوی کے ساتھ بے تکلفی ہونی چاہئے، حضورﷺ فرماتے ہیں کہ ’’خیر کم خیر کم لاھلہ وانا خیر کم لاھلی ‘‘ (بخاری شریف، باب حسن المعاشرۃ فضل عائشۃ) تم میں بہتر وہ ہے جو اپنے اہل وعیال کے ساتھ بہتر ہو۔

بعض آدمی سیٹنگ روم میں بایزید اور بیڈروم میں یزید بن جاتے ہیں

ورنہ بعض لوگ سیٹنگ روم میں تو انتہائی بااخلاق ہوتے ہیں اور بایزید بسطامی بن جاتے ہیں اور بیڈروم میں جاکر وہ یزید بن جاتے ہیں۔

بیوی سے بے تکلفی کا ایک واقعہ

تو غرض یہ کہ حضرت عائشہؓ اور نبی کریم ﷺ میں مسابقت کی شکل ہوئی تو پہلی مرتبہ حضرت عائشہؓ آگے نکل گئی کیونکہ اس وقت حضرت عائشہؓ دبلی پتلی تھی کچھ عرصہ بعد حضور ﷺ نے پھر حضرت عائشہؓ کے ساتھ دوڑ لگائی اس مرتبہ حضور ﷺ سبقت کر گئے (ابوداؤد، خطبات حکیم الامت ج ۴ص۲۷۴) چونکہ پہلی مرتبہ حضرتِ عائشہؓ سبقت کر گئی تھی اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی وقت تم سابق تھی اور اب یہ مکافات کی شکل ہے، تو اللہ تعالیٰ کا یہ نظام ہے اور حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی کسی کو سابق فرماتے ہیں اور کبھی مسبوق بنادیتے ہیں، تو زلیخا نے یہ بات کہی کہ ایک وقت تھا کہ آپ کا کرتہ میرے ہاتھوں پھٹا تھا اور آج یہ شکل ہے، بہرحال حضرت یوسفؑ زلیخا کے ساتھ رہے اور ان کے یہاں اولاد بھی ہوئی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی ''حفیظ علیم،، کی عملی تدبیر

تو قصہ یہ پیش آیا کہ ادھر عزیزِ مصر کا انتقال ہوگیا اور ادھر مَلِکِ مصر مسلمان ہوگیا اوراس کے بعد ساری شوکتیں ساری حیثیتیں حضرت یوسفؑ کو حاصل تھیں، چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بڑا شاندار انتظام فرمایا کہ اس سے لوگوں کی ضرورتیں بھی پوری ہوئیں اور ضرورتوں کے پورا ہونے کے ساتھ ساتھ دلوں میں محبوبیت بھی پیدا ہوئی، حضرت یوسف علیہ السلام ایک خاص مقدار سے لوگوں کو غلہ دیتے تھے تا کہ اسراف نہ ہو بگاڑ نہ ہو۔

خدا تعالی کی دی ہوئی نعمتوں کی ناقدری نہ کرو

یہاں ایک اہم بات سن لے یہ جتنے فورین مما لک ہیں وہاں بہت سے لوگ نعمتوں کی ناقدری بہت کرتے ہیں، کتابوں میں لکھا ہے کہ آدمی کھانا بھی پکائے تو تناسب سے، مہمانوں کو خوش دلی کے ساتھ کھلانا اوران کے لئے وسعت کرنا یہ تو بہت اچھی بات ہے، مگر بہت سے لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ ذرا سی بات پر کھانے کو ڈسبین کے ڈبہ میں پہنچا دیا تو کثرت سے نعمتوں کا بگاڑ ہوتا ہے، بس ایک جملہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ جو خدا نعمتیں دینے پر قادر ہے وہ چھیننے پر بھی قادر ہے، اس کا خاص اہتمام ہونا چاہئے، آپ تو ہندو پاک کے رہنے والے ہیں آپ کو تو معلوم ہے کہ وہاں کتنے گھرانے ایسے ہیں جہاں پر فاقہ ہوتا ہے، کتنے لوگ ایسے ہیں کہ جو روٹی چٹنی کھاتے ہیں۔

ایک افطار ایسا بھی، ہم عبرت پکڑیں

میں نے ایک مرتبہ شولا پور میں تراویح پڑھائی پوری بیس رکعت، بعد میں پھر بیماری کی وجہ سے چھوڑ دیا، ورنہ پہلے الحمدللہ پوری بیس رکعت پڑھاتا تھا، وہاں میں نے

دیکھا کہ لوگ بیچارے افطار میں آتے ہیں روٹی اور بھاجی لیکر وہی انکی افطاری ہوتی تھی اور وہی ان کا کھانا بھی ہوتا تھا۔

۳۳ کروڑ دیوتا کو ماننے والے تو ایک ہو گئے اور ایک.............

عجیب حالات ہیں ہمارے ملک کے اور پھر یہ فسادات کی نحوست ہے تو اب پوچھنا ہی کیا ہے، اتنی تباہی مچی ہوئی ہے ملک میں الامان والحفیظ، دعائیں کرنی چاہیے خاص طور سے رو رو کر گڑگڑا کر کہ اللہ پاک رحم فرمائے، کفار منظّم نظام کے ساتھ مسلط ہیں اور افسوس کی بات یہ ہے کہ تینتیس (۳۳) کروڑ دیوتاؤں کو ماننے والے تو رام جنم بھومی کے نام پر ایک ہو گئے اور ایک خدا کو ماننے والوں کو آپس میں لڑائی جھگڑے سے ہی فرصت نہیں یہ بہت افسوس کی بات ہے۔

الاقتصاد فی النفقة نصف المعيشة

میں ذکر کر رہا تھا کہ حضرت یوسفؑ نے بہترین انتظام فرمایا اور حدیث شریف سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''الاقتصاد فی النفقة نصف المعيشة'' (دروس التاریخ حصہ اول) آدمی میانہ روی اختیار کرے تو معیشت میں آدھا گذران تو یہی ہے، اسلام نہ بخیلی سکھاتا ہے کہ آدمی مکھی چوس بن جائے اور اسلام یہ بھی نہیں سکھاتا کہ انسان مُسْرِف بن جائے کہ اندھا دھند جو سمجھ میں آئے وہ کرے۔

دولت مسلمان کو چمٹی لیتی ہے

اگر اللہ تعالیٰ نعمت عطا فرمائے تو آپے سے باہر نہیں ہونا چاہیے، مصیبت یہی ہے کہ مسلمان کے پاس دولت آتی ہے تو ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ: مسلمان کو دولت چمٹی لیتی ہے، آپ دیکھ لیجئے کہ دوسری قوموں کے پاس بے پناہ پیسہ ہے مگر پتہ بھی نہیں چلتا اور ان الذین آمنوا کے پاس جہاں تھوڑے پیسے آ گئے تو وہ بالکل بدل جاتا ہے

کہ گویا پوری دنیا کا سپر پاور وہی ہے، ظرف بڑا ہونا چاہئے، سینہ بہت بڑا ہونا چاہئے آدمی تواضع کے ساتھ رہے کسی کو حقیر نہ سمجھے، حق تعالی شانہ قادرِ مطلق ہے کب کیا حالات پیش آجائے؟ تو آدمی کو ڈرنا بھی چاہئے، مہمان نوازی ضرور کرے کشادہ دستی سے کام لے وہ سب صحیح، لیکن اس کی کوشش کرے کہ نعمتوں کا بگاڑ نہ ہو، وہ ضائع نہ ہونے پائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی بہترین انتظامی تدبیر

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حضرت یوسفؑ نے بہترین انتظام فرمایا اور بہت تناسب کے ساتھ کہ لوگ فاقہ بھی نہ کرے اور بھوک سے مرے بھی نہیں اس طرح سات سال گذرے ہیں، سات سال گذرنے کے نتیجہ میں شاہی گودامیں جتنی تھیں وہ سب غلّوں سے بھر گئیں، لوگ اعتدال کے ساتھ چیزوں کو استعمال کرتے تھے اور دیکھئے موٹی سی بات ہے جو آدمی مشکلات میں رہتا ہے اس کو اگر نعمت مل جائے تو اس کے لئے تو جینا آسان ہے جو آدمی پتھر پہ سونے کا عادی ہو اس کو بستر پر سلائے تو اس کو بہت آسانی کے ساتھ نیند آجاتی ہے اور جو بستر پر سونے کا عادی ہو اس کو پتھر پر سلائے تو معاملہ مشکل ہو جائے گا، یا مثلاً کوئی آدمی بہت اعلیٰ قسم کے کھانا کھانے کا عادی ہے اب اس کے سامنے باسی سوکھی روٹی آئے گی تو ظاہر بات ہے کہ اس کے حلق سے نیچے نہیں اترے گی، اسی لئے حافظ شمس الدین ابنِ قیمؒ نے لکھا ہے کہ اگر کوئی عذر نہ ہو تو آدمی کو چاہئے کہ ہر قسم کی چیز استعمال کرے جو سامنے آجائے، ہاں! اگر کوئی عذر ہو تو الگ بات ہے، ورنہ عام حالات میں آدمی کو جفاکشی کی عادت رکھنا چاہئے، کب کیا ضرورت پیش آجائے۔

حج وعمرہ کے سفر میں بھی اگر فکر ہے تو کھانے پینے کی

جو لوگ حج وعمرہ کیلئے جاتے ہیں مختلف ممالک سے میں نے دیکھا کہ عموماً

لوگوں کو بس یہی فکر ہوتی ہے کہ کیا کھائیں گے، ارے زندگی بھر تو کھاتے رہے کھانا تو تمہارا ہضم نہیں ہوتا اور اس کے لئے خدا جانے کیا کیا ڈرنک پیتے رہتے ہوں، چند دن ہے اس میں تو آدمی جو سامنے آئے وہ کھالے۔

آخرت کا کام مقدم ہے دنیا کا کام مؤخر ہے

وہاں اصل فکر تو طہارت، نماز، تلاوت، طواف یہ سب چیزوں کی ہونا چاہئے اس کا اہتمام ہونا چاہئے، مگر لوگ کھانے کا اتنا اہتمام کرتے ہیں کہ بس پوچھو مت معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کا موضوع ہی یہی ہے، کھانا ضروریاتِ زندگی میں سے ضرور ہے، مگر مقاصدِ زندگی میں سے نہیں ہے اس کا درجہ بعد میں ہے، اسی لئے بچہ پیدا ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی جاتی ہے (اعلاء السنن ج ۷ اص ۱۲۳) یہ آخرت والا عمل ہے اور اس کے بعد کسی بزرگ سے چھوہارا وغیرہ چبا کر اس کے تالو میں لگاتے ہیں جس کو تحنیک کہتے ہے تو یہ کھانا دنیا والا عمل ہے، اب آپ دیکھئے کہ اذان واقامت کو مقدم کیا اور تحنیک کا مسئلہ بعد میں ہوا، معلوم ہوا کہ آخرت کا کام مقدم ہے اور دنیا کا کام مؤخر ہے۔ روزی کا مسئلہ اِس کام کے بعد اختیار کیا جائے بنیادی چیز یہ ہے کہ آخرت کا کام مقدم ہونا چاہئے، تو حق تعالیٰ شانہ مدد فرمائیں گے ویسے اسباب کے درجہ میں آدمی قدم بھی اٹھائے۔

قحط بڑی خطرناک چیز ہے

حضرت یوسفؑ نے بہترین انتظامات فرمائے، سات سالہ خوشحالی کے بعد اب قحط کا زمانہ آیا دکاڑ جسے کہتے ہے اور دُکاڑ بڑی خطرناک چیز ہے ایسے ایسے واقعات تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں کہ دنیا کے مختلف مما لک میں جب قحط ہوئے ہیں تو لوگوں نے بھوک کے مارے اپنی اولاد تک کو کھالیا (طشت جواہر ص ۳۱۴ بحوالہ تاریخ ابن کثیر) اللہ تعالی

پناہ میں رکھے، نبیٔ کریم ﷺ نے اس سے پناہ مانگی ہے ''اللھم انی اعوذ بک من الجوع فانه بئس الضَّجِیْعُ'' (ابوداؤد، کتاب الصلوۃ، باب الاستعاذۃ) اے اللہ! میں بھوک سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں وہ بہت برا رفیقِ خواب ہے، بھوک بہت سخت چیز ہوتی ہے۔

جہنم کا سب سے بھاری عذاب بھوک ہے

ترمذی شریف کی روایت ہے کہ جہنم میں جتنے عذابات ہیں اس میں ایک عذاب بھوک کا بھی ہوگا اور ایسی شدید بھوک ہوگی جہنمیوں کو کہ دوسرے سارے عذاب اسکے سامنے ہلکے معلوم ہوں گے، تو بھوک جو پیٹ کی مار، جلن اور آگ ہے یہ بڑی چیز خطرناک چیز ہے، اللہ تعالیٰ ہی اپنے فضل سے محفوظ رکھے، آمین، ہم تو کمزور ہیں، بھوک کی وجہ سے آدمی تقویٰ تو کھوہی دیتا ہے اور اللہ بچائے بعض دفعہ اس کی وجہ سے آدمی ایمان بھی کھو بیٹھتا ہے۔

قحط صرف مصر تک ہی محدود نہیں تھا

غرض یہ کہ قحط کا زمانہ شروع ہوا اور قحط صرف مصر تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کے اطراف میں بھی ہوا حتّٰی کہ ملکِ شام میں بھی اس کے اثرات پہنچے ہیں اور پھر نتیجۃً حضرت یوسفؑ کے بھائی غلّہ لینے کیلئے مصر تشریف لائے ہیں اور خود حضرت یوسفؑ بھی ۲۴ گھنٹے میں ایک ہی دفعہ کھانا کھاتے تھے (بہارگلستاں شرح گلستاں ص ۴۱۸) حضرت یوسفؑ نے انتظام فرمایا اور انتظام ایسا بہترین تھا کہ اس کے نتیجہ میں لوگوں کی جانیں بھی بچی ہیں اور شاہی خزانہ دولت سے مالا مال ہوا ہے، چنانچہ غلہ لینے کے لئے حضرت یوسفؑ کے پاس اطراف سے بھی لوگ آنا شروع ہوئے، یہاں تک کہ حضرت یعقوبؑ نے بھی اپنے دس صاحبزادوں کو غلّہ لینے کی غرض سے مصر بھیجا۔ آج گفتگو اسی پر ختم کرتے ہیں بقیہ تفصیل آئندہ کل عرض کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

درس نمبر ۲۵ سے حاصل ہونے والی چھ اہم ہدایات

(۱)معصیت کی نحوست کا نقصان آخرت میں تو ہے ہی صحیح دنیا میں بھی اس کا ضرر پہنچتا ہے معصیت بادشاہوں کو غلام تک بنا دیتی ہے زلیخا کا واقعہ اسکی نشاندہی کرتا ہے۔

(۲)صحبت کی برکت ضرور ظاہر ہوکر رہتی ہے حضرت یوسف علیہ السلام سے زلیخا کی شادی کے بعد کا واقعہ ہمیں اس کا پتہ دیتا ہے، ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اچھی صحبت کا اہتمام کرے۔

(۳)بیوی کے ساتھ بے تکلف رہنا چاہئے اور بیوی کے ساتھ بے تکلف رہنا یہ وقار اور پوزیشن کے خلاف نہیں ہے حضور ﷺ کی سیرت سے ہمیں یہ بات بہت اچھی طرح معلوم ہوسکتی ہے۔

(۴)آدمی خرچ میں میانہ روی اختیار کرے تو معیشت میں آدھا گذران تو یہی ہے لوگ مفلسی کا رونا تو روتے ہیں مگر اس جانب توجہ نہیں کرتے ضرورت ہے اس جانب توجہ کرنے کی۔

(۵)آخرت کا کام مقدم ہے اور دنیا کا کام مؤخر ہے، یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ دنیا انسان کی ضرورت تو ہے مگر مقصد نہیں ہے، مگر آج انسانوں کی اکثریت نے دنیا کو مقصد سمجھ لیا ہے اسی وجہ سے ان کے نزدیک دنیا مقدم ہے اور آخرت..........۔

(۶)من جملہ اور دعائے نبوی کہ اس دعا کو بھی اللہ تعالی سے مانگتے رہنا چاہئے ’’اللھم انی اعوذ بک من الجوع فانہ بئس الضَّجِیُعُ‘‘۔

درس نمبر (۲۶)

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم، امابعد!

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ☆ بسم اللہ الرحمن الرحیم

وکذلک مکنا لیوسف فی الارض یتبوأ منها حیث یشاء، نصیب برحمتنا من نشاء ولا نضیع اجر المحسنین☆ ولاجر الآخرة خیر للذین آمنوا وکانوا یتقون☆ (یوسف ،آیت:۵۶/۵۷) ☆ **صدق اللہ العظیم.**

قحط ہوتا کیوں ہے؟

بزرگانِ محترم! حق تعالیٰ شانہ نے اپنے لطف وکرم سے حضرت یوسف علیہ السلام کو تین مراحل سے گذار کر بادشاہی تک پہنچادیا، کنعان کے کنویں میں تھے پھر عزیزِ مصر کے محل میں رہے، مصر کے جیل خانہ میں قیام فرمایا اور پھر بعد میں حق تعالیٰ نے جو عزیزِ مصر کا منصب تھا، عہدہ تھا جسے وزیرِ اعظم کا عہدہ کہنا چاہئے اس پر ان کو فائز فرمایا، آپ نے نظام اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد بہت خوش اسلوبی کے ساتھ غلہّ کی ذخیرہ اندوزی شروع کی کہ بقدرِ ضرورت استعمال بھی ہوتا تھا اور حفاظتی تدبیر بھی فرماتے تھے، پھر قحط شروع ہوا اور بڑا زبردست قحط، یہاں ایک بات ذہن میں رہے کہ قحط ہوتا کیوں ہے؟ دُکاڑ جسے کہتے ہیں گجراتی میں، اس کو آپ ایک موٹی سی مثال سے سمجھ لے مدرسہ میں کوئی طالب علم سرکشی کرے، دیر سے آئے، پڑھنے میں جی نہ لگائے، تو انتظامیہ اس کے لئے یہ شکل کرتی ہے کہ دو چار روز کیلئے اس کا کھانا بند کردیتی ہے یہ سختی کی شکل ہوتی ہے یا خود گھر میں آپ دیکھتے ہیں کہ بچہ سرکش ہو اور انتہائی طوفانی ہو تو بعض دفعہ بغرضِ تنبیہ والدین اس کا کھانا موقوف کردیتے ہیں کہ تم کو کھانا نہیں ملے گا، تم طوفان بہت کرتے ہو، یا تم نے سبق یاد نہیں کیا، یا تم نے محنت نہیں کی لہذا تم کو کھانا نہیں ملے گا، تو انبیاء کرام امتوں کیلئے جو سبق لیکر آئے ہیں اس کو قومیں اور امتیں جب بھول جاتی ہیں

توحق تعالیٰ کی طرف سے حضرتِ مکائیلؑ کوحکم ہوتا ہے کہ بارش موقوف کردے، گویا اس عالم کے مطبخ کے وزیر اور یوں کہنا چاہئے وزیرِ خزانہ حضرت میکائیلؑ ہے ان کی طرف سے یہ شکل وجود میں آتی ہے، اللہ تعالی کی طرف سے جب انہیں امر ہوتا ہے کہ بندے سرکش ہوگئے ہیں نافرمانی کررہے ہیں تو کچھ روز کے لئے ان کا دانہ پانی بند کردیا جائے تو وہ بارش روک دیتے ہیں، زمین سے اگنے کی صلاحیت بھی گویا موقوف سی ہوجاتی ہے، اورصورت یہ ہوتی ہے کہ لوگ پریشان ہوتے ہیں، اس کا اصل منشا یہی ہوتا ہے جو میں نے ابھی ذکر کیا۔ کبھی یہ تنبیہ مختصر ہوتی ہے اور کبھی طویل بھی ہوجاتی ہے، اسی لئے قحط سات سالہ رہا، خود نبیٔ کریم ﷺ کوقوم نے بہت ستایا تو حق تعالیٰ کی طرف سے شکل یہ ہوئی کہ ان پر بھی قحط آیا اور قحط کی ایسی شکل ہوئی تھی کہ لوگوں کو دن میں اندھیرا دکھائی دیتا تھا یعنی ضعف کی وجہ سے آنکھیں کام نہیں کرتی تھی، تو جیسے وہاں قحط کی شکل ہوئی ہے یہاں بھی قحط آیا ہے اور تنبیہ کی شکل ہوئی ہے، باقی اس سے زیادہ اورکوئی چیز نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالی کے خزانہ میں کچھ کمی آگئی ہو جیسے دنیا کی گورمینٹ کرتی ہے وہاں یہ ساری شکل نہیں ہے، حق تعالیٰ کے خزانے بھرے ہوئے ہیں اوررات دن کا خرچ کرنا اس میں کوئی کمی نہیں کرتا، غرض یہ کہ حق تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ کی شکل ہوتی ہے۔

ہم بھی عزیزِ مصر کے پاس جائیں

قحط عام تھا مختلف شہروں اور مختلف ملکوں میں تھا اور لوگوں کو خبر ملی تھی کہ مصر میں ایک شخص ہے عزیزِ مصر وہ بہت اچھا انتظام کرتے ہیں اور مناسب قیمت میں غلہ فروخت کرتے ہیں اورضرورتیں لوگوں کی پوری ہوجاتی ہیں، تو قحط میں بھی تعمیم ہوئی اور شدہ شدہ یہ خبر حضرتِ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں تک بھی پہنچی ہیں، تو انہوں نے اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام سے کہا کہ ہم بھی عزیزِ مصر کے پاس غلہ لینے کے لئے پہنچے اور والد نے بھی خود اس میں مصلحت سمجھی اس لئے کہ بدن کی ضروریات ہیں اس کے بغیر جینا

دو بھر ہے، مشکل ہے، تو یہ طے پایا کہ گیارہ بیٹوں میں سے دس بیٹے غلہ لینے کے لئے جائیں اور بنیامن جو چھوٹے تھے ان کو والد نے اپنی تسلی کیلئے اپنے پاس روکے رکھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے فراق سے انہیں بہت تکلیف تھی اور ویسے بھی یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی تھے اخیافی جسے کہتے ہے یعنی ماں شریک بھی تھے والد تو سب کے ایک تھے ہی اور چونکہ وہ چھوٹے بھی تھے اس وجہ سے ان کو تو اپنے پاس رکھا (تفسیر عثمانی) اور اپنے دس بڑے بیٹوں کو اجازت دی کہ تم مصر پہنچو اور غلہ لے آؤ اس لئے کہ قحط کی شکل ہے، چنانچہ یہ لوگ مصر پہنچے، کچھ شکستہ حال تھے، پریشانی کی کیفیت تھی اور لوگ ان سے واقف نہیں تھے اس لئے اب کی مرتبہ داخلہ کے باب میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے کوئی خاص وصیت نہیں کی (معارف القرآن ادریسی ج ۴ ص ۱۴۸) ورنہ دوبارہ جب یہ مصر آئے ہیں تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے باقاعدہ تاکید فرمائی کہ ’’لاتدخلوا من باب واحد وادخلوا من ابواب متفرقة‘‘ (یوسف، آیت: ۶۷) تاکہ کہیں بچوں کو نظر نہ لگ جائے، تو یہ لوگ آئیں اور آنے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے، حضرت یوسفؑ لوگوں کو جو غلہ دیتے تھے اس کا اندازیوں سمجھئے کہ تقریباً پانچ من سالانہ کے تناسب سے ایک آدمی کو قیمت کے ساتھ غلہ ملتا تھا۔

برادرانِ یوسف حضرت یوسف علیہ السلام کو کیوں نہیں پہچان پائے؟

وجآء اخوة یوسف ’’(یوسف، آیت: ۵۸) حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی مصر آئے اور کیفیت یہ ہوئی کہ وہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے ہیں تو حضرت یوسف علیہ السلام نے تو ان کو پہچان لیا اور یہ ان کو نہیں پہچان سکے، ان کیلئے تو حضرت یوسف علیہ السلام اجنبی تھے، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حضرت یوسفؑ ننھے منھے سات سال کے تھے جب فراق ہوا تھا اور ایک تفسیری روایت کے اعتبار سے اس وقت ان کی عمر پینتالیس، چھیالیس سال کی تھی چالیس سے بھی متجاوز، تو سات سال میں آپ

نے کسی کو دیکھا ہو اس کو آپ ۴۵، ۴۶ سال کی عمر میں دیکھے تو شناخت دشوار ہوتی ہے، پھر دوسری بات یہ کہ ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک چھوٹا بھائی جس کو بچپنے میں قافلہ کی نذر کردیا خدا جانے وہ کہاں ہلاک ہوگیا ہوگا، ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھا، وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یوسف عزیزِ مصر بن جائیں گے جن کے ساتھ ہم نے یہ معاملہ کیا تھا، تو احتمال بھی نہیں تھا، عمر بھی زیادہ تھی (معارف القرآن ادریسی ج ۴ ص ۱۴۵) تیسرے یہ کہ انہوں نے غور بھی نہیں کیا اور اگر کسی درجہ میں کوئی خیال کسی کو آیا بھی ہو تو پوچھنے کی جرات اور جسارت کس میں تھی کہ وہ وزیرِ اعظم تھے، پرائم منسٹر تھے، ان سے پوچھے کہ آپ کون ہیں اور کیا ہیں (تفسیر عثمانی) اس لئے وہ لوگ تو رہے ناواقف۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی اپنے بھائیوں کو ایک تجویز

اور حضرت یوسف علیہ السلام ان سے واقف ہوگئے، ان کو بلوایا، گھر کے حالات کی تحقیق کرنا چاہتے تھے مگر وہ اس حکیمانہ انداز سے کی کہ اپنا تعارف نہیں ہونے دیا فرمایا کہ تم لوگ کہاں سے آئے ہو؟ انہوں نے کہا ہم لوگ کنعان سے پہنچے ہیں وہاں بھی قحط کی شکل ہوئی ہے، فرمایا کہ: اس بستی کے تو تم معلوم نہیں ہوتے ہو اور میں کیا جانوں کہ تم واقعۃً غلہ لینے آئے ہو، ممکن ہے کسی ملک کی سی، آئی، ڈی ہو، یا کوئی اور منشا اور مقصد ہو، تم وضاحت کرو کہ تم کون ہو؟ کیا ہو؟ تا کہ ہم تمہارے باب میں مطمئن ہو جائے، انہوں نے کہا کہ حاشا وکلاّ یہ خیال نہ فرمائے کہ ہم سی، آئی، ڈی بن کر اس ملک میں آئے ہیں اور ہمارا کوئی اور مقصد اور منشا ہو ایسا کچھ بھی نہیں ہے، ہمارے والد کا نام یعقوب ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں اور ہم ان کی اولاد ہیں اور غلہ لینے کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اس کے سوا اور کوئی منشا نہیں ہے (معارف القرآن ادریسی ج ۴ ص ۱۴۵) حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا کہ تمہارے اور بھی کوئی بھائی

ہیں؟ کہنے لگے کہ ہاں! ہمارے ایک اور چھوٹے بھائی ہے ان کا نام بنیامن ہے والد نے اپنی تسلی اور اطمینانِ خاطر کیلئے ان کو اپنے پاس روک لیا ہے ہمارے ایک اور چھوٹے بھائی تھے یوسف وہ بچپن میں ہلاک ہوگئے۔ (حوالہ بالا) انہیں کیا خبر کہ وہ ان کے سامنے ہی تشریف فرما تھے، تو انہوں نے کہا کہ وہ بچپن میں ہلاک ہوگئے اور ان کے فراق سے باپ کو بہت صدمہ پہنچا ہے اس وجہ سے انہوں نے اپنی تسلی کیلئے چھوٹے بھائی کو اپنے پاس رکھ لیا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ: خیر غلہ تو ہم آپ کو دیئے دیتے ہیں مگر ہمیں کیسے پتہ چلے کہ آپ سچے ہیں لہٰذا ایک بات تو یہ ہے کہ اگر تمہیں واپس غلہّ کی ضرورت پڑے، چونکہ جانتے تھے سات سالہ قحط ہے، تو فرمایا کہ ہم تمہاری بات کو جبھی سچاّ سمجھیں گے جب تم بنیامن کو اپنے ساتھ لیکر آؤ (حوالہ بالا) ورنہ ہم یہ سمجھیں گے کہ تم دھوکہ دے کر ایک آدمی کا غلہ زیادہ لے جانا چاہتے ہو اور حضرت یوسف علیہ السلام نے نظام یہ بنا رکھا تھا کہ جو آپ کے پاس پہنچے اسی کو غلّہ ملتا تھا، غرض یہ کہ ان کے باب میں حکم دیا کہ ان کو شاہی مہمان خانہ میں ٹھہرایا جائے اس لئے کہ یہ سب ان کے بھائی تھے، ان کا اکرام ہوا، تو قیر ہوئی بہت احترام سے ان کو رکھا اور اس کے بعد ان کو غلہ دیا گیا اور جب وہ جانے لگے ہیں تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے کارکن سے کہا کہ یہ جو رقم لیکر آئے ہیں اس کو ان کے غلہّ کے ساتھ اس طرح چھپا کر رکھ دی جائے کہ غلہ کے ساتھ ساتھ وہ بھی پہنچ جائے (حوالہ بالا)۔

یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے وصال کی تمہید تھی

آپ دیکھئے کہ قدرت کا کیسا نظام ہے کہ خدا تعالیٰ کو ان سے وصال کروانا اور ملانا ہے تو اس کی یہ تمہید ہو رہی ہے۔

حضرت یوسفؑ نے اپنی موجودگی کی اطلاع اپنے والد کو کیوں نہیں دی؟

خیر یہ حضرات غلہ لے کر کنعان چلے گئے، یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اتنے زمانہ تک والد سے جدا رہے اور بھائیوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ والد بہت غم زدہ ہیں اور اپنی تسلی کیلئے انہوں نے بنیامن کو اپنے پاس روک لیا ہے، ان ساری چیزوں کو جاننے کے باوجود حضرت یوسف علیہ السلام نے والد کو اپنی خبر کیوں نہیں دی؟ اس لئے کہ ماں باپ سے اگر اولاد جدا ہو جائے تو ماں باپ کی بیقراری بہت زیادہ ہوتی ہے، یہاں ایک بات پتہ کی سن لے آج کے اس دور میں اولاد بعض دفعہ ماں باپ سے غائب ہو جاتی ہے، مثلاً باپ نے تنبیہ کی تو لڑکا گھر سے نکل گیا، ہندوستان میں بھی ایسے واقعات ہوتے ہیں، کوئی پہنچ گیا کسی شہر میں اور وہاں اس نے ہیرے گھسنا شروع کر دیئے صلاحیت تو اسکی ویسے ہی گھسی جا رہی ہے، ایسی صورت میں ہوتا یہ ہے کہ اولاد تو کھیل کود میں، سرکشی میں، نوجوانی کے جوش میں ماں باپ کو بھول جاتی ہے مگر ماں باپ کے دل کو قرار نہیں ہوتا ہے، کسی نے صحیح کہا ہے کہ ماں باپ کی محبت دلی محبت ہوتی ہے کہ اولاد کتنی ہی نالائق ہو بہرحال اولاد ہوتی ہے، بزرگوں نے اس کی مثال ایسی دی ہے کہ آدمی اپنے ہاتھ کی انگلی کو کاٹ کر پھینک دے تو اس میں ہوگا یہ کہ وہ تو تھوڑی دیر میں بے حس ہو جائے گی مگر یہ شخص بیقرار اور بے چین رہے گا (ارشادات گنگوہی ص۵۲) تو اولاد اگر چلی جائے تو وہ تو گھنے پھرنے میں، کھانے پینے میں اور مزے میں اپنے والدین کو بھول جائے مگر والدین بھلا اولاد کو کیسے بھول سکتے ہیں، یہی وہ حکمت ہے کہ جب جنتی جنت میں پہنچیں گے تو رشتے بھی منقطع کر دیئے جائیں گے، ورنہ مثال کے طور پر جنتی جنت میں گئے اور انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارا فلاں رشتہ دار جہنم میں ہے، سخت عذاب میں ہے تو ان کی جنت تو عذاب ہو جائے گی، مصیبت ہو جائے گی، اس

کو آپ مثال سے ایسے سمجھ لے کہ خدا نہ کرے، خدا نہ کرے کسی کے رشتہ دار کو پولیس پکڑ کر جیل لے جائے، ظاہر ہے کہ وہ کسی کا بھائی ہے، کسی کا بھانجا ہے اور کسی کا چچا ہے تو رشتے دار اگر جیل میں ہے اور عید آئی تو ظاہر ہے سارے رشتے داروں کیلئے وہ عید کیا وہ تو محرّم بن جائے گی کہ ان کے لئے ماتم کی بات ہے کہ ہم تو یہاں عید منائیں اور ہمارا بھائی جیل میں سزا میں گرفتار ہے، اسی لئے بہت بہت دفعہ کوششیں کر کے ایسے موقعہ پر تھوڑی دیر کیلئے بھی اس کو جیل سے چھڑا کر لاتے ہیں، تو کہنے کا منشا یہ ہے کہ اپنا حال چاہے کتنا ہی اچھا ہو مگر اپنے عزیز کا حال ٹھیک نہ ہو تو آدمی کو تکلیف ہوتی ہے یہ ایک فطری بات ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ ایک حقیقت ہے تو حضرت یوسف علیہ السلام جیسا شریف بیٹا اللہ تعالی نے جسے علم عطا فرمایا حق تعالی جسے نبوت سے نوازنے والے ہیں تو کیا ان کو اتنا احساس نہیں ہوا کہ مجھے ابا جان اتنا چاہتے تھے ان پہ کیا کچھ گذری ہوگی اور وہ تو بقول بعض مفسرین کہ جب زلیخا کے گھر میں تھے تبھی خبر دے سکتے تھے کسی کے ساتھ پیغام بھیج دیتے کہ میں یہاں پر ہوں آپ اطمینان رکھئے گا انشاء اللہ کسی وقت ملاقات ہو جائے گی اس سے آدمی کو بھی تسلی اور اطمینان ہو جاتا ہے، تو عزیزِ مصر کے گھر میں تھے تب بھی خبر نہیں دی، اسکے بعد قید خانہ میں پہنچے جب بھی خبر نہیں دی حالانکہ وہاں سے بھی اطلاع ہو سکتی تھی کیونکہ وہاں بھی وہ سب کے منظورِ نظر تھے اور پھر جب تختِ شاہی پر آئے تب تو خبر دے ہی دینی چاہئے تھی اور قحط کا زمانہ شروع ہوا اور بھائیوں سے ساری تفصیلات معلوم ہوئیں اس وقت تو سوال ہی نہیں تھا چھپانے کا اس وقت تو خبر دے ہی دینی چاہئے تھی، تو صاحبِ روح المعانی کا خیال یہ ہے وہ لکھتے ہیں کہ غیبی طور پر یہ نظم ہوا اس لئے کہ مدتِ فراق جو علمِ الٰہی میں تھی وہ پوری ہونی تھی اور ایک روایت بھی بیہقی کی مل گئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو وحی کے ذریعہ بتایا گیا

تھا کہ اپنی اطلاع اپنے والد کو نہ دے تا کہ ادھر باپ کیلئے بھی ترقئ درجات کا سبب ہو (معارف القرآن ادریسی ج ۴ص ۱۶۵)۔

محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ کا علمی مقام

شیخ محی الدین ابنِ عربیؒ جو بہت بڑے بزرگ گذرے ہیں ان کی باتیں اگر بیان کی جاتی ہیں تو وہ علماء کے بھی سر پر سے گذرتی ہیں تو عوام کا تو پوچھنا ہی کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ حزن وغم کی وجہ سے انسان کو روحانی ترقی بہت زیادہ ہوتی ہے اور بلند مقامات نصیب ہوتے ہیں، تو غرض یہ کہ باپ کیلئے وہ مقدر تھا اور ان کے لئے یہ مقدر تھا کہ وہ بھی فراق کی تکلیف برداشت کرے، اس لئے حضرت یوسف علیہ السلام نے اس وقت اطلاع نہیں کروائی اور نہ یہ ظاہر کیا کہ میں یوسف ہوں۔

عزیزِ مصر کے اخلاق کی رپورٹ خدمتِ یعقوبی میں

غرض یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کہنے پر ان کے سامان میں وہ قیمت رکھ دی گئی اور وہ غلہّ لے کر کنعان پہنچے گھر پہنچکر وہ اپنے والد سے کہنے لگے کہ ابا جان! عزیزِ مصر بڑے شریف آدمی ہیں ان کے اخلاق اور ان کی مہمان نوازی کا کیا کہنا ہمارے ساتھ اس طرح پیش آئے اور یہ سلوک کیا اور یہ کیا اور وہ کیا، قرآنِ کریم کا اسلوب اجمالی ہوتا ہے اس میں وہ ساری جزئیات کی تفصیل نہیں ہوتی کہ ہم کو کہاں ٹھہرایا اور کیا کھلایا اور کیا پلایا اور ناشتہ میں کیا تھا اور کھانے میں کیا تھا قرآنِ کریم ان جزئیات پہ نہیں جاتا وہ تو انسانوں کے کلام میں ہوتا ہے اور اس میں عورتوں کا معاملہ ان کا تو پوچھنا ہی کیا ہے ان کی تفصیلات تو بہت ہی عجیب وغریب ہوتی ہے، تو غرض یہ کہ وہ اپنے گھر پہنچے اور جانے کے بعد کہا کہ والد بزرگوار! اللہ تعالی کا ہم پہ بہت کرم رہا کہ عزیزِ مصر نے ہمیں غلہ دیا اور ہم نے اپنے بھائی بنیامن کیلئے غلہ مانگا تو ان کے لئے بھی دیا مگر آئندہ کیلئے

انہوں نے کہا ہے کہ جب تم دوبارہ آؤ تو ان کو اپنے ساتھ لیکر آنا تب غلہ ملے گا ورنہ غلہ نہیں ملے گا، یہ باتیں ہوتی رہی اور اس درمیان میں انہوں نے گھٹری کھولی تو اس میں رقم رکھی ہوئی تھی اور وہ رقم بھی اس انداز سے رکھی تھی کہ ان کو اندازہ ہوگیا کہ یہ بھول سے اندر نہیں رہ گئی ہے، بعض دفعہ آدمی سمجھتا ہے کہ بھول سے رہ گئی ہوگی، لیکن وہ غلہ کے ساتھ اس ترتیب سے رکھی ہوئی تھی کہ جس کو ''رُدّت الینا'' کہا گیا، اس کا مطلب ہے کہ ہماری طرف قصداً الوٹائی گئی ہے (گلدستۂ تفاسیر ج۳ص۴۸۵) یہ تو ہمارے ساتھ ان کا اور زیادہ اخلاقی سلوک ہے، ایک تو انہوں نے ہمارے ساتھ وہاں جو سلوک برتا اس لحاظ سے بھی ہمیں جانا ہے اور رقم لوٹادی گئی اس لحاظ سے بھی ہمیں پہنچنا ہے، مگر چونکہ عزیز مصر نے تاکید کی تھی کہ آئندہ آؤ تو اپنے بھائی بنیامن کو اپنے ساتھ لے کر آنا تو آپ ہمیں اجازت دے کہ ہم بنیامن کو بھی اپنے ساتھ لے جائے اور ہم اطمینان دلاتے ہیں کہ ہم ان کی حفاظت کریں گے۔

برادرانِ یوسف کا ایک اور سوال اور اس کا جواب

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ: بس تم رہنے دو، میں جانتا ہوں تم کتنی حفاظت کروگے، مثل مشہور ہے ''دودھ کا جلا ہوا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے'' آدمی کو ایک دفعہ کسی معاملہ میں چوٹ لگ جاتی ہے تو پھر وہ بہت سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہے۔

دو حدیثوں میں تطبیق کی شکل

اور حدیث شریف میں ہے کہ مؤمن ایک بل سے دو دفعہ نہیں ڈسا جاتا (ترجمان الحدیث ص۱۹۸ بحوالہ بخاری شریف) مثلاً کسی بل اور سوراخ میں ہاتھ ڈالا حضرتِ بچھو اندر تشریف فرما تھے انہوں نے ڈنک ماردیا تو اب دوبارہ وہ اس میں انگلی نہیں ڈالے گا، تو

یہاں تو یہ فرمایا اور ایک حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ : المومن غرّ کریم (خطبات حکیم الاسلام ج۳ص ۵۵۶) مؤمن بھولا بھالا ہوتا ہے، تو پہلی حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہوشیار ہوتا ہے اور دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن بھولا بھالا ہوتا ہے، تو ان دونوں میں کوئی تکرار اور تضاد نہیں ہے، مؤمن اپنے مزاج کے لحاظ سے بھولا ہوتا ہے اسکی طبیعت میں شرافت ہوتی ہے اور اپنے شعور کے لحاظ سے انتہائی بیدار اور عقلمند ہوتا ہے۔

عقل اور چیز ہے اور تجربہ اور چیز ہے

اسی لئے صالحین میں جو علماء ہوتے ہیں اللہ تعالی نے ان کو بڑی عقل دی ہوئی ہوتی ہے، دیکھئے عقل اور چیز ہے اور بقول حکیم الامتؒ کے تجربہ اور چیز ہے (الافاضات الیومیۃ حصہ ہشتم ملفوظ ۲۱۶) بعض دفعہ کسی لائن میں آدمی کو تجربہ ہوتا ہے اس لائن کی خبر ہوتی ہے، باقی یہ ضروری نہیں ہے کہ عقل بھی اس کی بڑھکر ہو جائے، عقل اور چیز ہے، آپ ایک بہت بڑے فلسفی اور سائنٹسٹ کو جیسے آپ کے یہاں نیوٹن گذرا ہے اس کو آپ کسی جوتے پالش کرنے والے کے پاس بٹھا دے اور وہ اس سے اچھی پالش کرے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ نیوٹن سے زیادہ عقلمند ہے، تو تجرباتی دنیا اور چیز ہے اور عقل اور چیز ہے، دونوں میں بڑا فرق ہے۔

اللہ تعالیٰ مفسرین کو جزائے خیر دیں دل کو لگتی باتیں کہی ہیں

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے پونجی واپس کیوں کر دی؟ تو اس میں ایک احتمال یہ لکھا ہے کہ شریف آدمی تھے لہذا اپنے بھائیوں سے معاوضہ لینا پسند نہیں کیا (معارف القرآن ادریسی ج۴ص ۱۴۶) یہاں ایک بات یاد رہے حضرت یوسف علیہ السلام نے جو رقم اپنے بھائیوں کو واپس کی تو ایسا نہیں ہے کہ ان کو

مفت میں غلہ دیدیا بلکہ اس غلہ کی قیمت اپنے پاس سے خزانہ میں جمع کردی تھی، ایسا نہیں ہے کہ اندھیر کھاتہ ہے کہ چلو بھائی آگئے تو ایسے ہی دیدیا گیا، نہیں، جو جنتا اور پبلک کا مال ہے قوم کا مال ہے اس کا خصوصی اہتمام کرنا چاہئے، خصوصی طور پر اس کا استعمال ٹھیک نہیں، اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ کوئی آدمی مسجد میں پہنچے اور مسجد میں اس کے علاوہ کوئی نہ ہو وہ اکیلا ہو تو وہ اکیلا کسی ایسی چیز کو استعمال کرے جس کا تعلق عام لوگوں سے ہو جو عام وقف کی ہو تو یہ احتیاط کے خلاف ہے، چنانچہ مجھے بعض ایسے اتفاقات ہوئے تو اس صورت میں بعضوں نے دیکھا کہ یہ نماز پڑھ رہا ہے تو پنکھا چلادیا، تو مجھے اس سے سخت گرانی ہوئی اور میں نے پنکھا بند کروادیا، یہاں انگلینڈ میں تو ہر آدمی نے مسجد میں پڑاؤ ہی ڈالا ہوا ہے میں دیکھتا ہوں کہ پوری مسجد کی بتیاں جلتی رہتی ہیں اور ہے صرف ایک آدمی تو اس میں احتیاط برتنی چاہئے، جو مال وقف کا ہو اس کی حفاظت سب کے ذمہ ہے، خالی (صرف) مؤذن صاحب کے ذمہ نہیں ہے کہ وہ جلال میں آتے رہے خفا ہوتے رہے، نہیں، بلکہ سب کا ذمہ ہے کہ سب اس کی حفاظت کریں چونکہ یہ سب سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی طرف سے رقم جمع کردی اور پسند نہیں کیا کہ اپنے بھائیوں سے قیمت لے اور اس لئے بھی رقم واپس رکھدی کہ ہوسکتا ہے کہ جب رقم دیکھیں گے تو چونکہ خاندانِ نبوت کے لوگ ہیں اور خاندانِ نبوت کے لوگ محتاط و شریف ہوتے ہیں تو اس پونجی کو لوٹانے کی غرض سے شاید واپس آئیں (تفسیر مظہری) اور یہ بھی حکمت لکھی ہے کہ ہوسکتا ہے جو رقم لیکر آئے ہیں اس کے علاوہ ان بیچاروں کے پاس کوئی اور رقم ہی نہ ہو (معارف القرآن ادریسی ج ۴ ص ۱۴۶) تو دوبارہ وہ کیا منہ لیکر آئیں گے، تو شرافتِ خاندانی اور تقویٰ کی وجہ سے لوٹانے کا خیال ہوگا یا یہ کہ سرے

سے کوئی رقم ہی نہ ہو اس اعتبار سے لوٹا دی ہو (تفسیر عثمانی) یا یہ کہ بھائیوں سے اس کو لینا پسند نہیں کیا اس وجہ سے واپس دیدی، اللہ تعالیٰ مفسرین کو جزائے خیر دیں کہ کتنی دل لگتی باتیں لکھی ہیں اور پیغمبروں کے کام میں ساری حکمتیں ہوسکتی ہیں۔

عشق کے امتحان اور بھی ہیں

خیر جب باپ کے سامنے یہ معاملہ آیا تو باپ کو بھی خوشی ہوئی ہوگی کہ واقعی عزیزِ مصر ہر دلعزیز معلوم ہوتا ہے کہ اسکی کرم فرمائی صرف مصر ہی کی حد تک منحصر نہیں ہے اس کے اطراف میں بھی ہے اسکے بعد پھر دن گذرے اور جب وقت ہوا اور ان کو غلہ کی ضرورت پیش آئی تو دوبارہ پھر جانے لگے، تو اب بھائیوں نے طے کیا کہ بنیامن کو بھی ساتھ لے جائے، مگر حضرت یعقوب علیہ السلام کا دل ان کو چھوڑنے کیلئے تیار نہیں تھا، مگر حق تعالیٰ چاہتے تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا کچھ اور امتحان لیا جائے اور بنیامن جوان کی تسلی اور اطمینان کا ذریعہ ہے یہ سہارا بھی چھوٹ جائے اور بالکل ذات باری سے ان کا مسئلہ متعلق ہو جائے اور ادھر سے ان کی نظر ہٹ جائے۔

محبوب کی نظر میں غیرت ہوتی ہے

اور بعض عارفین نے تو لکھا ہے کہ محبّ کی طبیعت میں غیرت ہوتی ہے حضرت یوسف علیہ السلام کی طبیعت میں بھی غیرت تھی، ممکن ہے انہوں نے یہ خیال کیا ہو اور یہ بات حدیث سے ثابت نہیں ہے یہ گویا معرفت کی بات ہے کہ ممکن ہے انہوں نے خیال کیا ہو کہ جو نظرِ محبت مجھ پر پڑ رہی تھی وہ نظرِ محبت بنیامن پر پڑ رہی ہے، تو غیرتِ یوسفی نے اس بات کا تقاضہ کیا کہ وہ نظر بنیامن پر اب نہ پڑے اور میری ہی طرف رہے، تو وہ بیچ کی آڑ کی جو ایک شکل تھی اسے بھی ہٹا دیا گیا، تو یہ دنیائے محبت و معرفت کی بات ہے، تو اب حاصلِ کلام یہ نکلا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو ان کے لختِ جگر بنیامن کو بھی جدا کرنے

کا وقت آرہا ہے اور بڑوں کی آزمائش ہوتی ہے۔

نہ دیکھ آزمائش نشان بندگان محترم
آزمائش ہوتی ہے انہی کی جن پہ ہوتا ہے کرم

آزمائش تو بڑوں کی ہوتی ہے ہم جیسے ضعفاء کی کیا آزمائش کہ جن کو ایک ٹائم چائے نہ ملے ایک وقت کھانا نہ ملے تو ہم لوگ پریشان ہو جاتے ہیں آزمائشیں اور حالات تو برداشت کرنے والوں پر آئے اور وہ برداشت کر گئے۔

امامِ غزالیؒ کا ایک بہترین ارشاد

اگر وہ حالات اس وقت آئے تو؟ امامِ غزالیؒ نے لکھا ہے کہ بعض لوگ یہ تمنا کرتے ہیں کہ کاش! ہم حضور ﷺ کے زمانہ میں ہوتے تا کہ ہم بھی صحابی ہوتے، وہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالی کا شکر کرو کہ اُس زمانہ میں نہیں ہوئے ورنہ منافقین کی فہرست میں نام ہوتا، اُس زمانہ میں صحابہ کو ایسے ایسے حالات پیش آئیں ہیں کہ آدمی اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا، تبوک کے موقعہ پر ایسا بھی ہوا ہے کہ پیاس کی ایسی شدت تھی کہ اونٹ ذبح کیا گیا اور اونٹ کی اوجھڑی میں جو پانی ہوتا ہے اس کو نچوڑا گیا صاف کیا گیا اور وہ پانی انہوں نے پیا یہ گویا کیفیت تھی، بس معلوم ہوتا تھا کہ جان عنقریب نکل جائے گی، تو جو حالات صحابہ پر آئے ہیں اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے، یہ سب انہوں نے دین کیلئے کیا ہے، اب یہ نمک حرامی ہی کہنا چاہئے کہ چودھویں صدی میں آدمی صحابۂ کرام پر کیچڑ اچھالے انہوں نے کیسے کیسے مجاھدے دین کو پھیلانے کیلئے کئے، یہ اعلی درجہ کی نمک حرامی اور اعلیٰ درجہ کی احسان فراموشی کی بات ہے۔

فراق وصال سے کیوں بدلا؟

تو خیر میں یہ عرض کر رہا تھا کہ انہوں نے کہا کہ ابا جان! آپ مطمئن ہو جائیے،

آپ اطمینان رکھئے ہم اسکی حفاظت کی پوری کوشش کریں گے،حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا جہاں تک تم ان کی حفاظت کر سکتے ہو وہ تو تمہارے ذمہ ضروری ہے اور پھر فرمایا کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس پر اللہ تعالیٰ نگراں ہے، شاہد ہے وہی اس کی خبر رکھے، اسی لئے بعض تفسیروں میں لکھا ہے اور غالبًا حضرت کعب بن احبارؒ کا قول ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ جملے کہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: قسم ہے میرے عزت وجلال کی کہ جب یعقوب نے معاملہ میرے سپرد کیا ہے تو میں دونوں بیٹوں کو ان سے ملا کر رہوں گا اور نتیجۃً وصال کی شکل سامنے آئی۔

العینُ حقٌّ

جب یہ لوگ جانے لگے تو باپ نے نصیحت کی اور کہا کہ ''یبنی لاتدخلوا من باب واحد وادخلوا من ابواب متفرقة'' حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ تم سب ایک دروازے سے داخل مت ہونا الگ الگ دروازے سے داخل ہونا، یہ بات کیوں کہی؟ اس لئے کہ پہلی دفعہ جب یہ گئے ہیں تو اس وقت جیسا کہ میں نے ذکر کیا تھا وہ پریشان حال تھے اور سفرِ طویل کر کے گئے تھے اور لوگ ان سے واقف بھی نہیں تھے، مگر جب عزیزِ مصر نے ان کے ساتھ سلوک کا معاملہ کیا ان کا اکرام کیا اور تھے سب شبیھوں وجیہ، آخر وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ہی بھائی تھے، تو وہ یوسف تو نہ ہوں گے لیکن بہر حال کچھ تو ہوں گے اور بادشاہ نے ان کے پہلے سفر میں ان کی توقیر کی تھی اس لئے بھی ان کی امتیازی پوزیشن ہو گئی تھی اور شاہی مہمان خانہ میں ان کو ٹھہرایا گیا تھا، اس وجہ سے سخت اندیشہ تھا کہ لوگوں کی نگاہیں پڑیں اور نظر پڑنے میں بعض نظریں ایسی ہوتی ہیں کہ جس میں سَمِّیَّتْ کی کیفیت ہوتی ہے تو نظر لگنے کا ڈر ہے اور نظر کا لگنا حق ہے اس لئے حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ بات کہی، ایک صاحب کے پاس ایک عورت آئی اس

کا بچہ بالکل کالا کلوٹا تھا انتہائی بدشکل اور اس کی ناک بھی بہہ رہی تھی اس نے آنے کے بعد عامل سے کہا کہ میرے لال کو نظر لگ گئی ہے تو اس کے لئے تو وہ لال (لعل) ہی ہے واقعۃً یاقوت وزمرد ہے چاہے دوسروں کی نظر میں کچھ نہ ہو۔

محبوب کو دیکھنے کیلئے محبّ کی نظر چاہئے

جیسے مجنوں سے کسی نے پوچھا تھا کہ لیلیٰ میں کیا رکھا ہوا ہے کہ تم ہر وقت اس کا دم بھرتے ہو، ہر وقت لیلیٰ لیلیٰ کا وظیفہ پڑھتے رہتے ہو اس میں ایسی کونسی خوبی اور جمال ہے، کیونکہ لیلیٰ کوئی حسن و جمال والی نہیں تھی، مجنون نے کہا کہ اس کو دیکھنے کیلئے میری نظر چاہئے، معشوق کو دیکھنے کیلئے عاشق کی نگاہ چاہئے، محبوب کو دیکھنے کیلئے محبّ کی نظر چاہئے، تو وہ نظرِ عشقی اگر پیدا ہو جائے کہ کچھ فتنے اٹھے حسن سے اور کچھ حسنِ نظر سے وہ حسنِ نظر اگر پیدا ہو جائے اصغر گونڈی کی زبان میں تو ظاہر بات ہے کہ پھر انسان کیلئے اس مسئلہ کو سمجھنا سہل ہے اور اگر اس کی نظر مجنون کی نہیں ہے تو اس کے لئے پھر لیلیٰ کی کیا پوزیشن ہے، لیلی کی کیا حقیقت ہے؟ مجنون کو اس کے والدین کعبۃ اللہ لے گئے اور غلافِ کعبہ پکڑ وا کر اس سے دعا کروائی کہ کہو کہ اے اللہ! میں لیلیٰ کی محبت سے توبہ کرتا ہوں تو اس نے یہ دعا کی کہ یا اللہ! میں ہر شئ سے توبہ کرتا ہوں سوائے لیلیٰ کی محبت کے (خطبات حکیم الامت ج ۲ ص ۲۲۲، مواعظ اصلاحیہ ص ۳۸۸) وہ محبت ایسی تھی کہ وہ اس سے توبہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

متنبّی کہتا ہے کہ عشق ایسی چیز ہے کہ جیسے معشوق میں حلاوت ہے ویسے ہی بیچ کے واسطہ میں بھی حلاوت پیدا ہو جاتی ہے۔

العین حقٌّ

تو اس موقعہ پر یہ تاکید کی گئی کہ سب کے سب ایک دروازے سے مت داخل

ہونا، اس سے معلوم ہوا کہ نظر کا لگنا حق ہے اور اب تو دنیا کے علوم وفنون نے بڑی ترقی کی ہے اور کرتے ہی چلے جارہے ہیں کہتے ہیں کہ جس کی نظر لگتی ہے اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جس میں سَمِّیَّتُ گویا پوئزن کا اثر ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے بعض دف پتھر تک پھٹ جاتا ہے اور موت تک واقع ہوجاتی ہے (گلدستۂ تفاسیر ج ۳ ص ۴۸۷ بحوالہ قرطبی) حدیث شریف میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے ''العین حق'' (بخاری شریف) نظر لگنا حق ہے اور نظر لگنے کی وجہ سے آدمی بیمار پڑجاتا ہے آدمی پر اثرات ہوجاتے ہے بلکہ موت تک واقع ہوسکتی ہے، تو جب بری نظر کا لگنا حق ہے تو کسی اہلِ دل اور صاحبِ نظر کی نظر بھلا نہیں لگے گی؟ یقیناً اللہ والوں کی نظر پڑنے سے دوسری تبدیلی پیدا ہوجائے گی۔

مولانا پرتا بگڈھیؒ کا پڑھنے لائق ارشاد

بمبئی میں حضرت مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی (قدس سرہ) نے ایک مجلس میں فرمایا کہ ندوہ سے کچھ علماء الہ آباد آئے ہوئے تھے حضرت مولانا احمد صاحب پرتا پگڈھیؒ کی خدمت میں اس مجلس میں حضرت نے فرمایا کہ: جب حدیث شریف میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ''العین حق'' نظر لگنا حق ہے یعنی نظر لگ جاتی ہے تو آدمی بیمار پڑجاتا ہے آدمی پر اثرات ہوجاتے ہیں بلکہ موت تک واقع ہوسکتی ہے، تو جب بری نظر کا لگنا حق ہے تو کسی صاحبِ دل اور اہل اللہ کی نظر بھلا نہیں لگے گی، یقیناً اللہ والوں کی نظر پڑنے سے دوسری تبدیلی پیدا ہوجائے گی اور حالت بدل جائے گی۔

پتہ نہیں بڑے میاں اپنی نظر سے کیا کر گئے؟

سورت میں اسٹیشن کے قریب ایک مدرسہ ہے صوفی باغ شاہ سلیمان صوفی صاحب لاجپوریؒ مشہور بزرگ گذرے ہیں ان کا قائم کردہ ادارہ ہے ان کا مزار بھی وہیں ہے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ سورت سے راندیر جارہے تھے اور کسی جلسہ میں

حضرت حکیم الامت تھانویؒ گجرات تشریف لائے ہوئے تھے اور وہ راندیر سے سورت آرہے تھے جب تاپتی کا پل آیا تو حضرت تھانویؒ سواری سے اتر پڑے لوگوں نے کہا کہ حضرت! آپ سواری پر سوار رہے تو فرمایا کہ: اب کچھ چلا بھی جائے اوراس کے بعد راستہ میں حضرت شاہ صوفی سلیمان صاحبؒ سے نظریں چار ہوئیں اور ملاقات ہوئی اس کے بعد حضرت تھانوی تو تشریف لے آئے سورت اور صوفی صاحب پہنچے راندیر اور چناروا ڈ کی مسجد میں جا کر مراقبہ کے لئے بیٹھے مریدین بھی ساتھ تھے حضرت مراقب ہوئے اسکے بعد جب بہت دیر ہوگئی تو مریدین کو تعجب ہوا کہ اتنی دیر ہوگئی، کیا بات ہے؟ دیکھا تو حضرت پر تو گریہ طاری ہے رو رہے ہیں اور اتنا روئے ہیں کہ جہاں وہ بیٹھے تھے وہ جگہ آنسوؤں سے تر ہوگئی ،لوگوں نے پوچھا کہ حضرت ! کیا بات ہے؟ فرمایا کہ: وہ بڑے میاں جو پل پر ملے تھے اپنی نظر سے معلوم نہیں کیا کر گئے کہ دل کی یہ کیفیت ہے (باغِ عارف ص۶) تو اہل اللہ کی نظر سے آدمی کی حالت بدل جاتی ہے، آدمی کی کایا پلٹ جاتی ہے، تو جب بری نظر حق ہے تو اچھی نظر بھی گویا حق ہے، پھر یہ ایک مستقل موضوع ہے مجھے اسکی تفصیل میں نہیں جانا ہے۔

میرے ساتھ کھانے کون بیٹھے گا؟

خیر یہ سب حضرات مصر پہنچے اور حضرت یوسف علیہ السلام سے ملے حضرت یوسف علیہ السلام بڑے تو قیر سے پیش آئے اور ساری صورتِ حال بیان کی کہ ہم غلہّ لینے کیلئے آئے ہیں اور یہ بھائی بنیامن بھی ساتھ آئے ہیں پھر جب شاہی مہمان خانہ میں کھانے کیلئے بیٹھے تو اس انداز سے بیٹھے آمنے سامنے جو بیٹھتے ہیں اس طریقے سے دو دو بیٹھ گئے اور یہ دس کے دس حقیقی بھائی تھے یعنی ماں شریک بھی تھے ،اب جب دو دو ساتھ ساتھ بیٹھے ہیں تو تنہا ایک بھائی بنیامن رہ گئے تو ان کی آنکھوں میں آنسوں آگئے،

حضرت یوسف علیہ السلام بھی وہاں دسترخوان پر موجود تھے انتظامی طور پر، آپ نے بنیامن سے پوچھا کہ: تمہیں کسی چیز کا صدمہ ہے؟ یہ آنسو کیسے؟ بنیامن کہنے لگے کہ یہ دو دو بھائی آپس میں بیٹھے ہیں کاش کہ میرا حقیقی بھائی جو گم ہو چکا ہے وہ مجھے اس وقت یاد آیا اگر وہ اسوقت موجود ہوتا تو اس صورت میں وہ میرے سامنے بیٹھتا اور آمنا سامنا ہوتا، حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامن کو تنہائی میں لے جا کر کہا کہ کیا تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ میں تمہارا بھائی بن جاؤں؟ بنیامن نے کہا کہ اس سے زیادہ شرف کی بات کیا ہوگی مگر وہ یعقوب کی اولاد تو نہیں ہوگی آپ تو عزیزِ مصر ہیں، اگر میرا حقیقی بھائی ہوتا تو میرے لئے شرف کی بات ہوتی، تب حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا کہ میں ہی تمہارا بھائی یوسف ہوں جسے بھائیوں نے کنویں میں ڈالا تھا (معارف القرآن ادریسی ج ۴ ص ۱۵۱) یہ بات سن کر بنیامن کو کتنی خوشی اور مسرت ہوئی ہوگی وہ تو حضرت بنیامن کے دل سے کوئی پوچھے اور پھر حضرت یوسف علیہ السلام ان کے ساتھ کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔

پیغمبر کا دل بہت بڑا ہوتا ہے

مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے دوسرے بھائیوں پر اب بھی اپنا یوسف ہونا ظاہر نہیں کیا اور بنیامن سے بھی کہا کہ بھائیوں سے ابھی مت کہنا اور فرمایا کہ میرے علیحدہ ہونے سے تمہیں بھی تکلیف ہوئی ہے اور مجھ پر جو کچھ گذری ہے، والد بزرگوار پر جو کچھ گذری ہے ان سب باتوں کو دل سے بھلا دینا ہے، اللہ تعالیٰ نے واپس ہم سب کو ملا دیا ہے (حوالہ بالا) اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر کا دل بہت بڑا ہوتا ہے۔ ایک بات درمیان میں رہ گئی جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو بیٹوں نے تکلیف پہنچائی اور بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالدیا اور گھر آکر والد سے کہا کہ یوسف کو بھیڑیہ نے کھالیا حضرت یعقوب علیہ السلام سمجھ گئے کے بیٹے جھوٹ بول رہے ہیں اس کے

باوجود حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو گھر سے نہیں نکالا (گلدستۂ تفاسیر ج۳ص۴۸۵)۔

نافرمان اولاد کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے

اس سے علماءِ اخلاق نے ایک مسئلہ مستنبط کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ: اولاد چاہے کتنی سرکش ہو اسے گھر سے نکالنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ گھر سے نکالنے کی صورت میں ہوسکتا ہے کہ وہ ہمیشہ کیلئے نالائق ہوجائے ہمیشہ کیلئے بالکل ہاتھ سے چلی جائے اگر آپ کا بیٹا سرکش ہے مثلاً وہ نماز نہیں پڑھتا ہے اس کا کیرکٹر اور اس کی صحبت اچھی نہیں ہے لیکن اگر آپ نے اس کو گھر سے نکال دیا تو اسکی کیا گارنٹی ہے کہ وہ ایمان پر باقی رہے ہوسکتا ہے کل کو وہ مرتد ہی ہوجائے، دین کو چھوڑ دے، ابھی وہ آپ کے ساتھ رہتا ہے تو کم ازکم ایمان پہ تو قائم ہے اور اس سے صلاح کی کوئی امید کی جاسکتی ہے اور اگر آپ نے اسے بالکل ہی الگ کردیا تو آج کا دور تو سرکشی کا دور ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ آپ کے پیر پر گر جائے اور آپ سے معافی مانگے، ہوسکتا ہے کہ وہ یہ سوچے کہ چلو انہوں نے مجھے اپنے سے جدا کردیا ہے تو مجھے ان کے ساتھ رہنا ہی نہیں ہے، میری اپنی دنیا ہے، تو آج کا دور تو عجیب وغریب ہے، لہذا آج کے اس دور میں اپنی نافرمان اولاد کیلئے ہمیں اس واقعہ میں یہ سبق ملتا ہے کہ ماں باپ حکمت سے کام لے۔

سختی کا نقصان اور نرمی کی نافعیت

اور دیکھئے! سختی عجیب وغریب چیز ہے، ایک مرتبہ جامعہ ڈابھیل میں دفترِ اہتمام میں کچھ علماء بیٹھے تھے ایک مسئلہ پر گفتگو ہو رہی تھی تو اسمیں میں نے ایک مثال دی اور انہوں نے اس کو بہت پسند کیا وہاں کئی لوگ تھے شوریٰ کے احباب بھی تھے، میں نے ان سے کہا کہ میں ابھی حوض پر وضو کر رہا تھا وضو کرتے ہوئے ایک بات میری سمجھ میں آئی وہ یہ کہ میں نے اپنے ہاتھ میں پانی لیا اور ذرا اسے دبایا تو وہ نکل بھاگا، میرے ذہن میں

ایک بات آئی کہ پانی بیچارہ اتنا نرم ہے کہ دو خشک اور جدا رہنے والی چیزوں کو بھی جوڑنا اس کا مزاج ہے کہ آپ دو چیزوں کو ملانا چاہیں تو اس میں پانی ڈالتے ہیں کہ اس کے توسط سے وہ چیز مل جاتی ہے وہ بیچارہ نرم ہے جوڑنے کا اس کا مزاج ہے، مگر اس پر بھی اگر غلط دباؤ پڑتا ہے تو وہ نکل بھاگتا ہے، ٹھہرتا نہیں ہے، حتی کہ پانی سے زیادہ لطیف چیز ہوا ہے اسپر بھی آپ غلط دباؤ ڈالے تو ظاہر بات ہے کہ غلط دباؤ وہ بھی برداشت نہیں کرتی ہے، ہاں ایک حد تک برداشت کر لیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھیں گے کہ اگر ذراسی سوئی بھی کسی ٹیوب میں لگ جائے تو ہوا فوراً رخصت ہو جائے گی، ابنِ آدم کو حق تعالیٰ نے خلافت دی اس کا اثر ہے کہ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوا جیسی آزاد چیز کو فٹ بال اور گیند میں بند کر کے اپنے تھپڑ اور مکوّں سے شوق سے اپنی شوکت منواتے ہیں اور فٹ بال میں بند کر کے لات مار مار کے اپنی شوکت تسلیم کرواتے ہیں اور موٹروں کے وہیل میں بند کر اپنی مخدومانہ حیثیت گویا اس سے تسلیم کرواتے ہیں (خطبات حکیم الاسلام ج۴ص ۴۸) تو یہ ابن آدم کی شوکت ہے، مگر وہ بھی ایسی ظالم ہے کہ جہاں موقع ملا فوراً فرار ہونے کی بات، تو پکڑی جائے جکڑی جائے اور بند ہو تب تو خیر ہے، ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ سارا مسئلہ گڑبڑ ہو جاتا ہے، تو معلوم ہوا کہ پانی انتہائی نرم ہے مگر وہ بھی غلط دباؤ پسند نہیں کرتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام ان سے کہتے کہ تم نے یوسفؑ کو مجھ سے جدا کیا لہذا ہمیں بھی تمہاری ضرورت نہیں ہے، چلو نکل جاؤ گھر سے، مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ شکل اختیار نہیں کی اور بھلا وہ کیسے کر سکتے تھے اللہ تعالی کی طرف سے جو بات ہونی تھی ہوگئی، حضرت نے ان کو گھر سے نہیں نکالا بلکہ ان کی تربیت کی، ان کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کیا پیغمبر کا دل بہت بڑا ہوتا ہے پیغمبر کا ظرف بڑا ہوتا ہے ہماری طرح نہیں کہ فوراً اٹھا پٹھک کر ڈالے۔

پیغمبر بد دعا بھی اللہ تعالیٰ کے اشارے پر کرتا ہے

حضرت نوح علیہ السلام نے بھی جو قوم کیلئے بد دعا کی ہے تو پیغمبر ویسے ہی بد دعا نہیں کرتے کہ غصہ میں آ گئے اور بد دعا شروع کر دی، نہیں، برسوں خونِ دل پیا ہے اور پھر ادھر ہی کے اشارے پر بد دعا بھی کرتے ہے، ایسا نہیں ہے کہ پیغمبر نے جلال میں آ کر بد دعا کر دی ادھر سے خفی اشارات پاتے ہیں اس کے بعد یہ شکل ہوتی ہے، آپ ﷺ کے ساتھ طائف والوں نے کیا کیا وہ سب جانتے ہیں، اب آپ اندازہ لگایئے کہ نبیٔ کریم ﷺ جن کی شخصیت ایسی تھی کہ اگر وہ ملک الجبال کو حکم دیتے تو اس صورت میں وہ آ کر انہیں پیس ڈالتا، مگر ایسا نہیں کیا۔

ترکیسر کے ایک جلالی بڑے میاں کا قصہ

ہمارے یہاں ترکیسر میں ایک جلالی باپو تھے وہ دوسری صف میں تھے اور وہ مسبوق ہو گئے تھے رکعت ان کی چھوٹ گئی تھی اور ان کے آگے بھی ایک صف تھی اور پیچھے بھی ایک صف تھی تو آگے کی صف والے بھی مسبوق تھے اور پیچھے کی صف والے بھی مسبوق تھے اب وہ سجدے میں تھے اور بعض مرتبہ آدمی اٹھتا ہے تو یوں بیٹھ پڑتا ہے، تو ایک آدمی ان کے سر مبارک پر بیٹھ گیا تو وہ تھے ہی جلالی مشہور مسجد سے باہر نکلے تو کسی نے پوچھا کہ نماز کے اندر کیا ہوا؟ تو ڈھائی ڈھائی من کے ملفوظات انہوں نے سنائے کچھ سمجھتے ہیں آپ لوگ ڈھائی ڈھائی من کے ملفوظات کا مطلب، اب اسکو نقل کرنا کوئی ضروری تھوڑا ہی ہے، تو عام انسانوں کی طبیعتیں تو ایسی ہوتی ہیں۔

والدین کی شفقتیں پیغمبر کی شفقت کے سامنے ہیچ ہیں

مگر پیغمبر کا سینہ بڑا ہوتا ہے بڑا سینہ ہوتا ہے کا مطلب آپ یہ نہ سمجھے کہ دروازے میں نہ آ سکتے ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں قوتِ برداشت بہت زیادہ ہوتی

ہے ان کی امتیوں پر بڑی شفقتیں ہوتی ہیں ماں باپ کی شفقتیں ہیچ ہے پیغمبروں کی شفقت کے سامنے اور جہاں دونوں جمع ہوجائیں تو پھر تو پوچھنا ہی کیا، تو اس واقعہ سے ہمیں ایک سبق یہ ملا کے آج ہم جس دور سے گذر رہے ہیں اس میں عام طور پر ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں ماں باپ کو آج کی اولاد کچھ بھی نہیں سمجھتی، اسی لئے اکبرالہ آبادیؒ سے کسی کانفرنس میں شرکت کیلئے کہا گیا کہ آپ فلاں کانفرنس میں شرکت کریں اس میں کورس کے متعلق کچھ گفتگو ہونے والی تھی، وہ کسی وجہ سے نہیں جاسکے تو انہوں نے ایک شعر لکھ کے بھیجدیا کہ میری طرف سے یہ شعر پڑھ کر سنادیا جائے اور وہ شعر بھی بڑا عجیب لکھا، اکبر لکھتے ہیں کہ ؎

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں

کہ جن کو پڑھ کر بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

یعنی جن کو پڑھ کر بیٹے باپ کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔

ایک عبرت آموز واقعہ

ایک گریجویٹ تھے ان کے باپ بیچارے بوڑھے تھے چہرے پر ڈاڑھی بھی تھی اور لنگی پہنے ہوئے رہتے تھے گریجویٹ صاحب نے اپنے دوستوں کو گھر کھانے کی دعوت دی دعوت میں دسترخوان پر باپ بھی موجود تھے اس کے دوستوں میں سے کسی نے اس سے پوچھا کہ یہ بڑے میاں کون ہے؟ تو اس نے کہا کہ یہ چاکر ہیں اس نادان کو کیا پتہ کہ اگر وہ چاکری نہیں کرتے تو یہ دنیا میں تشریف ہی نہ لاتے (خطبات حکیم الامت) کچھ سمجھتے بھی ہیں آپ لوگ اگر انکی چاکری نہ ہوتی تو یہ حضرت تشریف ہی نہ لاتے اور ان کا وجود ہی نہ ہوتا۔

میرا ایک مشورہ

تو غرض یہ کہ اولاد کے معاملے میں بڑے غور وفکر کی ضرورت ہے اور خاص کر یورپ کے اس ماحول میں بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے اس لئے ہم مشورتاً آپ کو یہ کہیں گے کہ ابتداء ہی سے جب کہ تختی اسکی سادہ ہو اس وقت سے اس کا ذہن بنانے کی ضرورت ہے، اگر یہ شکل اختیار نہیں کی گئی تو بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بچپن میں تو رکھتا ہے آدمی لاڈ کہ میرا جگر ہے دل کا ٹکڑا ہے وغیرہ اس میں مائیں تو بہت زیادہ آگے ہوتی ہیں اور اگر کوئی سختی کرے تو کہتی ہیں کہ کیا تم چھوٹے تھے تو ایسا نہیں کرتے تھے؟ اسکے ساتھ فوراً ایہ حاشیہ لگ جاتا ہے۔

نوٹ:- سی۔ ڈی۔ میں یہ درس یہیں تک ہی محفوظ تھا اس سے آگے کا حصہ باوجود کوشش کے نہیں مل سکا۔

میں نے ''لا یدرک کله مالا یترک کله،، کے تحت اس کو نقل کر دیا ہے

۞۞۞۞۞

درس نمبر ۲۶ سے حاصل ہونے والی دس اہم ہدایات

(۱) حزن وغم کی وجہ سے انسان کو روحانی ترقی بہت زیادہ ہوتی ہے اور بلند مقامات نصیب ہوتے ہیں۔

(۲) عقل اور چیز ہے اور تجربہ اور چیز ہے۔

(۳) جو مال جنتا اور پبلک کا ہے اس کا خصوصی اہتمام کرنا چاہئے، خصوصی طور پر اس کا استعمال ٹھیک نہیں، حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ اس جانب ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کو دیئے جانے والے غلہ کی قیمت اپنے پاس سے سرکاری خزانہ میں جمع کر دی تھی، آج کل اس معاملے میں بہت

زیادہ کوتاہی برتی جاتی ہے۔

(۴) اس دنیا میں انسان جتنی کوشش کرتا ہے مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ جو کچھ انسان چاہتا ہے وہی ہو جائے اور ایک طرح سے اچھا بھی ہے کہ انسان جو کچھ چاہتا ہے وہ سب نہیں ہوتا ورنہ ابن آدم شاید خدائی سے کم کا دعویدار نہ ہوتا۔

(۵) نظر کا لگنا حق ہے، اسی لئے کتابوں میں لکھا ہے کہ آدمی کو کوئی چیز بھا جائے تو وہ ''ماشاء اللہ،، کہدے اسکی وجہ سے انشاءاللہ اس نظر کا ضرر نہیں پہنچے گا۔

(۶) اہل اللہ کی نظر سے آدمی کی حالت بدل جاتی ہے۔

(۷) اولاد چاہے کتنی سرکش ہو اسے گھر سے نہ نکالے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ گھر سے نکالنے کے نتیجہ میں وہ ہمیشہ کیلئے نالائق ہو جائے ہمیشہ کیلئے بالکل ہاتھ سے چلی جائے، آج کل یہ مسئلہ بھی بڑی سنگنیت اختیار کر چکا ہے اور عموماً ایسے وقت میں ہوش سے زیادہ جوش سے کام لیا جاتا ہے، ہمیں بار بار اس واقعہ کو پڑھنے اور اس سے حاصل ہونے والے سبق کو سمجھنے کی بہت ضرورت ہے۔

(۸) کوئی چیز غلط دباؤ برداشت نہیں کرتی ہے اس لئے جہاں تک ہو سکے نرمی سے کام لینا چاہئے، کہتے ہیں کہ نرمی ہر چیز میں زینت پیدا کر دیتی ہے۔

(۹) پیغمبر بددعا بھی اللہ تعالی کے اشارے پر کرتا ہے ہماری طرح نہیں کہ جلال میں آ گئے تو فوراً بددعا کر دی۔

(۱۰) بچہ کی تربیت ابتداء ہی سے جب کہ تختی اسکی سادہ ہو اس وقت سے کرنی ہے مگر اس میں عموماً کوتاہی برتی جاتی ہے، اور پھر اس کے بعد اس کے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ سب پر عیاں ہے، عیاں را چہ بیاں۔

درس نمبر (۲۷)

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم،امابعد!

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ، بسم اللہ الرحمن الرحیم☆

فلن ابرح الارض حتی یاذن بی او یحکم اللہ لی،وھو خیر الحاکمین.

اے والد بزرگوار! آپ کے بیٹے نے چوری کی

محترم حضرات۔گفتگو یہ چل رہی تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بڑے بھائی یہودا نے یا روبیل یا شمعون نے جیسا کہ روایات مختلف ہیں یہ کہا کہ آپ لوگ جائیں ابّا کے پاس میں تو یہاں سے نہیں ہٹوں گا یہاں تک کہ والد اجازت دے یا رب العلمین میرے لئے کوئی شکل نکالے،اس لئے میں تو آنے سے رہا کہ والد کو جا کر منہ کیا دکھلاؤں گا یوسف کے ساتھ کیا جو کچھ کیا اب بنیامن کے ساتھ یہ بات پیش آئی، خیر یہ حضرات تشریف لے گئے والد بزرگوار کے پاس اور جا کر صورتِ حال بیان کی اور یہ کہا کہ ''یا ابانا ان ابنک سرق، ،اے والد بزرگوار آپ کے بیٹے نے چوری کی'' وما شھدنا الا بما علمنا ،،بس یہ ہمارا علم ہے ہم اسی کی گواہی دے رہے ہے'' وما کنا للغیب حفظین ،،غیب کی باتوں کو تو ہم جانتے نہیں البتہ ہم نے جو مشاہدہ کیا وہ یہ کہ وہ چور کی حیثیت سے پکڑے گئے ہے گرفتار ہو گئے ہے اس لئے ہم اسے اپنے ساتھ نہیں لا سکے اور اگر آپ کو یقین نہیں آتا ہماری باتوں کا تو'' وسئل القریة اللتی کنا فیھا والعیر اللتی اقبلنا فیھا ، ،جہاں ہم گئے تھے ان سے آپ پوچھے جو قافلہ تھا سفر کا ان سے آپ دریافت کرے ہم تو اپنی اس بات میں سچے ہیں مگر آپ اسے باور نہیں کریں گے اور اسے تسلیم نہیں کریں گے باقی ہم نے تو صداقت کا گویا آپ سے تذکرہ کیا ہے اس موقع پر یہ حضرات چونکہ سچے تھے اس لئے بہت زیادہ قوّت سے بات کہی ہے پہلی بار کی گفتگو میں

یہ قوّت نہیں تھی۔

یہ تمہارے جی کی گھڑی ہوئی بات ہے

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا ’’بل سوّلت لکم انفسکم امرا ،،تم نے اپنے طور پر ایک بات گھڑ لی ہے تمہارے جی کی گھڑی ہوئی بات ہے لہٰذا میں تو صبرِ جمیل ہی کروں گا۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے اس موقع پر تو بات سچ کہی تھی پھر حضرت یعقوب علیہ السلام نے ’بل سوّلت لکم انفسکم امرا،، کیوں فرمایا۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ بطورِ ظن حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایک بات کہی ہے ان کو واقعۃً کاذب قرار نہیں دیا گیا یا یہ کہ ’’بل سوّلت لکم انفسکم امرا ،، تحقیقی شان کا کلمہ ہے اور تحقیق کے موقعہ پر الزام نہیں لگایا جا سکتا، تیسرا ایک جواب یہ ہے کہ ان لوگوں سے پیچھے ایک بات ہوگئی تھی اور جب آدمی سے معاملاتی دنیا میں کوئی بات گڑ بڑی کی ہوتی ہے تو دوسری دفعہ فطری طور پر آدمی کا ذہن اُدھر ہی جاتا ہے اس وجہ سے انہوں نے یہ بات بطورِ مقایسہ کہی ہے اس پر قیاس کرتے ہوئے اور تحقیق مقصود تھی اور اس کے ساتھ ساتھ باپ تھے اور باپ کو ویسے بھی اس کا حق ہوتا ہے کہ تنبیہانہ انداز سے بات کہے، مگر یہ سب جوابات جاندار نہیں معلوم ہوتے ،بہترین جواب یہ ہے کہ اپنے بیٹوں سے خطاب کیا ہے اور بیٹوں میں خود حضرت یوسف علیہ السلام بھی تو داخل ہیں انہوں نے بنیامن کو روکنے کے لئے ایک بات بنائی تھی لہذا بیٹوں کے مفہوم میں تعمیم لے لی جائے ’’انفسکم،، کا جو’’ کاف،، ہے اسکو عام مراد لیا جائے تو پھر مطلب بہت صاف

ہوجاتا ہے کہ انکی اولاد ہی میں سے تو بعض نے یہ تدبیر کی تھی جسکے نتیجہ میں انہیں باپ کے پاس پہنچنا نصیب نہیں ہوسکا۔

صبر جمیل کی تعریف

خیر حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ میں صبر جمیل سے کام لوں گا، اب یہ بھی سمجھ لے کہ صبر جمیل کہتے کسے ہیں، جس میں شکوی نہ ہو، جزع فزع نہ ہو، ضبط وتحمل سے آدمی کام لے یہ صبر جمیل ہے۔

اناللہ وانا الیہ رجعون کا جملہ صرف اس امت کونصیب ہوا ہے

پھر فرمایا''یا اسفی علی یوسف،،ہائے یوسف پر افسوس دیکھئے اس موقع پر انہوں نے''یا اسفی علی یوسف،،فرمایا''اناللہ وانا الیہ راجعون،،نہیں فرمایا اس کی کیا وجہ تو ارباب تفسیر لکھتے ہیں کہ یہ جملہ صرف اس امت کونصیب ہوا ہے۔

اناللہ وانا الیہ رجعون معنی خیز جملہ ہے

''انا للہ وانا الیہ رجعون،،بہت بڑا جملہ ہے معنی خیز جاندار کہ جو مصیبت کے وقت پڑھا جاتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم اللہ تعالی کے لئے ہے اور ہماری چیزیں چلی گئی تو کیا ہماری تو ذات ہی اللہ تعالی کے لئے ہے اور ہم بھی اُدھر (اس کے پاس) جانے والے ہیں جیسے مثلاً لندن میں کوئی آدمی رہتا ہے اسے امریکہ کا بادشاہ ہمیشہ کیلئے اپنے یہاں بلائے اور اسکے لئے باقاعدہ سواری بھیجے لینے والے بھیجے کہ جاؤ لے آؤ تو اس صورت میں گھر کے سارے افراد کو دوست واحباب کو خوشی ہوگی کہ اسے امریکہ کے بادشاہ نے بُلوایا ہے مگر جب وہ جائے گا تو اس صورت میں ان کو صدمہ ضرور ہوگا کس بات کا صدمہ ہوگا اس بات کا کہ ہماری اُن کی جدائی ہوگئی ہے اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں اور اگر امریکہ کا بادشاہ یہ اطلاع بھی بھیجدے کہ اسکے گھر کے جتنے افراد ہیں اس کو بھی ہم

بُلوائیں گے تو اس صورت میں رہا سہا صدمہ بھی ہلکا ہو جاتا ہے، تو کسی کی موت واقع ہو جائے یا کسی کی کوئی چیز ضائع ہو جائے تو وہ حق تعالیٰ کی طرف سے ایک شکل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس جانے والے شخص کو اپنے پاس بُلایا ہے اب اس کی وجہ سے گھر کے لوگوں کو اور تعلق والوں کو تکلیف اور صدمہ ہے اسکی جدائی کا تو انہیں بھی اطلاع دی گئی ہیں کہ تمہیں بھی ہمارے پاس آنا ہے اور تم خود بھی یہ جملہ کہہ رہے ہو کہ ’’انا للہ وانا الیہ رجعون،، ہم بھی اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں تو درحقیقت اس میں تسلی کا بہت بڑا سامان ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نابینا ہو گئے تھے یا نہیں؟

رہی یہ بات کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نابینا ہو گئے تھے یا نہیں، تو ایک قول یہ ہے کہ بینائی کمزور ہو گئی تھی، دوسرا قول یہ ہے کہ اُن کی بینائی چلی گئی تھی، زیادہ رونے کے نتیجہ میں یہ سیاہ حصہ جو ہے اس میں ایک قسم کی بے کیفی پیدا ہوتی ہے کہ سیاہی کم ہونے لگتی ہے اور پھر اس کا بینائی پر اثر پڑتا ہے، بہر حال مشہور یہی ہے کہ ان کی بینائی چلی گئی تھی اور قرآن کریم نے ’وابیضت عینہ ،، کا لفظ ذکر کیا ہے گویا سیاہ حصہ سفید بن گیا اور کچھ حصہ تو سفید تھا ہی صحیح۔

دو گھونٹ اللہ تعالیٰ کو بہت پیارے ہیں

قرآن کریم کہتا ہے حضرت یعقوب علیہ السلام غم کو بہت ضبط کرتے تھے برداشت کرتے تھے۔ حضرت حسن بصریؒ کا ارشاد ہے کہ دو گھونٹ اللہ تعالیٰ کو بہت پیارے ہیں ایک تو غصہ کا گھونٹ ہے کہ آدمی اس کو برداشت کرے (پیئے) اور دوسرا غم کا گھونٹ ہے کہ آدمی اس کو برداشت کرے اور پیئے تو یہ دو گھونٹ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت ہی زیادہ پسندیدہ ہے اور مطلوب شئی ہے۔

حضرت یعقوبؑ کو اللہ تعالیٰ نے ان کے صبر پر شہیدوں کا اجر دیا ہے

اور حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے غم کے برداشت کرنے پر ان کے صبر پر شہیدوں کا اجر دیا ہے اس لئے کہ انہوں نے صبر وتحمل ہی ایسا کیا تھا۔

حضرت یعقوبؑ کو حضرت یوسفؑ سے جو محبت تھی وہ حقیقی اور خالص تھی دنیوی جہت سے نہیں تھی

اور ایک بات کام کی سن لے مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں ہے کہ ''ان من ازواجکم واولادکم فتنة ،، تمہاری بیویاں اور تمہاری اولاد فتنہ اور آزمائش ہے تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو جو حضرت یوسف علیہ السلام سے محبت تھی وہ حقیقی اور خالص تھی دنیوی جہت سے نہیں تھی کمالات نبویہ ان میں موجود تھے اور بھی خصوصیات تھی دینی اعتبار سے اس لئے اگر کسی شخص سے دین کی بنیاد پر محبت ہو تو یہ چیز دنیا میں داخل نہیں ہے، آپ کو کسی بزرگ سے محبت ہو کسی صالح نیک انسان سے محبت ہو تو چونکہ بنیاد اسکی دین ہے اس لئے وہ ''حب فی اللہ،، میں داخل ہے مگر بہر حال وہ مخلوق تھے اس وجہ سے آزمائش بھی ہوئی۔

نیند میں جو خرّاٹے کی آواز ہوتی ہے یہ صحت کی علامت ہے

تفسیر کی بعض کتابوں میں یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت یعقوب علیہ السلام تہجد پڑھ رہے تھے اور سامنے حضرت یوسف علیہ السلام لیٹے ہوئے تھے بچے تھے چھوٹے ننھے منھے خرّاٹے کی آواز ہوئی اور یہ بھی دھیان میں رہے کہ نیند میں جو آواز (خرّاٹے کی) ہوتی ہے یہ صحت کی علامت ہے، نبی کریم ﷺ سوتے تھے تو حدیث شریف میں ہے کہ خرّاٹے کی آواز ہوتی تھی، مگر یہ کہ یہ آواز اتنی زیادہ زور سے بھی نہ

ہوکہ تشویش کی شکل ہوجائے، بعضوں کا نیند میں یہ حال ہوتا ہے جیسے جنریٹر لگا دیا گیا ہو باقی یہ کہ تھوڑی خرّاٹے کی آواز نبی کریم ﷺ کے باب میں محدثین نے نقل کی ہے۔

حضرت یعقوبؑ کی بینائی چلی جانے کی وجہ

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نگاہ پڑی حضرت یوسف علیہ السلام پر جو ننھے منھے تھے حسن و جمال کا مرقع اور پیکر تھے اور عجیب وغریب کشش تھی، ایک دفعہ نظر پڑی ہٹالی پھر دوسری دفعہ نظر پڑی ہٹالی تین دفعہ تقریباً نظر پڑی چونکہ بڑے درجہ کے شخص تھے حق تعالی کو یہ بات پسند نہیں آئی تو رب العلمین نے فرمایا کہ تمہاری بینائی جاتی رہے گی چنانچہ پھر یہی ہوا کہ بعد میں ان کی بینائی چلی گئی۔

یا اسفی علےٰ بنیامن نہ کہنے کی وجہ

تو غرض یہ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا ’’یا اسفی علےٰ یوسف،، یا اسفی علےٰ بنیامن،، نہیں کہا بلکہ حضرت یوسف کا تذکرہ کیا یہ قاعدے کی بات ہے کہ دل پر ایک مرتبہ چوٹ لگی ہو اور جب دوسری دفعہ وہی بات پیش آجائے تو وہ پہلا غم تازہ ہو جائے گا پہلا صدمہ تازہ ہوجائے گا یہ موٹی سی بات ہے تو بنیامن کی جدائی پر حضرت یوسف علیہ السلام کا جو غم تھا وہ تازہ ہوگیا جس کا اس جملہ میں ذکر ہے۔

لا تایئسوا من رحمة الله

اسکے بعد پھر حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے کہا ’’انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ،، میں اللہ جل شانہ سے اس کیفیت کا ذکر کرتا ہوں اور پھر اپنے بیٹوں سے فرمایا کہ جاؤ اور یوسف اور بنیامن کو تلاش کرو اور اللہ تعالی کی رحمت سے مایوس مت ہو، چونکہ خواب بھی دیکھا تھا نبی بھی تھے اللہ تعالی کی طرف سے الہام بھی رہا ہوگا، تو فرمایا کہ جاؤ اور یوسف اور بنیامن کو تلاش کرو اور اللہ تعالی کی رحمت سے مایوس مت ہو۔

تجسس اور تحسس کا فرق

اور ''تحسس،،کا لفظ ذکر کیا،ایک تجسس ہوتا ہے ایک تحسس ہوتا ہے اور تحسس خیر میں ہوتا ہے اور تجسس خیر و شر دونوں میں ہوسکتا ہے یا تجسس میں یہ ہوتا ہے کہ آدمی کبھی تو خود کوشش کرے یا کسی اور کو بھیجدے اور تحسس کا لفظ پتہ دے رہا ہے کہ اصلِ حواس اور حس کو استعمال کرو گویا اپنے طور پر کوشش و سعی کرو۔

آلِ نبی کے لئے صدقہ و خیرات کا لینا درست نہیں ہے

اور پھر ان کو بھیجا مصر کی طرف اور کچھ معمولی سی پونجی تھی وہ بھی دیدی یہ حضرات پھر مصر آئے ہیں اور عزیز مصر کے پاس پہنچے ہیں پہلی دفعہ آئے تو واقف نہیں تھے دوسری دفعہ آئے تو بنیامن روک لئے گئے یہ تیسری مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے ہیں،انہوں نے سوچا کہ غلہ لینے کے بہانے عزیز مصر کے پاس پہنچے اور ان سے بنیامن کو چھوڑنے کے متعلق منت سماجت کرے،چنانچہ وہ عزیز مصر (حضرت یعقوب علیہ السلام) کے پاس پہنچنے پہنچنے کے بعد کیا ہوا قرآن کریم کے جملے ہیں''و جئنا ببضاعة مزجٰة،، وہ کہنے لگے ہم معمولی پونجی لیکر آئے ہیں'فاوف لنا الکیل،،غلہ تو آپ ہمیں پورا پورا اعطا فرمائیں اس لئے کہ ہمارے خاندان کو تکلیف پہنچی ہے اور یہ ہماری پونجی جو ہے وہ اس لائق نہیں ہے کہ وہ معاوضہ کے طور پر پیش کی جاسکے لہٰذا آپ بطورِ احسان اور تصدق ہی دیدے ہم آپ سے خیرات طلب کرتے ہیں،یہ واقعةً خیرات اور صدقہ نہیں اس لئے کہ آلِ نبی ہے اور آلِ نبی کے لئے اسکی گنجائش نہیں ہے،تو یہ منشا تھا کہ گویا ہماری طرف سے جو رقم اور پونجی پیش کی جائے گی وہ غلہ کا معاوضہ نہیں بن سکتی آپ جو کچھ دیں گے وہ آپ کی طرف سے بطورِ تبرع اور احسان ہوگا،یہ منشا ہے واقعی صدقہ نہیں،اور بعض محققین کا خیال ہے کہ اس امت میں آلِ نبی کے لئے زکوٰۃ اور صدقہ کی گنجائش نہیں ہے پچھلی

امتوں کے لئے اسکی گنجائش رہی ہے، یہ بھی ایک جواب ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا خط حضرت یوسف علیہ السلام کے نام

یہ بات جب انہوں نے کہی تو حضرت یوسف علیہ السلام کا دل بھر آیا اور عجیب بات یہ ہے بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایک خط بھیجا حضرت یوسف علیہ السلام کے نام اور خط میں لکھا کہ ''من یعقوب نبی اللہ و من اسحق ذبیح اللہ (ایسے لفظ آئے ہیں ویسے ذبیح اللہ حضرت اسمٰعیل ہے تحقیق یہ ہے) ابن ابراھیم خلیل اللہ ،تو یعقوب علیہ السلام بیٹے ہیں اسحٰق علیہ السلام کے اور اسحٰق علیہ السلام بیٹے ہیں ابراھیم علیہ السلام کے تو عزیز مصر کو خط لکھ رہے ہیں اور خط میں عزیز مصر سے خطاب کر رہے ہیں کہ ہمارا خاندان خاندانِ نبوت ہے اور مشکلات اور حالات کا شکار ہے یاد رہے یہاں پر شکوٰی مقصود نہیں ہے حقیقت بتانی ہے میرے دادا کے ساتھ حالت یہ ہوئی کہ ان پر بڑے حالات آئے میرے والد حضرت اسحٰق علیہ السلام پر بڑی آزمائش اور حالات آئے مجھ پر بھی بڑے حالات آئے اور یہ ہوا کہ میرا ایک لختِ جگر نورِ نظر تھا یوسف اس کو بچپن میں ضائع کر دیا گیا اسکے بعد طبیعت پر اثر زیادہ تھا تو تسلی کے لئے بنیامن کو میں نے اپنے پاس روک رکھا تھا جسے تم نے محبوس کرلیا ہے (روک لیا ہے) گویا عزیز مصر کو درخواست دی جا رہی ہے بھائیوں نے جب یہ خط حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ ابا جان کی درخواست ہے تو (حضرت یوسف علیہ السلام) کانپ گئے اور زار و قطار رونے لگے اور پھر فرمایا کہ ''ھل علمتم ما فعلتم بیوسف و اخیہ اذ انتم جھلون'' ، تمہیں کچھ خبر بھی ہے تم نے یوسف کے ساتھ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا (سلوک) کیا جب تمہیں خبر بھی نہیں تھی ،اب جب بھائیوں نے یوسف کا نام سنا تو ان کا دماغ چکرایا اور ظاہر بات ہے کہ حاکم سے پوچھنے کی ہمت کس کو ہو پھر نقاب کی شکل بھی تھی جیسا کہ صاحب روح المعانی نے لکھا ہے، غرض یہ کہ کوشش کر

کے دیکھا تو کچھ قرائن ایسے معلوم ہوئے کہ یہی یوسف ہے تو بھائیوں نے ان کے سوال پر پوچھا ''قالوا ءانک لانت یوسف ''، کیا واقعی آپ یوسف ہے تب حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ ''قال انا یوسف وھٰذا اخی ''، میں یوسف ہوں اور یہ میرے حقیقی بھائی بنیامن ہے ''قد من اللہ علینا ''، اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان کیا کہ گویا اِن چیزوں سے ہمیں نجات مرحمت فرمائی ہے اور نقاب اٹھا دیا بھائیوں کو انتہائی خوشی ہوئی کہ یوسف بھی مل گئے اور بنیامن بھی مل گئے مگر اپنے کئے کی وجہ سے یہ لوگ شرم سے پانی پانی تھے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے پہلے تو فرمایا ''قد من الله علينا ''، اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان کیا پھر فرمایا ''انہ من یتق ''، جو تقوٰی اختیار کرتا ہے (جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے محلِّ شاہی میں تقوٰی اختیار کیا) ''و یصبر ''، اور صبر کرتا ہے جیسے کنویں میں اور جیل خانے میں (حضرت یوسف علیہ السلام نے صبر کیا) ''فان اللہ لا یضیع اجر المحسنین ''، اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکاروں کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے ہیں تو شکرِ نعمت کے طور پر اپنے صبر کا بھی تذکرہ آ گیا عام عنوان کے ساتھ یہ نہیں کہ میں نے تقوی اختیار کیا بلکہ عام عنوان کے ساتھ اور بھائیوں نے یہ اعتراف کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر فضیلت عطا فرمائی ہے اور ہم واقعی خطاوار تھے ہم واقعی گنہگار تھے۔

لا تثریب علیکم الیوم

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ ''لا تثریب علیکم الیوم، ہم پہ کوئی گرفت نہیں ڈانٹ ڈپٹ نہیں میں نے تمہیں معاف کر دیا میں سب بھلا چکا ہوں اللہ تعالیٰ کا ہم پر بہت احسان ہیں۔

اگر مشکلات ختم ہو جائے تو پھر مشکلات کے زمانہ کا گیت............

اس سے ایک مسئلہ یہ بھی نکلتا ہے کہ اگر مشکلات کا دور ختم ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت شروع ہو تو پھر مشکلات کے زمانہ کا گیت گانے کی ضرورت نہیں ہے

یہ ایک قسم کی ناشکری کی کیفیت ہے اللہ تعالی کے احسانات اور انعامات ہی کا تذکرہ ہو یہ نہیں کہ آپ اسی کا تذکرہ کرتے رہے کبھی سبق کے لئے عبرت کے لئے کسی کے سامنے اس کا تذکرہ کرے وہ الگ بات ہے، تو بھائیوں کو حضرت یوسف علیہ السلام سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔

ایک اہم نکتہ

اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ بھائیوں نے اپنی پونجی کو رڈی اور معمولی پونجی کہا تو لکھا ہے کہ مؤمنین نیک اعمال کرنے کے بعد یہ کہے کہ رب العلمین ! ہمارے اعمال معمولی اعمال ہے اس لائق نہیں ہے کہ وہ آپ کے دربار میں پیش کر سکے اور آپ کے انعامات کا بدل ہو سکے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے، یہاں دیکھے حضرت یوسف کے دل میں رقّت کی کیفیت پیدا ہوئی ،ٹھیک اسی طریقہ سے اس عاجزی پر ہوگا یہ کہ رحمتِ الٰہیہ کو جوش آجائے گا اور حضرت یوسف علیہ السلام نے نقاب ہٹا کر اپنا دیدار کروادیا ٹھیک اسی طریقہ سے رب العلمین کا بھی دیدار نصیب ہو جائے گا اس عبدیت کی بنا پر معلوم ہوا کہ اپنے عمل کو بے وقعت سمجھنا اور اپنی حیثیت کچھ نہ سمجھنا یہ اللہ تعالی کے یہاں بڑی پسندیدہ چیز ہے، بہرحال وہ ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔

جو چیز تقدیر الٰہی میں ہوتی ہے وہ ہو کر ہی رہتی ہے

اب یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کیوں نہیں بتایا تو ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اللہ تعالی کی طرف سے ان کے لئے ایک تکلیفوں کا دور مقرر تھا وہ دور ختم ہوا اور جو چیز تقدیر الٰہی میں ہوتی ہے بس وہ ہو کر ہی رہتی ہے اور عقل کام نہیں کرتی جب طے تھا تو ادھر سے اطلاع دی گئی اور ادھر سے بھی تلاش کے لئے نکلے یہ شکل ہوئی، اسی لئے طب کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب اللہ تعالی کو کوئی کام کرنا منظور ہوتا ہے

تو بادام کا تیل سر میں لگائے تب بھی خشکی پیدا ہوگی اور بڑے سے بڑا عقلمند تدبیر اختیار کرے گا وہ بھی اُلٹی (ناکام ہوگی) پڑے گی اس لئے کہ جب ایک چیز طے ہے علمِ الٰہی میں تو عقل کام نہیں کرتی ہے، تو کہنے کا منشا یہ ہے کہ اس عالم میں بڑی عبرتیں ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے یہ چیز ان کے لئے مقرر کی تھی۔

کرتۂ یوسف کی برکتیں

اب ہوا یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ جاؤ اور تمام گھر والوں کو لے آؤ تو تمام گھر والوں کو بُلوایا اور ساتھ میں اپنا کرتہ بھی دیا امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ کرتۂ یوسفی بھی عجیب ہے کہ جب بھائیوں نے جھوٹ بولا تو ان کا جھوٹ کھل گیا زلیخا نے جھوٹ بات کہی تو اس کی پول کُھل گئی اور اب جب یہ کرتہ پہنچے گا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کی بند آنکھیں کھل جائے گی، بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ وہی کرتہ تھا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نارِ نمرود میں ڈالا گیا تو اتار لیا گیا تھا اور پھر وہ کرتہ منتقل ہوتے ہوئے حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس آیا اور اس کرتہ کو تعویذ بنا کر حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کے گلے میں ڈالدیا تھا اور بعض مفسرین کا خیال یہ ہے کہ نہیں یہ وہی سادہ کرتہ تھا جو وہ پہنتے تھے، بہرحال یہ اس کرتہ کو لے کر چلے۔

میری اطلاع سبب بن گئی تھی باپ کے غم کا
تو مسرت کا کرتہ بھی میں ہی پہنچاؤں گا

تو بھائیوں میں جس نے آکر یہ خبر دی تھی کہ یوسف کو بھیڑیئے نے کھالیا ہے وہ بھائی کہنے لگا کہ میری اطلاع سبب بن گئی تھی والد کے غم کا تو مسرت کا پیغام لے کر بھی میں ہی جاؤں گا اور ابا جان کے چہرے پر کرتہ بھی میں ہی ڈالوں گا چنانچہ وہ بھائی اس

کرتہ کو لے کر چلے۔

انی لا جد ریح یوسف لولا ان تفندون

اب اللہ تعالیٰ کی شان کہ ادھر مصر سے بھائیوں کا قافلہ چلتا ہے اور ابا جان (حضرت یعقوب علیہ السلام) کنعان میں بیٹھ کر یہ کہہ رہے ہیں کہ "انی لا جد ریح یوسف لولا ان تفندون"، اگر تم مجھے بہکی بہکی باتیں کہنے والا نہ سمجھو کہ بڈھا سٹھیا گیا ہے اس کی عقل ماری گئی ہے ایک ہی دھن ہے ایک ہی بات ہے اگر تم ایسا نہ سمجھو تو میں گویا خبر دے رہا ہوں کہ "انی لا جد ریح یوسف"، بیشک میں یوسف کی خوشبو سونگھتا ہوں اگر تم مجھے حماقت کی طرف منسوب نہ کرو، تو جو لوگ وہاں بیٹھے تھے انہوں نے کہا کہ "تاللہ انک لفی ضللک القدیم"، آپ تو بس اسی پرانے خیال میں پڑے ہوئے ہیں کہاں یوسف کہاں خوشبو کہاں کرتہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر انبیاء کا معاملہ دوسرا ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندے ہوتے ہیں ایک وقت گذرنے کے بعد بھائیوں کا قافلہ آیا اور آنے کے بعد انہوں نے خبر دی اور وہ کرتہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے چہرے پہ ڈالا گیا ہے تو گئی ہوئی بینائی واپس لوٹ آئی اور حضرت یعقوب علیہ السلام فرمانے لگے کہ میں کہتا نہیں تھا اسکے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب دیکھا ہوگا تو ان کو کتنی خوشی ہوئی ہوگی وہ تو کوئی حضرت یعقوب علیہ السلام کہ دل کو پوچھے کہ چوٹ جس نے کھائی ہے وہی اس حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔

قدرت کے نظام میں تدریج ہے

اس میں بھی قدرت کا نظام دیکھئے تدریج ہے ایسی شکل نہیں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اچانک وہاں آ گئے اگر ایسا ہوتا تو یہ بھی تحمل نہیں ہو سکتا تھا تو پہلے تو خوشبو بھیجی گئی اور غیبی طور پر اطلاع دی گئی۔

یہ واقعہ انسان کے عجز کا بھی پتہ دیتا ہے

اور اس واقعہ سے انسان کا عجز بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام جب کنعان کے کنویں میں تھے تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو خبر نہیں ہوئی اور مصر سے چل رہے ہیں تو کرتہ کی خوشبو سونگھ رہے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے۔

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم
گہے بر پا یۂ پشت خود نہ بینم

ایک بزرگ حوض پر وضو کررہے تھے پاؤں ان کا پھسلا اور حوض کے اندر گرے ایک آدمی نے کہا کہ حضرت! کبھی آپ آسمانوں کے اوپر کی باتیں کرتے ہیں روحانی دنیا کی بات کرتے ہیں اور کیفیت یہ ہے کہ آپ حوض میں گر پڑے تو انہوں نے کہا کہ۔

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم

کبھی تو ہم بہت اوپر ہوتے ہیں اور کبھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ

گہے بر پا یۂ پشت خود نہ بینم

ہمیں اپنے پیر کے نیچے کی بھی خبر نہیں ہوتی ہے یہ گویا شکل ہے۔

تم سے پگڈنڈی پر تو چلا نہیں جاتا تم پل صراط پر کیسے چلو گے

وہ جیسے ایک جاہل پیر تھے دیہات میں پہنچے اور وہ بہت دبلے ہو چکے تھے کسی مرید نے کہا کہ حضرت! آپ کا یہ حال ہو گیا ہے، تو وہ کہنے لگے کہ یہ نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟ نمازیں تمہاری طرف سے میں پڑھتا ہوں روزے تمہاری طرف سے میں رکھتا ہوں حج تمہاری طرف سے میں کرتا ہوں حتّٰی کے پل صراط پر بھی تمہاری طرف سے میں چلتا ہوں اور قیامت میں بھی میں ہی چلوں گا تو میرے بدن میں ضعف تو پیدا ہوگا ہی سہی بستی والوں نے سوچا کہ پیر صاحب تو ہماری طرف سے بڑی محنت کر رہے ہیں چنانچہ

ایک دیہاتی کھڑا ہوا اور کہا کہ حضرت! فلاں کھیت میں آپ کی نذر کرتا ہوں انہوں نے سوچا کہ معلوم نہیں ان کی یہ عقیدت بعد میں بھی باقی رہتی ہے یا نہیں ابھی اسی وقت اس موقع سے فائدہ اٹھالینا چاہئے چنانچہ انہوں نے کہا کہ اچھی بات ہے میں قبول کرتا ہوں ابھی چل کر آپ بتلادے اس نے کہا کہ اچھی بات ہے چنانچہ دونوں چلے اب پیر صاحب آگے آگے تھے اور وہ دیہاتی پیچھے سے راستہ بتا رہا تھا ایک کھیت کی پگڈنڈی پر چل رہے تھے اور بارش کا زمانہ تھا کیچڑ بہت تھا اور پھسلن ہو چکی تھی پیر صاحب نے ایک جگہ پیر رکھا تو پیر پھسلا اور وہ نیچے گرے وہ مرید دیہاتی تھا اس نے جا کر پیر صاحب کو زور سے ایک لات ماری اور کہا کہ سسرے تو تو کہتا تھا کہ تمہارے عوض پل صراط پر چلتا ہوں جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے چار انگل کی مینڈ یر پر تو چلا ہی نہ گیا پل صراط پر تو کیا چلتا ہوگا تو جھوٹا ہے جا ہم کھیت نہیں دیتے۔ (حکیم الامت کے حیرت انگیز واقعات ص ۴۵۶، ۴۵۷)۔

مصر جانے کی تیاریاں

تو کہنے کا منشا یہ تھا کہ یوسف کنعان کے ایک کنویں میں تھے تو اس کی خبر نہیں ہوئی اور یہاں اتنی دور سے خوشبو سونگھ رہے ہیں تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس خبر سے بڑی مسرت ہوئی اور پھر مصر جانے کی تیاری شروع ہوئی۔

حضرت یوسف علیہ السلام خود کیوں کنعان تشریف نہیں لے گئے؟

اب ایک سوال یہ ہے کہ باپ ہونے کا تقاضہ نبی ہونے کا تقاضہ بوڑھے ہونے کا تقاضہ تو بہتر یہ ہوتا کہ حضرت یوسف علیہ السلام خود کنعان تشریف لاتے، مگر حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اسی میں تھی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام خود مصر پہنچے چونکہ وہ طالبانہ حیثیت میں ہے اور عشق کی کیفیت ان پر ہے اور عاشق کو حرکت کرنی پڑتی ہے

لہٰذا حضرت یعقوب علیہ السلام کو چلایا گیا ایک بات، دوسری بات یہ کہ مملکت کے انتظامات سنبھالنے تھے اس لئے حضرت یوسف علیہ السلام کے آنے میں مصلحت نہیں تھی، تیسری بات یہ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام نے جو خواب سنایا تھا اس کی تعبیر اسی صورت میں مکمل ہوسکتی تھی کہ تختِ شاہی ہو اور پھر یہ سب جمع ہو وہ شان وشوکت کنعان میں آکر نصیب نہیں ہوسکتی تھی وہ شان وشوکت مصر ہی میں ہوتی اس وجہ سے بھی اللہ تعالی کی مشیت یہ ہوئی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو مصر کی طرف بھیجا جائے اور اللہ تعالی کے بڑے معاملات ہیں۔

برادرانِ یوسف کی چوتھی دفعہ مصر میں آمد

بہر حال تیاریاں شروع ہوئی اور پھر یہ سب مصر کی طرف روانہ ہوئے ہیں برادرانِ یوسف چوتھی دفعہ مصر آرہے ہیں اور اس مرتبہ والد بزرگوار بھی ساتھ ہیں اور خاندان کے دوسرے لوگ بھی ہیں چنانچہ یہ سب حضرات مصر پہنچے ہیں اور مصر میں پہنچنے کے بعد کیا کچھ ہوا اس کو کل کی مجلس میں سنئے گا آپ انشاء اللہ، دعا کیجئے اللہ پاک قابلِ عمل باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

۞۞۞۞۞

درس نمبر ۲۷ سے حاصل ہونے والی نو اہم ہدایات

(۱) انا للہ وانا الیہ رجعون کا جملہ صرف اس امت کو نصیب ہوا ہے۔

(۲) انا للہ وانا الیہ رجعون ،، ایک معنی خیز جملہ ہے جس کو آدمی کسی مصیبت کے وقت کہتا ہے عام طور پر یہ جملہ صرف کسی کے انتقال کی خبر سن کر پڑھا جاتا ہے اور کسی جگہ نہیں، یہ غلط فہمی ہے، حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ آپ ﷺ نے چراغ کے بجھ جانے پر بھی انا للہ الخ پڑھا ہے۔

(۳) دو گھونٹ اللہ تعالی کو بہت پیارے ہیں ایک غصہ کا گھونٹ اور دوسرا غم کا گھونٹ یہ اللہ تعالی کے نزدیک بہت ہی زیادہ پسندیدہ ہے اور مطلوب شئ ہے۔

(۴) دینی اعتبار سے اگر کسی شخص سے محبت ہو تو یہ دنیا میں داخل نہیں ہے کسی آدمی کو کسی بزرگ سے محبت ہو تو چونکہ بنیاد اسکی دین ہے اس لئے وہ حب فی اللہ میں داخل ہے۔

(۵) جو تقوٰی اختیار کرتا ہے اور صبر کرتا ہے اللہ تعالی اسکے اجر کو ضائع نہیں فرماتے۔

(۶) اگر مشکلات کا دور ختم ہو جائے اور اللہ تعالی کی طرف سے نعمت شروع ہو تو پھر مشکلات کے زمانہ کا گیت گانے کی ضرورت نہیں ہے، یہ ایک قسم کی ناشکری کی کیفیت ہے بلکہ اللہ تعالی کے احسانات اور انعامات ہی کا تذکرہ ہونا چاہئے۔

(۷) جو چیز تقدیر الٰہی میں ہوتی ہے وہ ہو کر ہی رہتی ہے اور اس کے آگے عقل کام نہیں کرتی ہے۔

(۸) قدرت کے نظام میں تدریج ہے۔

(۹) برائی کرنے والوں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا اور تکالیف پہنچانے والوں کو معاف کر دینا یہ انبیاء کرام علیہم السلام کا شیوہ ہے، اللہ تعالی تمام مسلمانوں کو نبوی اخلاق اختیار کرنے کی توفیق نصیب فرمائیں۔آمین۔

درس نمبر (۲۸)

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم، امابعد!

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ، بسم اللہ الرحمن الرحیم☆

”وا تونی باھلکم اجمعین☆

یوسف علیہ السلام کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟

محترم حضرات، بات یہ چل رہی تھی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر بلوایا چنانچہ برادرانِ یوسف کنعان پہنچے اور پہنچنے کے بعد صورتِ حال بیان کی اور کرتہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈالا گیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی لوٹ آئی اور حضرت یعقوب علیہ السلام بہت خوش ہوئے اور بڑی بیتابی سے پوچھا کہ یوسف (علیہ السلام) کہاں ہے اور کس حال میں ہے بتایا گیا کہ بہت مزے میں ہے بادشاہت ہے عزت ہے شوکت ہے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے گرانی کے ساتھ فرمایا کہ دنیوی بادشاہت کو میں کیا کروں میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ علم و عمل کے لحاظ سے یوسف کا کیا حال ہے دین کے لحاظ سے کیا حال ہے اب آپ اندازہ لگائیے ایک روایت کے اعتبار سے جب اسی (۸۰) سال کے فراق کے بعد بیٹے کا حال معلوم ہوا ہے تو بیٹے کی بادشاہت کی خبر سن کر خوشی نہیں ہوئی بلکہ یہ پوچھ رہے ہیں کہ علم و عمل کے لحاظ سے اور دین کے لحاظ سے کیا حال ہے، تو جب خوشی کی خبر لانے والا پہنچا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس سے فرمایا کہ میرے پاس کوئی چیز نہیں ہے کہ میں تمہیں اس خوشی کی خبر سنانے کے عوض تمہیں دوں کیونکہ گھر میں فاقہ کی شکل تھی اللہ تعالی کے مخلص اور بڑے بندوں پر عجیب عجیب حالات آتے ہیں۔

فراق وصال سے بدلا تو باپ بیٹے کی آنکھوں سے مسرت کے آنسوں نکل پڑے

خیر اس کے بعد یہ پورا گھرانہ مصر پہنچا مصر کے باہر حضرت یوسف علیہ السلام تقریباً چار ہزار لوگوں کو لے کر اپنے خاندان والوں کی تکریم کے لیے نکلے ہیں اور جب یہ حضرات پہنچے ہیں اور باپ بیٹے کی نگاہ ایک دوسرے پر پڑی ہے تو اونٹ سے اترے اور اترنے کے بعد بے تحاشہ روئے ہیں اور معانقہ کیا اور دیر تک گلے ملے رہیں یہ مسرت کا رونا ہے اور اس موقع پر بھی حضرت یوسف علیہ السلام نے حق تعالی کے شکر کے کلمات کہے ہیں کہ اس کا احسان ہے کہ اس نے مجھے جیل خانہ سے نجات دی اس کا احسان ہے کہ اس نے ہم سب کو ملا دیا وہ لطیف ہیں وہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔

خاندانِ یعقوب مصر پہنچا اور یوسفؑ کے خواب کی تعبیر عملاً وجود میں آ گئی

اسکے بعد شہر میں داخل ہوئے "اد خلوا مصر ان شاء الله آمنین"، وہاں جب پہنچے ہیں تو یوسف علیہ السلام کی بڑی شان تھی تخت پر بیٹھے ہیں تو حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کی بیوی حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ اور بعضوں نے کہا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی خالہ تھیں اور اسرائیلی روایتیں زیادہ تر اس باب میں ہیں اس لئے اگر وہ خالہ ہے تو بحکمِ ماں ہیں وہ اور بھائی جتنے تھے گیارہ وہ سب کے سب حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہوئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدہ کرنا سجدۂ تعظیمی تھا نہ کہ سجدۂ عبادت اور وہی سجدہ تھا ملائکہ کا حضرت آدم علیہ السلام کو کہ حقیقۃً سجدہ حق تعالی کو ہے جیسے ہم نماز جنازہ پڑھتے ہیں اللہ تعالی کے لئے دعا میت کے لئے ہوتی ہے یا نماز پڑھتے ہیں حق تعالی کے لئے اور رخ قبلہ کی طرف ہوتا ہے اسی طریقہ سے یہاں بھی یہی حال ہے۔

شوہر کا مقام شریعتِ اسلامیہ کی نگاہ میں

اس لئے کہ حدیث شریف میں ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ جائز نہیں ہے اگر میں کسی کو اجازت دیتا تو عورتوں کو حکم کرتا کہ شوہروں کو سجدہ کرے اس سے شوہر کے مقام کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی ملکِ مصر میں دفن ہونے کی وصیت

اسکے بعد یہ حضرات خوشی خوشی رہنے لگے تقریباً سترہ سال حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ رہے اور بعضوں نے تئیس (۲۳) سال لکھا ہے اسکے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کا انتقال ہو گیا اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے وصیت کی کہ مجھ کو ملکِ شام میں میرے آباؤ اجداد کے ساتھ دفن کر دینا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ساگ کی لکڑی سے ایک تابوت تیار کیا اور اس میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی نعش رکھی اور اسے ملک شام منتقل کر دیا۔

مبشر کو حضرت یعقوب علیہ السلام کا دنیا کا سب سے بہتر تحفہ

حضرت یوسف علیہ السلام کی تو شادی ہوگئی تھی اولاد بھی ہوئی دولڑکے ہوئے لڑکی بھی ہوئی اس کا نام رحمت تھا تو غرض یہ کہ دن گذرتے گئے یہاں تک کہ جب ان کی خود کی عمر ایک سو بیس سال کی ہوئی اور ان کی موت کا وقت قریب آیا درمیان میں ایک پتہ کی بات چھوٹ گئی تھی وہ یہ کہ جب بیٹے نے حضرت یعقوب علیہ السلام کہ چہرے پر کرتہ ڈالا اور ان کی بینائی لوٹ آئی تو وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ میں تمہیں اس خوشخبری سنانے پر انعام دیتا مگر میرے پاس کچھ ہے نہیں البتہ میں تمہیں اسکے عوض میں ایک دعا دیتا ہوں کہ حق تعالیٰ تم پر موت کی سکرات کو آسان فرمائے، یہ بہت بڑی دعا ہے تو غرض یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا بھی انتقال ہو گیا انتقال سے پہلے انہوں نے دعا

کی ’’فاطر السمٰوات والارض انت ولی فی الدنیا والاخرة توفنی مسلما والحقنی بالصلحین ،، یہ حسن خاتمہ کی دعا ہے پہلے تو شکرادا کیا کہ آپ نے مجھے خواب کی تعبیر کا علم عطا کیا اور یہ کیا اور یہ کیا پھر فرمایا آپ مجھے اسلام کی حالت میں وفات دے اور صالحین کے ساتھ لاحق کردے صالحین سے یہاں انبیاءمراد ہے۔

ایک عجیب جھگڑا

حضرت یوسف علیہ السلام کا وقت پورا ہوا تو اسکے بعد پھر بعض تفسیروں میں میری نظر سے گذرا کہ مصر کے لوگوں میں ایک جھگڑا پیدا ہوا ہر محلّہ کا آدمی یہ چاہتا تھا کہ ان کی تدفین ہمارے محلّہ میں ہو ظاہر ہے کس کس کی خواہش پوری کرے، تو یہ طے پایا کہ آپ کو نیل کے اندر (کنارے) دفن کردیا جائے نیل کا پانی پورے شہر میں پھیلتا تھا اس طرح آپ کی برکت سے پورا شہر بہرا ندوز ہوگا۔

اور عکرمہؒ نے کہا نیل کے دائیں جانب آپ کو دفن کیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ جانب بہت سرسبز اور غلہ آفریں ہوگیا اور دوسرا جانب خشک ہوگیا پھر آپ کو دائیں جانب سے نیل کے بائیں جانب منتقل کیا گیا تو دایاں جانب سوکھ گیا اور بایاں جانب سرسبز ہوگیا آخر نیل کے وسط میں دفن کردیا۔ اس طرح نیل کے دونوں رخ سرسبز ہوگئے۔

(تفسیر مظہری ج ٦ ص ۱۴۱،۱۴۲)

بڑھیا کی راستہ بتانے پر ایک شرط

اور حضرت یوسف علیہ السلام وصیت فرما گئے تھے کہ جب ممکن ہو تو مجھے میرے آباؤ اجداد کے پاس پہنچا دینا پھر انہیں کی اولاد میں چلتے چلتے بنی اسرائیل بڑھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دور آیا چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد قومِ عمالقہ یہاں پر قابض ہوگئی تھی اور اسرائیلی دینِ یوسفی پر تھے مگر مغلوبیت کی پوزیشن میں تھے اور بہت

کمزور تھے پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دور آیا اور وہ بنی اسرائیل کو لے کر چلے ہیں اور انہیں فرعون کے پنجے سے نجات دلائی تو آئے تھے تو سو کی تعداد بھی نہیں تھی اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ چلے ہیں تو چھ لاکھ تھے چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر شام کو لے جاؤ تو اس کے ساتھ یہ بھی حکم دیا کہ یوسف کی نعش کو بھی ساتھ لے جانا مصر کی سرزمین میں نہ چھوڑ جانا بلکہ ارض مقدسہ میں لے جا کر دفن کر دینا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تلاش کی کہ کوئی حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر کا نشان جاننے والا مل جائے تلاش کے بعد صرف ایک اسرائیلی بڑھیا ملی جس نے کہا کہ اے اللہ کے نبی میں یوسف کی قبر کا مقام جانتی ہوں اگر آپ مجھے اپنے ساتھ یہاں سے نکال کر لے جائیں اور سرزمین مصر میں چھوڑ کر نہ جائیں تو میں آپ کو حضرت یوسفؑ کی قبر بتادوں گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسکی شرط مان لی اسنے بتایا کہ فلاں جگہ ان کا تابوت ہے چنانچہ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کی نعش کو ان کے آباؤ اجداد کے پاس پہنچا دیا۔ (تفسیر مظہری ج۶ ص ۱۴۱، ۱۴۲)

کل من علیھا فان ویبقیٰ وجه ربک ذو الجلال والاکرام

صاحبِ جلالین نے اس واقعہ کے ختم سے پہلے لکھا ہے کہ جب انہیں شوق ہوا ملک بقاء کا اور دائمی ملک کا تو انہوں نے دعا کی کہ پاک ہے وہ ذات کہ جس کے ہمیشگی کے ملک کو کبھی فنا نہیں ہے اور یہی بات انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ کے بعد بھی لکھی ہے، دنیا کے بڑے بڑے سلاطین ہے مگر ان کی حکومتیں ختم ہے ان کا دور ختم ہو جاتا ہے انبیاء بھی آئے چلے گئے دنیا سے سلیمان (علیہ السلام) جیسے پر شوکت صاحبِ وجاہت وحشمت بادشاہ آئے وہ بھی چلے گئے، فرمایا کہ پاک ہے وہ ذات جس کے ہمیشگی کے ملک کو کبھی فنا نہیں ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی چلی جانے کی ایک وجہ

حضرت یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ سے بہت سے سبق نکلتے ہیں اس میں اتنے اسباق ہیں اور اتنے نِکات ہیں کہ اگر اس کو ترتیب دیا جائے تو مستقل ایک کتاب ہو جائے، اس واقعہ سے ایک سبق یہ بھی ملتا ہے کہ دیکھئے حضرت یعقوب علیہ السلام بہت روئے اور رونے کا اثر یہ ہوا کہ بینائی چلی گئی، صاحبِ روح المعانی نے ایک سوال اٹھایا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام دنیا میں سب سے زیادہ روئے ہیں اور ان سے زیادہ رونا حضرت آدم علیہ السلام کا ہے مگر ان کی بینائی نہیں گئی تھی ایسا کیوں؟ اسکی ایک وجہ یہ لکھی ہے کہ مخلوق پہ چونکہ نظر تھی اس لئے عقوبت کی شکل ہوئی وہ تہجد والا واقعہ میں نے آپ کو سنایا تھا۔

بعض دفعہ یقین پہ خوف غالب آجاتا ہے

اور بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ نہیں بڑے آدمی تھے اور ان کے روحانی معاملات کا اندازہ اسی سے لگائیے کہ اسی سال کے بعد جب حضرت یوسف علیہ السلام کی خبر ملتی ہے تو دین کی خبر پوچھ رہے ہیں اور کیسی فکر تھی لکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ابا جان سے ملنے کے بعد کہا کہ ابا جان! آپ کو معلوم نہیں کہ اگر میں انتقال بھی کر جاتا تو قیامت ہم کو جمع کرے گی یہ دیکھئے وہ کیفیتِ خوف یقین تو تھا مگر بعض دفعہ یقین پہ خوف غالب آجاتا ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ بیٹے میں یہ بات کو خوب جانتا ہوں مگر مجھے اس کا اندیشہ رہتا تھا کہ خدانخواستہ تم دین پر قائم نہ رہے تو وہاں ملاقات کی شکل نہ ہوگی، اب آپ اندازہ لگالیجئے ان حضرات کو اولاد کے دین کی کتنی فکر تھی حالانکہ خواب دیکھا تھا اور سمجھ رہے تھے کہ یوسف کو نبوت ملے گی مگر وہی بات جو میں نے ابھی ذکر کی کہ بعض دفعہ یقین پہ خوف غالب آجاتا ہے وہ شیر والی مثال جو اس

دن آپ کو سنائی تھی کہ یقین ہوتا ہے کہ شیر پنجرے سے باہر نہیں آئے گا مگر وہ جب آواز نکالتا ہوا (دہاڑتا ہوا) آگے بڑھتا ہے تو آدمی دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے وہ یقین پر حال اور خوف کی کیفیت غالب ہے، کتنی فکر تھی فرمایا کہ مجھے یہ اندیشہ تھا کہ اگر تم دین پہ نہ رہے تو وہاں ملاقات کی شکل نہ ہوگی تو یہ خیال پیدا ہوتا تھا ویسے یقین تھا اپنی جگہ اور یہی کیفیت عشرۂ مبشرہ کی تھی کہ وہ خوف کی وجہ سے روتے تھے ویسے یقین تھا اپنی جگہ حضور ﷺ کی بشارت پر تو وہ ایک خاص کیفیت تھی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی چلی جانے کی وجہ ان کا حزن وغم تھا

اس سے ایک سبق یہ بھی ملتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اللہ تعالی نے عجیب عجیب حالات سے گذارا ہے تو بینائی چلے جانے میں حزن وغم کی کیفیت شامل تھی اور اسکی تکلیف ایسی ہوتی ہے کہ بس وہ آدمی کو کھا جاتی ہے۔

غم بغیر ہاتھ پیر والا جانور ہے مگر بڑے سے بڑے جسم والے انسان کو ہضم کر جاتا ہے

اسی لئے کسی آدمی پر غم سوار ہو جائے تو یہ ایسا بغیر ہاتھ پیر والا جانور ہے جو بڑے سے بڑے جسم والے انسان کو ہضم کر جاتا ہے غم بڑی چیز ہے اسی لئے نبی کریم ﷺ کو صحابہ نے دیکھا کہ آپ پر بڑھاپے کا اثر معلوم ہو رہا ہے حالانکہ آپ کی صحت اچھی تھی لیکن بدن میں ضعف تھا اور چند بال ڈاڑھی مبارک کے سفید ہوئے تھے شمائلِ ترمذی میں اس کا ذکر ملتا ہے تو آپ ﷺ نے صحابہ کے سوال پر فرمایا کہ سورۂ ھود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے (کیونکہ ان میں قیامت کا اور آپ ﷺ کی ذمہ داری کا ذکر ہے)۔

نبی کریم ﷺ میں جنت کے چالیس آدمیوں کی قوت تھی

ورنہ حضور ﷺ کی طاقت جنت کے چالیس آدمیوں کے برابر تھی اور جنت میں ایک آدمی کی طاقت دنیا کے سو آدمیوں کے برابر ہوگی اور جنت کے چالیس آدمیوں کی قوت تھی نبی کریم ﷺ میں اب حساب گن لیجئے کیلکو لیٹر کا زمانہ ہے دماغ تو ویسے ہی کمزور ہو گئے ہیں چار ہزار ہوتے ہیں اس سے ایک مسئلہ یہ بھی حل ہوتا ہے کہ جو شیاطین یہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے زیادہ شادیاں شہوت کی وجہ سے کی ان عقل کے ماروں کو معلوم ہونا چاہئے کہ پچیس سال کے بھر شباب میں آپ نے ایک بیوہ سے شادی کی ہے جو اس سے پہلے دو شوہروں کے نکاح میں رہ چکی ہیں اور جب تک وہ زندہ رہیں آپ نے کسی اور سے شادی نہیں کی اور اس اصول پر جو جسمانی طاقت تھی آپ کی اتنی قوت تھی کہ آپ کو چار ہزار عورتوں کی ضرورت تھی دنیا میں مگر آپ نے صرف گیارہ نکاح فرمائے۔

ایمان لانے کے لئے ایک عجیب شرط

رُکانہ نامی ایک پہلوان تھے جو بعد میں ایمان لے آئے وہ آپ کی خدمت میں آئے اور کہا میں معجزہ نہیں چاہتا آپ نے نبوت کا دعوی کیا ہے آپ مجھ سے ریسلنگ میں کشتی کر لیجئے اگر آپ جیت گئے تو میں ایمان لے آؤں گا۔

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا

یہ محاورہ ہے کہ ہاتھ میں کنگن ہو تو اسکو آئینہ کی ضرورت نہیں ہوتی کہا بہت اچھی بات ہے دیکھئے ضرورت پڑتی ہے تو پیغمبر کشتی بھی لڑتے ہیں، لیکن ہاں خواہ مخواہ آپ کسی سے کشتی مت شروع کر دینا کہ آج درس میں سن کر آئے ہیں لہذا کشتی شروع کر دو، خیر نبی کریم ﷺ کے سامنے آئے تو چشمِ زدن میں پلک جھپکتے ان کو اٹھا کر نیچے پٹھک دیا تو وہ کہنے لگے کہ کچھ دھوکا ہوا آپ نہیں دیکھتے چھوٹے بچے کرکٹ کھیلتے ہیں اور پہلے بال پہ

کوئی آؤٹ ہوجاتا ہے تو وہ کہتا ہے یہ تو ٹرائی بال تھا میچ میں بھی ٹرائی بال ہوتا ہے تو اسی طرح وہ کہنے لگے یہ تو دھوکا ہوگیا پھر سے کشتی ہوجائے آپ نے کہا بہت اچھی بات ہے چنانچہ پھر کشتی ہوئی حضرت نے پھر اس کو پچھاڑا۔

پیغمبری طاقت کی مثال

پیغمبری طاقت کی مثال ایسی دی ہے کہ بلوری کانچ آپ لے اور اسکے نیچے روئی رکھے یا کاغذ رکھے تو وہ اتنے حصہ میں جو دھوپ پھیلی ہوئی ہے وہ سمٹ کر ایک نکتہ پہ آتی ہے اور روئی جلتی ہے یا کاغذ جلتا ہے دھواں نکلتا ہے تو نبی اپنی اندر کی طاقت کو کسی ایک نکتہ پر ڈالدے تو پھر اس حالت میں وہ انگلی سے اشارہ کرے تو چاند ٹکڑے ہوسکتا ہے تو بے چارے رکانہ کی کیا حیثیت ہے پیغمبر کی طاقت کوئی معمولی طاقت ہوتی ہے، اللہ اکبر، اور پھر صبر وضبط کا یہ حال ہے طاقت کا یہ حال ہوتا ہے اور یہ گدھے جو ہے وہ اعتراض کرتے ہیں عقل کے مارے دور سے دور تک عقل کا تعلق نہیں اتنی ضخیم کتاب آج سے تقریباً تیس سال پہلے میں نے اپنے بچپن میں دیکھی تھی اس میں صرف یہی جوابات دیئے گئے تھے کہ ازواجِ مطہرات کی کثرت کیوں ہے اور اسکے بہت سے جوابات آج بھی الحمدللہ آپ حضرات کی دعاؤں کی برکت سے ذہن میں محفوظ ہے مگر ابھی اس کا موقع نہیں مجھے یہ بتانا ہے کہ پیغمبروں کے تمام معاملات عجیب ہوتے ہیں۔

دنیا کی ہر حالت ختم ہوجانے والی ہے

یہ جو حالات گذارے گئے اس سے ایک سبق یہ بھی ملتا ہے کہ غم عجیب چیز ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر حالت ختم ہوجانے والی ہے لہٰذا آدمی بڑے سے بڑا بادشاہ بھی بن جائے تو فخر وغرور نہیں کرسکتا اور بڑے سے بڑے مشکل حالات پیش آجائے تو مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے پریشانی کی وجہ

اسی لئے تفسیروں میں لکھا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے پوچھا کہ جانتے ہو تمہیں پریشانی کیوں پیش آئی ؟ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا نہیں ،تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ آپ کا وہ جملہ کہ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں بھیڑیا اسے نہ کھالے بس یہ جملہ سبب بن گیا آپ کی جملہ پریشانیوں کا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی پریشانی کیوں ختم ہوئی ؟

پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پوچھا کہ یوسف سے ملاقات ہوئی اس کا سبب جانتے ہو؟ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا نہیں، کہا آپ کا یہ ارشاد''لا تائیسوا من روح الله،، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس مت ہو، ناامید مت ہو،اس سے سبق ملتا ہے کہ کیسی ہی مشکل پیش آجائے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک انگریز کے مسلمان ہونے کی وجہ

ایک انگریز مسلمان ہوا اس سے پوچھا گیا کہ تمہیں اسلام کی کونسی چیز پسند آئی کہ تم نے اسلام قبول کیا ،اسنے کہا میں نے اسلام کا کافی مطالعہ کیا میں نے دیکھا کہ اسلام ایسا دین ہے کہ آدمی کو کبھی مایوس نہیں چھوڑتا ہے ہر حال میں امید کی شکل ہے بس مجھے یہ ادا پسند آگئی اور میں مسلمان ہو گیا۔

دریائی جہاز کے کپتان کے اسلام قبول کرنے کی وجہ

دریائی جہاز کا ایک کپتان تھا اسنے اسلام قبول کیا اس سے پوچھا گیا کہ تم نے اسلام کیوں قبول کیا ،اس نے کہا میں نے قرآن کریم کا مطالعہ کیا ہے دریائی سمندر میں انسانی بیکسی کا جو تذکرہ اس میں کیا گیا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کو اخلاص سے یاد کرتا ہے جب

موجیں آتی ہے ''دعوا اللہ مخلصین لہ الدین ،،تو میں نے دیکھا کہ محمد صاحب نے سمندر کا سفر نہیں کیا ہے معلوم ہوا کہ یہ آسمانی کتاب ہی ہے کہ اس نے ایسا نقشہ کھینچا ہے اور اس سے اچھا نقشہ ممکن ہی نہیں ہے پس میں نے اسلام قبول کرلیا۔

(ہم کیوں مسلمان ہوئے ص ۱۹۹، عشاق قرآن کے ایمان افروز واقعات ص ۲۵۱،۲۵۲)

اپنوں کی طرف سے بھی حالات پیش آتے ہیں

میں یہ ذکر کر رہا تھا کہ پیغمبروں کے معاملات بڑے عجیب ہوتے ہیں اور اس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ اپنوں کی طرف سے بھی حالات پیش آتے ہیں جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں سے حالات پیش آئے۔

شریف انسان کو خدا انتقام کی قدرت دیتا ہے تو وہ درگذر کرتا ہے

اس سے یہ بھی سبق ملتا ہے کہ شریف آدمی کو خدا تعالی قدرت دیتا ہے تو وہ عفوو درگذر سے کام لیتا ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے درگذر سے کام لیا آپ نے بھائیوں سے فرمایا ''لا تثریب علیکم الیوم ،،اسی لئے جب بھائیوں سے ملاقات ہوئی تو آپ نے نہ کنویں کا تذکرہ کیا نہ جیل کا تذکرہ کیا کہ بھائیوں کو شرمندگی ہو، کیسی شرافت کی بات ہے۔

اگر صبر وتقوی کی دولت اس دنیا میں کسی سعادتمند کو نصیب ہو جائے تو اس سے بڑھ کر کوئی بادشاہ نہیں

اور تمام مشکلات سے خلاصی کا سبب دو چیزیں بیان کی 'انہ من یتق ویصبر ،،صبر اور تقوی اگر صبر وتقوی کی دولت اس دنیا میں کسی سعادتمند کو نصیب ہو جائے تو اس سے بڑھ کر کوئی بادشاہ نہیں ، بہت بڑی دولت ہے شکر سے بھی صبر آگے بڑھا ہوا ہے۔

فقیرِ صابر کا درجہ بڑھ کر ہے یا غنئ شا کر کا؟

اسی لئے کتابوں میں ایک بحث ہے کہ فقیرِ صابر کا درجہ بڑھ کر ہے یا غنئ شا کر کا درجہ بڑھ کر ہے، ایک آدمی فقیر ہے اور صبر کرتا ہے اور دوسرا مالدار ہے اور شکر کرتا ہے سید الطائفہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی خدمت میں لوگ آئے اور پوچھا حضرت! ایک سوال ہے فرمایا کہو، کہا کہ صبر کرنے والے فقیر کا درجہ بڑا ہے یا شکر کرنے والے غنی کا، امیرِ شا کر یا فقیرِ صابر کس کا درجہ بڑھا ہوا ہے۔ فرمایا سوال ہی غلط ہے اور وجہ اسکی یہ ہے کہ میری نظر میں بڑا رتبہ اس کا ہے کہ جو فقیرِ شا کر ہو۔

ایسا توکل تو ہماری گلی کا کتّا بھی کرتا ہے

مکہ مکرمہ میں کچھ بزرگوں کا اجتماع ہوا اور توکل پر گفتگو چھڑی ایک بزرگ کہنے لگے کہ مل جائے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے نہیں تو کچھ بھی نہیں، تو ایک بزرگ فرمانے لگے یہ کام تو ہماری گلی کا کتّا بھی کرتا ہے مل جائے تو شکر ادا کرتا ہے نہیں تو کچھ بھی نہیں، بلکہ نہ ملنے پر بھی شکر ہو، آپ نہیں دیکھتے ہندوستان میں فقیر لوگ دعا دیتے ہیں کہ جو دے اس کا بھی بھلا اور جو نہ دے اس کا بھی بھلا تو کڑکی (تنگی) آجائے اور شکر کرے یہ بہت بڑی چیز ہے۔

غلط کام کا برا نتیجہ سامنے آکر رہتا ہے

اس سے ایک سبق یہ بھی نکلا کہ چاہے باپ نے نہیں دیکھا اور باپ کی نگاہوں سے ہٹ کر ظلم و زیادتی بھائیوں سے ہوئی مگر غلط کام کا برا نتیجہ سامنے آیا شرمندگی اٹھانی پڑی معلوم ہوا کہ کوئی نہ دیکھتا ہو تب بھی کسی کے ساتھ ظلم اور خیانت کا معاملہ مناسب نہیں ہے بھائیوں کو شرمندگی پیش آئی کتنے شرمندہ ہوئے ہوں گے بڑے خاندان کے تھے شریف تھے نیک تھے بس ایک چیز ہوگئی ان سے جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کے

بھی سارے معاملات اور درجات تھے پھر تو یہ بھی بڑی تگڑی کی کہ بے چین ہوکر باپ سے کہا کہ بھائی یوسف نے معاف کیا آپ نے معاف کیا مگر پتہ نہیں اللہ تعالی نے معاف کیا ہے یا نہیں، بہت بے چین تھے حضرت یعقوب علیہ السلام نے با قاعدہ دعا کی اور یہ حضرات بھی پیچھے کھڑے تھے ادھر سے اطلاع دی گئی کہ معاف کردیا۔

فتح مکہ کے دن آپ ﷺ کا اعلان لا تثریب علیکم الیوم

اسی لئے فتح مکہ کے موقعہ پر مشرکین مکہ حضور ﷺ کے باب میں سمجھتے تھے کہ آج ہماری آ بنے گی، حضور ﷺ نے فرمایا نہیں ’’ الیوم یوم المرحمۃ ،،اور فرمایا ’’ لا تثریب علیکم الیوم ،،آج تم پر کوئی پکڑ نہیں (سیرۃ المصطفی ج۲ ص ۱۷۵) اور یہ وہی جملہ ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے فرمایا تھا معلوم ہوا کہ جس کا دل بڑا ہوتا ہے اس پر میں ایک بات کہتا ہوں آج ہندوستان میں مسلمان مظلوم ہیں اگر آج مسلمانوں کو قوّت حاصل ہو جائے تو وہ کافروں پر ظلم نہیں کریں گے آٹھ سوسال مسلمانوں کی مغلیہ حکومت رہی ہے اگر وہ ظلم کرتے تو آج ہندوستان میں ایک ہندوں نہ ملتا سات سو آٹھ سوسال ہندوستان میں حکومت کی رواداری کا ثبوت دیا اوران بنیوں نے پینتالیس سال کے اندر مسلمانوں پر وہ ظلم ڈھایا ہے کہ حجاج بن یوسف جیسے ہزاروں ان کے سامنے ہیچ ہے کم ظرفی کی بات ہے اور یہ دیکھئے حضرت یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ’’ لا تثریب علیکم الیوم، ، یہ بھی نہیں کہا کہ تم نے ایسا کیوں کیا صرف اتنا کہا کہ شیطان نے ہمارے درمیان ایک چیز کروادی ،اس سے معلوم ہوا کہ آدمی اپنا ظرف بڑھائے بہت چھوٹی طبیعت کی بات ہے کہ انسان کسی پر قابو پالے تو قابو سے باہر ہو جائے۔

جو معاملہ حق تعالیٰ کا تمہارے ساتھ ہے
تم بھی اپنے چھوٹوں کے ساتھ وہی معاملہ کرو

ایک شخص تھے ان کو اپنے چھوٹوں پر بہت غصہ آتا تھا ان کو ایک بزرگ نے نصیحت کی کہ دیکھو حق تعالیٰ تم سے بڑے ہیں اور ان کی نافرمانی تم سے رات دن ہوتی رہتی ہے مگر وہ تمہیں معاف کرتے رہتا ہے تم بھی اپنے چھوٹوں کے ساتھ درگذر کا معاملہ کرو (مواعظ دردِ محبت ج ۲) تمام دنیا کے ظالمین کے لئے اس میں بڑا اسبق ہے۔

آج ہم اپنے بچوں کے دنیا کی فکر کرتے ہیں دین کی فکر نہیں کرتے

اس راستہ سے یہ بات بھی گویا ملتی ہے کہ ان کو اپنے بچے کے دین کی کتنی فکر تھی آج ہم اپنے بچوں کے دنیا کی فکر تو کرتے ہیں مگر دین کی فکر نہیں کرتے حالانکہ پہلی فکر ان کے دین کی ہونی چاہئے اور ایک بات ذہن میں رہے کہ انسان دنیا کے لئے تکلیفیں برداشت کرتا ہے کاش! اس کا رخ دینی ہوجائے، دیکھئے میں ایک مثال دیتا ہوں ذرا مزیدار بھی ہے اور عجیب بھی ہے بہت سے لوگ اپنے بچوں کو ملک سے باہر بھیجتے ہیں کوئی سعودیہ بھیجتا ہے کوئی افریقہ بھیجتا ہے کوئی کسی اور جگہ تو ماں باپ اس کو رخصت کرتے وقت روتے ہیں خاص طور سے ماں سر پہ ہاتھ پھیرے گی روئے گی مگر روتے ہوئے وہ یہی کہے گی بیٹا! وہاں جا کر جم کر رہنا کیونکہ جانتی ہے کہ صاحبزادے اگر گم پھر کر چلے آئے تو لاکھوں روپیہ کی حجامت اور ادھر حضرت کی تفریح ہوجائے گی کیونکہ وہ تو آ کر اتنا کہہ دے گا کہ میرا وہاں جی نہیں لگا، اچھا! اب آپ دیکھئے جو تکلیفیں برداشت ہو رہی ہے کیوں؟ وہ یہ سوچتے ہیں کہ بچہ کا مستقبل اور فیوچر ٹھیک ہوجائے گا وہ کیسے ٹھیک ہوتا ہے اس کو میں یوں تعبیر کرتا ہوں چند سال میں بیچارہ قرضہ ادا کرتا ہے پھر کچھ جمع کیا کھانے پینے کے لائق ہوا تو کسی کو دیکھئے تو ذیابیطس اور کسی کو بلڈ پریشر تو کسی کو لو پریشر ہو

رہا ہے تو کسی کو کچھ اور ہو رہا ہے تو چار پیسے آئے تو زندگی کا یہ حال ہے یعنی عبرت بتا رہا ہوں میں، ہم نے بہت سے ملکوں میں دیکھا کہ بے چاروں پر شروع میں کچھ حالات رہے میں نے ہندوستان میں کہا کہ آپ لوگ یہ نہ سمجھے کہ افریقہ اور انگلینڈ میں لوگ ائیر پورٹ پر پاؤنڈ اور ڈالر لے کر کھڑے ہوتے ہوں گے کہ آپ آئے لیجئے یہ پاؤنڈ اور ڈالر میں نے کہا لوگ بے چارے بڑی بڑی مشقتیں برداشت کرتے ہیں۔

صحیح نیت سے دنیا بھی دین بن جاتی ہے

تو خیر میں کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ انسان فراق کی تکلیف کو دنیا کے لئے برداشت کرتا ہے، کاش! کہ اس میں دین کی نیت کرے کہ چار پیسے ہوں گے تو کسی کے آگے ذلیل نہیں ہوگا ہاتھ نہیں پھیلائے گا بھیک نہیں مانگے گا اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کی کوشش کرے یہ ساری چیزیں ہو جائے تو یہ دنیا بھی دین بن جائے گی ورنہ آپ بتائیے اولاد کو چھوڑنا آسان ہے؟ وہ تو ماں باپ کا دل جانتا ہے۔

انسان کو سب کچھ مل جائے مگر وہ حسنِ خاتمہ کی بھیک کا محتاج ہے

تو بہر حال اس میں بڑے سبق ہیں سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ انسان کو سب کچھ مل جائے وہ حسنِ خاتمہ کی بھیک کا محتاج ہے، دیکھئے حضرت یوسف علیہ السلام نے دعا فرمائی یہ بڑی اچھی دعا ہے "فاطر السمٰوات والارض، انت ولی فی الدنیا والاخرۃ توفنی مسلما والحقنی با لصلحین،، اس دعا کو سب حضرات اپنا وِرد بنا لے اور بھی خدا جانے اس میں کتنے سبق ہیں۔

یہ بہت ہلکا سا خاکہ آپ کے سامنے پیش کیا ورنہ یہ تو......

بہر حال وقت کم ہے اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے توفیقِ عمل نصیب فرمائے، یہ بہت ہلکا پُھلکا کچھ کچھ بیان کیا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ واقعہ سامنے آ گیا باقی اسکی تفسیری

تفصیلات یا اس میں جو دقائق ہے، یا نِکات ہے، یا باریکیاں ہے تو اس کا مجمع متحمل بھی نہیں اور وقت بھی متحمل نہیں ہوتا ہے اس لئے بہت ہلکا سا خاکہ آپ کے سامنے پیش کیا برائے نام ورنہ یہ تو سمندر رہے ہے بہت بڑا اور صرف سورۂ یوسف پر سال بھر بولے تو بہت ناکافی ہے بہت لکھا ہے لوگوں نے اور اس میں بڑا علم ہے۔

دعائیہ کلمات

بہر حال اللہ پاک ہم لوگوں کو قرآنِ کریم سے تعلق نصیب فرمائے اور پورے رمضان المبارک میں جو کچھ سنا ہے اس پر عمل کی توفیق نصیب فرمائے، بیان میں جو کچھ کوتاہیاں ہوئی ہو اللہ تعالی اسے معاف فرمائے، سننے میں جو غفلتیں ہوئی خدا تعالی اسے بھی معاف فرمائے اور ہم سب کو قابل عمل باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

عید کی رات بھی دینی کمائی کی ہے غفلت میں اسے ضائع نہ کردے

آج اگر چاند ہو گیا تو اللہ تعالی سے اس رات میں بھی دعا کرے مایوس نہ ہو حدیث شریف میں ہے کہ جس نے عید کی رات کو زندہ رکھا حق تعالی اس کے قلب کو اس دن زندہ رکھیں گے جب قلوب مر جائیں گے (سنن ابن ماجہ ص ۱۲۸، ورواہ المنذری فی الترغیب ج ۲ ص ۱۵۲) یہ کمائی کی رات ہے جتنی دیر خدا توفیق دے اس رات کو عبادت میں صرف کرے، اللہ تعالی جو کچھ کہا سنا گیا اس پر عمل کی توفیق نصیب فرمائے، آمین۔

۞۞۞۞۞

درس نمبر ۲۸ سے حاصل ہونے والی ۱۱۱ اہم ہدایات

(۱) آپ ﷺ کا ارشاد کہ اگر غیر اللہ کو سجدہ کی اجازت ہوتی تو میں عورتوں کو حکم کرتا کہ شوہروں کو سجدہ کرے اس سے شوہر کے مقام کا پتہ چلتا ہے۔

(۲) مبشر کو انعام دینا سنتِ انبیاء ہے۔

(۳) ’’فاطر السمٰوات والارض، انت ولی فی الدنیا والاخرة توفنی مسلما والحقنی با لصلحین ‘‘، یہ حسن خاتمہ کی دعا ہے، حسنِ خاتمہ کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی دعا نہیں، امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ میں اکثر اس کا ورد رکھتا ہوں اللہ تعالی ہر مسلمان کو اس کا ورد رکھنے کی توفیق نصیب فرمائیں۔

(۴) ہر مسلمان والدین کو اپنی اولاد کی دین کی فکر سب چیزوں سے زیادہ ہونی چاہئے جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام کو فکر تھی۔ آج کل اس معاملہ میں بہت زیادہ تساہل برتا جارہا ہے۔

(۵) غم بغیر ہاتھ پیر والا جانور ہے مگر بڑے سے بڑے جسم والے انسان کو ہضم کرجاتا ہے۔

(۶) دنیا کی ہر حالت ختم ہوجانے والی ہے لہٰذا بڑے سے بڑے مشکل حالات پیش آجائے تو مایوس نہیں ہونا چاہئے اوراسی کے ساتھ ’’ان مع العسر یسرا ‘‘، کی آیت بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے۔

(۷) اپنوں کی طرف سے بھی حالات پیش آتے ہیں جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے بھائیوں سے حالات پیش آئے۔

(۸) اگر صبر وتقوی کی دولت اس دنیا میں کسی سعادتمند کو نصیب ہوجائے تو اس سے بڑھ کر کوئی بادشاہ نہیں۔

(۹) غصہ کو دور کرنے کا ایک عمل یہ ہے کہ آدمی یہ سوچے کہ جو معاملہ حق تعالی کا میرے ساتھ ہے مجھے بھی اپنے چھوٹوں کے ساتھ وہی معاملہ کرنا چاہئے اور ہر آدمی جانتا ہے کہ حق تعالی کا معاملہ اس کے ساتھ عفو ودرگذر اور شفقت ورحمت کا ہے۔

(۱۰)صحیح نیت سے دنیا بھی دین بن جاتی ہے، ہر مسلمان کو اس چیز کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱۱)انسان کو سب کچھ مل جائے مگر وہ حسنِ خاتمہ کی بھیک کا محتاج ہے۔

ضمیمہ

درس نمبر (۲۹)

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم، امابعد!

فاعوذ بالله من الشیطن الرجیم ، بسم الله الرحمن الرحیم☆

الر تلک آیٰت الکتاب المبین. صدق الله العظیم

حروفِ مقطعات کی حقیقی مراد حق تعالیٰ شانہٗ ہی جانتے ہیں

بزرگانِ محترم! کل یہ گفتگو چل رہی تھی کہ یہ حروف حروفِ مقطعات کہلاتے ہیں اوران کومتشابہات سے تعبیر کرتے ہیں (تفسیر محمود ج۱ص۱۴۰) اوران کی حقیقی مراداور حقیقی مفہوم حق تعالیٰ شانہٗ ہی جانتے ہیں اور حق تعالے کے علاوہ مخلوق اس کے معانی پر مطلع نہیں ہے۔

حروف مقطعات کی مجموعی تعداد چودہ ہیں

حروف مقطعات قریباً چودہ ہیں (تفسیرِ عزیزی اردو، حصہ اول،ص۱۴۷) جوقرآن کریم کی بعض بعض سورتوں کے شروع میں ذکر کئے گئے ہیں وہ چودہ حروف ان کلمات میں ہیں'' نص حکیم قاطع له سر،،حافظ عمادالدین ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ چودہ حروف حروف مقطعات میں موجود ہےاوران کی بڑی بڑی حکمتیں اربابِ تفسیر نے بیان کی ہیں مگروہ علمی چیزیں ہیں وہ آپ حضرات کے بس کی نہیں ہے اس لئے ہم اسکو لپیٹتے ہیں، بہرحال چودہ حروف ہیں اوروہ مختلف انداز سے مختلف سورتوں کے شروع میں ذکر کئے گئے ہیں۔

ذخیرۂ تفاسیر میں حروف مقطعات کے بارے میں دوقسم کی چیزیں ملے گی

یہ بات ذہن میں رہے کہ کتابوں میں تفسیر کا جتنا بڑا ذخیرہ ہےان میں دوقسم کی چیزیں آپ پائیں گے اگرکبھی ترجمہ دیکھنا نصیب ہو جائے تو بعض تفسیروں سے معلوم

ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے کچھ معانی بیان بھی کئے ہیں لوگوں نے سلفِ صالحین صحابہ اور تابعین سے منقول بھی ہے اور یہ بھی آپ دیکھیں گے کہ اللہ جل شانہ کے علاوہ کوئی اس کی مراد کونہیں جانتا، یہ دوقسم کی باتیں آپ کو ملے گی، اب اگر استاد صحیح نہیں ہے تو آدمی کا دماغ چکرائے گا اور وہ سوچے گا کہ یہ عجیب ٹکراؤ والی بات ہے کہ ان کے معانی معلوم بھی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ معلوم نہیں ہے آخر کیا مطلب اس کا، یہ متضاد سی بات ہے۔

لڑکا ''نہ لڑکی

تو اس کا مطلب ایسا تونہیں جیسا جوتشیوں کے یہاں ہوتا ہے کہ ایک آدمی پہنچا کسی جوتشی کے پاس اور اس سے پوچھا کہ گھر میں بیوی حاملہ ہے پیروزنی ہے اسکے امید سے ہے تو اس کولڑکا ہوگا یا لڑکی؟ تو جوتشی نے کہا لڑکا نہ لڑکی (خطبات احتشام الحق) کیوں کہ لڑکا ہوگا تو کہے گا میں نے تو کہا تھا لڑکا'' نہ لڑکی،، اور اگرلڑکی ہوجائے تو وہ اس کے لئے تیار تھے''لڑکا نہیں،، لڑکی، تونہیں کو بیچ میں ایسی پوزیشن میں رکھا کہ اگر موقع آجائے تو ادھر کی لگا دے اور اگر موقع آجائے تو ادھر کی لگا دے تو عوام کی عقیدت ہوتی ہے وہاں تو یہی ہے ان کوتو کوئی چیز مل گئی اسکے پیچھے چل پڑتے ہے۔

عوام کا شعور عجیب ہوتا ہے

ہمارے چچا سناتے تھے کہ تین چار جوان تھے ان کو یہ خیال ہوا کہ لوگوں کو بیوقوف بنائے اور عوام کا شعور عجیب ہوتا ہے انہوں نے کیا یہ کہ چار میں سے ایک نے سوچا کہ میں ایک ڈھونگ رچتا ہوں میں بالکل ننگا ہو جاتا ہوں اور تم تین میری جانب سے ڈیفینس کرنا میری جانب سے مرادات اور مطالب بیان کرنا اور میں صرف اشارات کروں گا اور اس کی تشریح توضیح مطلب وہ سب تم سے متعلق ہوگا، اب وہ چار نکلے اس میں سے ایک بالکل برہنہ اور جا کر ایک لوج میں ٹھہرے اب لوگوں میں چرچا ہوا

کہ چار آدمی آئے ہوئے ہیں ان میں ایک آدمی ہے وہ بالکل ننگے ہے آخر کیا اسکی حقیقت؟ اللہ تعالیٰ کی شان کہ ایک مارواڑی کی گائے گم ہوگئی تھی اس کو پتہ چلا تو یہ سمجھا کہ یہ تو کوئی بہت پہنچے ہوئے باوا معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ جتنا نیا اور جتنا عجیبن ہو وہ بہت پہنچا ہوا سمجھا جاتا ہے وہ آیا انہوں نے پوچھا کیا معاملہ ہے تو کہا میری ایک گائے گم ہوگئی ہے اس کا پتہ ہی نہیں چل رہا ہے اس کی تلاش ہورہی ہے وہ جو ننگا تھا اس نے ایک طرف اشارہ کر دیا اب وہ اس طرف گیا تو ادھر سے گائے آرہی تھی تو اسکی عقیدت اور بڑھ گئی وہ گھر پر آیا اس نے کچھ لڈّو نکالے کچھ چیوڑا نکالا اور بھی کچھ چیزیں نکالی اور خوانچے میں رکھ کر اسکو ان کے پاس لے گیا اور کہنے لگا کہ میری گائے مل گئی ہے تو وہ بھوکے تو تھے ہی اسکے جانے کے بعد انہوں نے برابر ہاتھ صاف کیا۔

(مجالس خطیب الامت ج۱ ص۷۹)

حروفِ مقطعات کے متعلق ایک اہم بات

تو اللہ تعالیٰ کی کتاب کوئی ایسی چیستاں اور کوئی ایسا معمہ نہیں ہے کہ وہ کچھ کا کچھ بتائے اور کہیں کچھ کا کچھ ہو ایسا نہیں ہے اس لئے اس کا مطلب آپ سمجھ لے کہ جہاں آپ کو یہ ملے گا کہ اس کی مراد اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور جہاں آپ کو یہ لکھا ہوا ملے گا کہ یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے تو دونوں میں کوئی ٹکراؤ اور تصادم کی بات نہیں ہے اتنی بات تو ذہن میں رہے کہ حقیقی مطلب جو متعین اور فکس ہو وہ تو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں حق تعالیٰ شانہ کے علاوہ کسی کو اس کی خبر نہیں ہے اسی قول کو زیادہ راجح اور زیادہ پسند کیا گیا ہے اور وہ جو بات آپ سنیں گے یا دیکھیں گے کتابوں میں تو اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ فکس اور متعین مراد سے ہٹکر اشارات کی دنیا ہے تو وہ اشارات کے طور پر لطائف کے طور پر نتائج کے طور پر سبق کے حاصل کرنے کے طور پر بزرگانِ دین

اور صحابہ وتابعین سے منقول ہے اس کے معنی متعین اور فکس نہیں ہے بلکہ ممکن ہے ادھر بھی اشارہ ہو اس درجہ میں وہ بیان کیا گیا ہے لہذا دونوں میں کسی ٹکراؤ اور تصادم کی شکل نہیں ہے حقیقی مطلب کے لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ اس کے معانی اللہ تعالی ہی کو معلوم ہے تو یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے۔

ٹکراؤ جہاں پر ہو وہاں پر مطلب حاصل ہو جاتا ہے

اصل میں ٹکراؤ جہاں پر ہو تو وہاں پر مطلب حاصل ہو جاتا ہے اسی لئے کورٹوں میں جب بحثیں ہوتی ہیں ججمینٹ دینے سے پہلے وکیلوں کے درمیان اس میں زیادہ تر مقدمات میں گفتگو اس پر ہوتی ہے کہ تصادم اور ٹکراؤ ثابت کیا جائے کہ ایک بات میں ٹکراؤ ہو جائے جیسے مثال کے طور پر میں آپ کو ایک واقعہ سناؤں ایک صاحب جنگل میں گئے شکار کرنے اور ریاست کا زمانہ تھا تو شکار میں ان کی گولی ایک گائے کو جا کر لگ گئی اور راجہ تھا ہندو اور ان کے یہاں یہ محترم جانور ہے اور راجہ سے تعلق تھا اس مسلمان کا اور لگی گولی گائے کو اور ان کے کچھ حاسدین تھے تو ان کو خیال پیدا ہوا کہ یہ راجہ کے پاس جا کر میرے خلاف باتیں کریں گے اس لئے انہوں نے یہ چالاکی کی کہ اسی وقت ایک اور دوسرا جانور شکار کیا اور جنگل کھاتہ کے مالک (پردھان) سے جا کر چالاکی کر کے دوسرے شکار کا ٹائم وہی لکھوادیا جس وقت انہوں نے گائے کا شکار کیا تھا انہوں نے جا کر رپورٹ لکھوائی کہ میں نے اتنے بجکر اتنے منٹ پر اس کا شکار کیا ہے اور ہم اس کا چمڑا کانپور کھال کی کمپنی میں بھیج رہے ہیں آپ اس کو لکھ لے چنانچہ افسر نے اس کو لکھا اور ریکارڈ اس کے پاس محفوظ ہو گیا اب جب وہ راجہ کے پاس پہنچے تو مخالفین نے تو راجہ کے کان بھر ہی دیئے تھے، چنانچہ راجہ نے ان سے پوچھا کہ آخر تم نے یہ حرکت کیوں کی، انہوں نے کہا کیسی گائے اور کیسی بات اسنے کہا کہ ہمیں اس قسم کی اطلاع ملی ہے کہ آپ

نے گائے کا شکار کیا انہوں نے کہا کہ آپ انکوائری کر لیجئے ہم نے جنگل کھاتہ کے آفیسر سے سارا ریکارڈ اسی وقت لکھوایا ہے راجہ نے کہا بلاؤ ان کو اس نے آ کر بتایا اور حاسدین پہلے سے کہہ چکے تھے کہ انہوں نے فلاں وقت پہ گائے کا شکار کیا ہے اس نے ریکارڈ پیش کیا اس میں یہ بات تھی کہ انہوں نے اتنے بجکر اتنے منٹ پر فلاں جانور کا شکار کیا اور شکار کرنے کے بعد اس کا چمڑا انہوں نے کانپور فلاں فیکٹری میں بھیجا ہے اب راجہ کی سمجھ میں بات آ گئی تو صورتِ حال یہاں پر یہ تھی کہ باتوں میں ٹکراؤ ہو رہا تھا لیکن انہوں نے اس انداز سے بات پیش کی کہ وہ چل پڑی۔

ایک علمی اشکال اور اس کا حل

تو قرآنِ کریم کے باب میں جہاں کہیں آیتوں کے باب میں یہ چیز ملتی ہے اسکے مفاہیم مستقل بیان کئے گئے ہیں چنانچہ میں اس کی ایک مثال دوں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ ’’الیوم نختم علے افواھھم وتکلمنا ایدیھم ،،(یس،۶۵) آج کے دن ہم لوگوں کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ گفتگو کریں گے اور پیر کلام کریں گے کہ ہم نے یہ یہ گناہ کئے تو معلوم ہوا کہ زبانیں نہیں بولے گی اس پر مہر ہو جائے گی اور زبان بند ہو جائے گی اور دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کہیں گے’’واللہ ما کنا مشرکین،، خدا کی قسم ہم شرک کرنے والے نہیں تھے تو مشرکین کا کلام کرنا بھی ثابت اور مشرکین کے باب میں یہ بھی ثابت ہے کہ ان کی زبانوں پر مہر لگا دی جائے گی اور بول نہیں سکیں گے، تو اس میں تو تصادم اور ٹکراؤ کی شکل ہے، تو حضرت ابن عباسؓ نے اس کا جو مطلب بیان فرمایا وہ یہ ہے کہ شروع میں تو کریں گے وہ انکار اور اسکے بعد جب حق تعالیٰ کی طرف سے ان پر الزام لگایا جائے گا یعنی الزام جو تھا اس کو ثابت کیا جائے گا اور

حجت پیش کی جائے گی تو زبان پر مہر لگادی جائے گی ان کے اعضاء کلام کریں گے تو انکار کا وقت اور ہوگا اور کلام کا وقت اور ہوگا اس لئے کوئی ٹکراؤ اور تصادم کی شکل نہیں ہے، تو حاصلِ گفتگو یہ نکلا کہ حروف مقطعات کے باب میں جہاں یہ آپ کولکھا مل جائے کہ اس کے معانی کو اللہ تعالی کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور جہاں یہ مل جائے کہ اس کے یہ یہ معانی ہے تو جہاں انکار اور نفی ہے وہاں یہ کہ فکس طور پر متعین طور پر قطعی طور پر یقینی طور پر اسکے معانی اللہ تعالی کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جہاں کچھ مطلب بیان کیا گیا ہے وہ ممکن ہے ادھر بھی اشارہ ہو اس درجہ میں بیان کیا گیا ہے لہذا اب کلام میں کوئی ٹکراؤ کی شکل نہیں ہے۔

حروف مقطعات کے بھی معانی بیان کئے گئے ہیں مگر.......

تو ان حروف مقطعات کے بھی معانی بیان کئے گئے ہیں مگر قطعی طور پر نہیں ہے چنانچہ سلف صالحین سے منقول ہے کہ یہ اللہ تعالی کے اسماء ہیں ۔ (البرھان ج ا ص ۲۷۳، اسرار کائنات ص ۲۸۳) اسی لئے حافظ ابن کثیرؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ ''الـم،، اللہ تعالی کے اسماء میں سے ایک اسم ہے (حوالہ بالا) حضرت علیؓ کے باب میں ہے کہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے تو یوں بھی دعا فرماتے کہ ''یا کھیعص ،، گویا یہ اسم من اسماء اللہ حق تعالی کے ناموں میں سے ایک نام ہے، تو سلف کی ایک جماعت ادھر گئی ہے کہ حروف مقطعات اللہ تعالی کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قرآن کریم کے اسماء ہے (تفسیرِ عزیزی ص ۱۵۶) چنانچہ امام فخر الدین رازیؒ نے اپنی تفسیر میں قرآن کریم کے بہت سے اسماء گنوائے ہیں سینتیس تو تقریباً مجھے یاد پڑتے ہیں کہ اتنے اسماء قرآن کریم کے خود قرآن کریم میں موجود ہے جیسے قرآن کریم کا ایک نام ذکر ہے، ایک نام کتاب مبین ہے، ایک نام سبع مثانی ہے وغیرہ وغیرہ تو اس طریقے سے بہت سے نام ہے اور ان سب کی وجہیں بھی

بیان کی گئی ہیں تو یہ جو شروع کے الفاظ ہے یہ اللہ تعالی کے اسماء ہے یہ بھی اقوال ہے ،قرآن کریم کے نام ہے یہ بھی اقوال ہے اور خود سورتوں کے نام ہے یہ بھی کہا گیا ہے۔

بعضے بزرگوں سے منقول ہیں کہ حروف مقطعات میں سبق ہے دنیائے معلمین کے لئے

اور بعضے بزرگوں سے منقول ہیں کہ اس میں سبق ہے دنیائے معلمین کے لئے، وہ کس طرح۔ معلم اور مدرس جب تعلیم دے گا تو پہلے حروف تہجی سے ابتداء کرے گا اور اسکے بعد پھر اس کو جوڑے گا تو اس میں ہجہ کی شکل ہوگی جیسے مثلاً بچے کو آپ قاعدہ پکڑاتے ہے تو وہ پہلے پڑھتا ہے الف اسکے بعد با اور تا اور پھر ثا یہ بے، تے، ثے کی بجائے صحیح با تا اور ثا ہے تجوید کے اعتبار سے یہی صحیح ہے یہ یادرکھنے کی بات ہے، ورنہ یہی پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے بے، تے، ثے نہیں الف با تا ثا صحیح یہ ہے تجوید کے اعتبار سے،تو بہر حال قرآن کریم کے شروع میں ’’الم،، ہے تو اس سے عبدالعزیز ابن یحیی اور بعض دیگر مفسرین نے نکتہ پیدا کیا وہ فرماتے ہیں کہ حروف مقطعات سے بچوں کے لئے طریقۂ تعلیم واضح کردیا گیا یعنی پہلے بچوں کو حروف تہجی پڑھاؤ اور پھر مرکبات پڑھاؤ (تفسیر محمود ج۱ص۱۴۱) تو ’’الـــر،، یہ حروف مقطعات ہے اسمیں ادھر اشارہ ہے کہ دنیائے معلمین یہ سبق حاصل کرے کہ جب بچوں کو تعلیم دی جائے تو پہلے مفرد کی تعلیم ہو اسکے بعد مرکبات کی تعلیم دی جائے یہ بھی گویا انہوں نے اس سے نکالا۔

حروف مقطعات کے کلمات بندوں کے سامنے حق تعالی کی تعریف اور اس کی معرفت کا سامان ہے

یا پھر اس میں یہ بھی حکمت بیان کی گئی ہے کہ الف لام آتا ہے تعریف کے لئے (مسائل النحو والصرف ص۱۰۷) یعنی کسی شئی کو متعین کرنا ہو تو اس صورت میں الف لام

استعمال کیا جاتا ہے جیسے مثلاً عربی میں ایک لفظ ہے ''رجــل،،رجل کہ معنی آدمی کوئی آدمی کوئی انسان کوئی شخص اور جب الف لام داخل کر کے کہے''الــرجل،،تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کوئی فکس آدمی کوئی متعین آدمی تو''رجل،، کے معنی ہے آدمی اور''الرجل،، کے معنی متعین آدمی تو الف لام آتا ہے تعریف کے لئے وہ پہچان کرادیتا ہے وہ معرفت پیدا کروادیتا ہے وہ متعین کردیتا ہے تو''الــر،،اور''الــم،،وغیرہ جو ہے بعض سورتوں کے شروع میں اس میں ادھر اشارہ ہے کہ یہ کلمات بندوں کے سامنے حق تعالی کی تعریف اور اس کی معرفت کا سامان ہے کہ رب العلمین کی معرفت پیدا کی جائے کہ حق تعالی وہ ایک ذات ایسی ہے جس میں فلاں فلاں صفت کمال ہے۔

سارے انسان اسکے مکلّف ہیں کہ اپنے رب کی پہچان حاصل کرے

اور اگر میم کو لیا جائے تو کلام عرب میں میم جمع کے لئے استعمال ہوتا ہے (مسائل النحو والصرف ص۲۷۳) یہ دو چار باتیں ہیں اس کے بعد گفتگو آسان کردیں گے آپ سوچ رہے ہوں گے خدا جانے کس چیز کا سبق شروع کردیا اس میں بھی بڑی دلچسپی اور بڑا اسبق ہے بشرطیکہ غور سے سنو،تو میں یہ عرض کررہا تھا کہ الف لام آتا ہے تعریف کے لئے اور میم آتا ہے جمع کے لئے جیسے عربی میں کہتے ہے **ھو** ایک **ھـما** یعنی وہ دو مرد اور **ھم** یعنی وہ سب تو میم جمع کے لئے آتا ہے جیسے کہا جاتا ہے **السلام علیکم** یا **وعلیکم** تو میم کے اندر مفہوم ہے جمع کا جوڑ کا مفہوم تو عارفین یہ لکھتے ہیں کہ الف لام تو تعریف کے لئے کہ گویا خدا کی معرفت اور پہچان کروادی جائے اور خدا کی پہچان خدا کی اس کتاب کے ذریعہ سے کوئی دو چار آدمیوں کو کروانا مقصود نہیں ہے میم جمع کے لئے آتا ہے گویا تمام مخلوق کو خدا کی معرفت ہوجائے اور سارے انسان حق تعالی کی معرفت سے روشناس ہو جائے تو ساری انسانیت کو جمع کرنا اور بتانا ہے کہ سارے انسان اسکے مکلّف اور پابند ہیں

کہ اپنے رب کی پہچان حاصل کرے تو کتاب تو اسی لئے بھیجی گئی تا کہ خدا کی معرفت ہو خدا کی پہچان ہو اور آدمی اسکی ذات کو سمجھے اسکی صفات کے ذریعہ۔

حروف مقطعات سے ان چیزوں کی طرف بھی اشارات ہو سکتے ہیں

یا اس سے اللہ تعالیٰ کی صفات کی طرف اشارہ ہے جیسے مثلاً الف کا لفظ ہے تو وہ پتہ دیتا ہے اعلاء اللہ کی طرف اعلاء عربی میں کہتے ہیں نعمتوں کو پھر لام کا لفظ ہے تو وہ پتہ دیتا ہے لطف اللہ کی طرف کہ اللہ کی لطف وعنایتیں لوگوں کے ساتھ ہیں پھر میم ہے اس سے مجد کی طرف اشارہ ہے کہ مجد اسکی صفت ہے تو حق تعالیٰ کی طرف سے بزرگی بھی ملتی ہے اور لطف وکرم بھی ملتا ہے عنایتیں اور عطائیں بھی نصیب ہوتی ہیں تو ان چیزوں کی طرف گویا اشارہ کیا گیا ہے یا مثلاً الف سے اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف اور لام سے اشارہ ہے جبرئیل کی طرف اور میم سے اشارہ ہے محمد کی طرف اگر ''الم،، ہو اور یا یہ کہ الف سے اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف کہ اللہ تعالیٰ نے علم وحکمت کی یہ کتاب بھیجی لام سے اشارہ جبرئیل کی طرف کہ وہ لیکر چلے ہیں اس علم کو اور میم سے اشارہ ہے محمد امین کی طرف کہ ان پر حق تعالیٰ کی طرف سے یہ علوم پہنچے ہیں تو جہاں سے چلا ہے اسکی طرف بھی اشارہ اور جو لانے والے ہیں اسکی طرف بھی اشارہ اور جس کی جانب بھیجا گیا ان کی طرف بھی اشارہ تو گویا'' الم ،، سے اس حقیقت پر بھی آدمی کو اطلاع ہوتی ہے کہ گویا ادھر اشارہ کیا گیا ہے۔

الله اعلم بمراده بذلک کا مطلب

اور صاحب جلالین لکھتے ہیں کہ ''الم،،الله اعلم بمراده بذلک،، اسکی مراد اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں اور اس جملہ کا مطلب بھی آپ سمجھ لیں، دیکھئے دو چیزیں ہیں ایک ہے آدمی کی اپنی معرفت و پہچان اور ایک ہے بندے کو اپنے رب کی پہچان ومعرفت دو الگ الگ چیزیں ہیں تو جب یہ کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا معنی جانتے ہیں یعنی فکس

طور پر اور متعین طور پر تو اب اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے سے علم کی نفی کرتا ہے کہ مجھے علم نہیں جیسے کل میں نے ذکر کیا تھا کہ حضرت موسی علیہ السلام کو محض اس بات پر سفر کرایا گیا اور منزل تک پہنچ نے سے ان کو ناواقف رکھا گیا اور اس میں بھی ایک بات یہ بتانی رہ گئی تھی کہ حضرت خضرؑ کے پاس جب حضرت موسی علیہ السلام پہنچے ہیں اور پہنچنے کے بعد ساری گفتگو ہوئی تو حضرت خضرؑ نے فرمایا کہ ''انک لن تستطیع معی صبرا ''، (کہف، ۶۷) تم میرے ساتھ صبر نہیں کرسکو گے تمہارا علم تشریع اور شریعت کا ہے اور میرا علم تکوین اور اسرار کا ہے دونوں کی دنیا الگ ہے تو اس کے جواب میں حضرت موسی علیہ السلام نے فرمایا کہ انشاء اللہ میں صبر کروں گا، خیر جب وہ چلے ہیں تو انہیں ایک کشتی ملی انہیں دریا کے پار جانا تھا کشتی والے حضرت خضرؑ کو پہچانتے تھے انہوں نے ان کو بٹھالیا جب کشتی میں دونوں حضرات بیٹھے ہیں تو ایک چڑیا آئی اور آنے کے بعد اس نے اس سمندر میں اپنی چونچ ڈالی اور اس سے پانی پیا تو حضرت خضرؑ نے حضرت موسی علیہ السلام سے یہ بات فرمائی کہ اے موسی! حق تعالی کا علم اور بندوں کا علم اس کو ایسا سمجھ لے۔ (گلدستۂ تفاسیر ج۴ص ۳۴۴) اور یہ بھی سمجھانے کے لئے ہے ورنہ یہ بھی نسبت کچھ بھی نہیں ہے کہ اتنے عظیم بڑے سات سمندر کے مقابلے میں یہ چڑیا کی چونچ میں جتنا پانی لگا ہے اور آیا ہے اس پانی کو اس بڑے سمندر سے جو نسبت ہے انسانی علم کو خدائی علم سے وہ نسبت بھی نہیں ہے۔ (مشارق الانوار ج۲ص ۲۱۱) کہ خدا تعالی کا علم لامحدود ہے اس کے سامنے بندے کے علم کی کوئی حیثیت نہیں اب جو کشتی چلی تو حضرت خضرؑ نے کشتی کا تختہ ہی توڑ دیا حضرت موسی علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ بھی عجیب آدمی ہے کہ بے چاروں نے ہمارے ساتھ احسان کیا کہ بغیر کرایہ لئے ہم کو کشتی میں سوار کیا اور آپ نے یہ ستم کیا کہ کشتی کا تختہ توڑ دیا پھر جب بعد میں وجہ بیان کی گئی ہے تو بڑی شاندار وجہ فرمایا کہ پیچھے ایک ظالم بادشاہ تھا تو مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ وہ صحیح سالم کشتی کو پکڑتا (چھین لیتا) تھا اور جو

کشتی عیب دار ہو وہ اس کو چھوڑ دیتا تھا اس سے تعرض نہیں کرتا تھا تو میں نے یہ سوچا کہ اس کشتی کا تختہ توڑ دوں تا کہ کشتی عیب دار ہو جائے اور جب کشتی عیب دار ہو گی تو وہ اس سے تعرض نہیں کرے گا اسی حقیقت کو حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم نے سمجھا ہے کہ اپنے اصول میں یہ لکھا کہ مدرسہ (دارالعلوم دیوبند) کا دارومدار کسی ایک سیٹھ پر نہ ہو بلکہ عوام اور غریبوں کے چندے پر ہو گویا مالی اعتبار سے اور اقتصادی اعتبار سے دارالعلوم کی یہ کشتی کا تختہ ٹوٹا رہے تا کہ اسکے پیچھے جو ایک ظالم بادشاہ تھا جو برباد کرنا چاہتا تھا مدرسہ کو اسکے ضرر سے اس دارالعلوم کی کشتی کو محفوظ رکھا جائے تو بجائے اسکے کہ اقتصادی پوزیشن اور مالی حالت مضبوط کی جائے غریب عوام کے چندے پر اس کی بنیاد رکھی گئی تا کہ اس ظالم کے شر سے بچے یہ سبق حضرت نے اس سے نکالا، تو بہر حال مجھے تو اس سے یہ بتانا ہے کہ خدا تعالیٰ کے علم کے سامنے بندوں کے علم کی کوئی حیثیت نہیں تو یہاں فرمایا ’’الله اعلم بمراده بذلک،، اللہ تعالیٰ ہی اسکی مراد کو جانتے ہیں۔

لا اعلم بھی علم ہے

اس سے معلوم ہوا کہ ہم نہیں جانتے اور جب ہم نہیں جانتے تو یہ اپنی معرفت اور اپنی پہچان ہے اس لئے کہ ایک ہے آدمی کا اپنے بارے میں یہ سمجھنا کہ میں جانتا ہوں یہ بھی ایک علم ہے، آدمی کا اپنے باب میں یہ سمجھنا کہ میں نہیں جانتا ہوں یہ بھی علم ہے یعنی اپنے نہ جاننے کا علم حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ ’’لا اعلم،، بھی علم ہے یعنی میں نہیں جانتا ہوں یہ بھی علم ہے دیکھئے اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے نہ جاننے کا علم ہے، دیکھئے ایک آدمی سویا ہوا ہو یا نشہ کی حالت میں کھویا ہوا ہو اس کو تو یہی پتہ نہیں ہوتا کہ میں جانتا ہوں کہ نہیں جانتا ہوں اس کو تو جاننے نہ جاننے سے کوئی بحث ہی نہیں ہے سونے والے کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ میں سو رہا ہوں اسے یہ معلوم ہو جائے کہ میں سو رہا ہوں تو ڈر کے خواب سے لرزنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ تو آنکھ کھولتا ہے تو سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا

شکر ہے کہ جان میں جان آئی ورنہ آبنی تھی تو نہ جاننے کا علم بھی ایک علم ہے تو اس سے دو فائدے حاصل ہوئے ایک فائدہ تو یہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالی ہی اسکی مراد جانتے ہیں میں نہیں جانتا یعنی مجھے اپنے نہ جاننے کی معرفت ہے کہ جہل میرے اندر موجود ہے علم میرے اندر موجود نہیں ہے اور دوسرے حق تعالی کی معرفت کہ تمام علوم حق تعالی کو حاصل ہے تو اب آپ ذرا غور فرمائیں کہ ''الــم،، کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ سیوطیؒ یہ لکھ رہے ہیں کہ ''اللہ اعلم بمرادہ بذلک،،، اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نہیں جانتا حق تعالی جانتے ہیں اور میں جو نہیں جانتا ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اپنی معرفت ہوگئی اور خدائے پاک جانتے ہیں تو خدا تعالی کی معرفت اور پہچان ہوگئی تو شریعت کی تمام تعلیم کا خلاصہ یہی ہے کہ بندہ اپنے رب کو بھی پہچان لے اور اپنے کو بھی پہچان لے جب اس نے یہ جملے کہے کہ اللہ تعالی ہی اسکی مراد جانتے ہیں تو اس سے یہ مطلب نکلا کہ وہ اپنے کو بھی پہچانتا ہے کہ میں نہیں جانتا اور رب کو بھی پہچانتا ہے کہ اس کا مطلب اللہ تعالی جانتے ہیں اور جس نے اپنے کو پہچان لیا اور جس نے خدا کو پہچان لیا اس نے سارے علوم حاصل کر لئے تو کمال کی بات یہ نکلی کہ وہ اپنی لاعلمی کا اظہار کرتا ہے، مگر اس کے اندر یہ نتیجہ چھپا پڑا ہے کہ مجھے اپنی معرفت بھی ہوگئی کہ میں نہیں جانتا اور اپنے رب کی معرفت و پہچان بھی ہوگئی کہ میرا رب جاننے والا ہے تو وہ کہہ تو رہا ہے کہ میں نہیں جانتا مگر یہ جملہ کتنا مبارک ہے کہ اسکے نیچے اتنا بڑا علم چھپا پڑا ہے۔

انسان کی حقیقت لاعلمی ہے

تو انسان کی حقیقت لاعلمی ہے اسی لئے قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ ''واللــــہ اخرجکم من م بطون امھتکم،، حق تعالی نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا ''لا تـعـلـمون شیئا،، کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے تو حق تعالی بھی یہی خبر دے رہے ہیں کہ نہ جاننا تمہاری صفت ہے تم کچھ نہیں جانتے۔

یہ ہیں اسبابِ علم

اور پھر فرمایا کہ ''وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ،،(نحل،۷۸)اللہ تعالی نے تمہارے لئے کان بنائے کہ تم سن سن کر علم حاصل کرو جیسے اس وقت آپ سن رہے ہیں اور علم حاصل کررہے ہیں تو بعض سننے والے تو وہ ہے جو سن کر علم حاصل کرتے ہیں اور بعض سن سن کر سُن ہو جاتے ہیں کچھ بھی پتہ نہیں چلتا، تو غرض یہ کہ سن سن کر علم حاصل کرو''والابصار،،اور آنکھیں بنائیں کہ دیکھ دیکھ کر علم حاصل کرو''والافئدۃ،، اور دل بنایا کہ تم فکر سے کام لو اور سوچ بچار سے کام لو تو تمہیں علم حاصل ہوگا کہ ایک بات سے دوسری بات اور دوسری بات سے تیسری بات تو اس طرح علم کا سلسلہ چل پڑے گا تو تم نہیں جانتے تھے اللہ تعالی نے تمہارے لئے اسبابِ علم پیدا فرمادیئے یہ بات اللہ تعالی نے فرمائی۔

انسان عدیم العلم ہے ابتداء میں بھی اور انتہاء میں بھی

ایک دوسرے مقام پر فرمایا کہ ''ومن یرد الی ارذل العمر لکیے لا یعلم بعد علم شیئا،،(نحل،۷۰) خدا تعالی جسکو ارذل عمر کی طرف پہنچا دے جو رڈی عمر ہے تا کہ وہ نہ جانے جاننے کے بعد اب بوڑھا ہوتا ہے جب بھی نہیں جانتا اسکے کان کی کیفیت یہ ہے کہ کچھ کہو تو وہ کہے گا نی منے نتھی سانبھراتوں (مجھے نہیں سنائی دیتا) اسکے سامنے زور سے چلائیں گے تو وہ کہے گا ہاں اب کچھ سمجھ میں آیا اب سامنے کوئی آیا اسنے کہا تم مجھے پہچانتے ہو تو وہ دیکھ کر کہے گا کہ نہیں سمجھ میں آرہا پھر زور سے چلائیں گے تو بڑی مشکل سے کچھ سمجھ میں آئے گا اور رہا اندر تو اندر ضعف کا یہ عالم ہے کہ سوچ بچار کی بھی طاقت نہیں ابھی ایک بات کہی تو دومنٹ میں بھول گئے پھر کوئی بات کہی تو دومنٹ میں بھول گئے ایک بڑے میاں تھے انہوں نے اپنے بیٹے سے کوئی بات پوچھی اسنے بتادی پھر پوچھی پھر بتادی اب

جو دریافت کیا تو بڑے میاں پر بچہ غصہ ہوا کہ اباتم بات کی طرف کچھ دھیان ہی نہیں دیتے ہو بات کو یاد ہی نہیں رکھتے ہو کتنی دفعہ میں کہوں تب باپ نے کہا کہ جب تو چھوٹا تھا تو ایک ایک جملہ کو تو نے بائیس بائیس دفعہ پوچھا ابا یہ کیا ہے ابا یہ کیا ہے اور میں تجھے بتاتا تھا اور تیری ناراضگی پر تیرا ہاتھ چوم لیتا تھا اب جب میں بوڑھا اور کمزور ہو گیا ہوں تو تو میرے دو دفعہ پوچھنے پر غضبناک ہوتا ہے، تو مجھے یہ بتانا ہے کہ ضعف کی وجہ سے اندر کا حافظہ بھی کمزور قوتِ فکر یہ بھی کمزور تو ابتداء میں نہیں جانتا تھا اخیر میں بھی کیفیت نہ جاننے کی ہوئی بقول حضرت حکیم الاسلامؒ کہ انسان ابتداء میں عدیم العلم ہے کہ علم اسکے پاس نہیں ہے اور اخیر میں بھی علم نہیں ہے تو وہ شروع میں بھی بے علم ثابت ہوا اور اخیر میں بھی بے علم ثابت ہوا۔

درمیان میں قلیل علم کے ساتھ غلط فہمی بھی لگی ہوئی ہے

اور درمیان میں انسان کو جو علم ہے تو جیسا ابھی آپ نے حضرت خضرؑ کا قول سنا کہ چڑیا کی چونچ میں جو پانی سمندر سے آیا ہے اس کو سمندر سے جو نسبت ہے یہ بھی فرمایا سمجھانے کے لئے تو درمیانی علم بھی قلیل ہے فرمایا کہ ”وما اوتیتم من العلم الا قلیلا“ (بنی اسرائیل، ۸۵) تو علم انسانوں کا قلیل ہے بہت تھوڑا جس میں مومن بھی کافر بھی مشرک بھی چھوٹے بھی بڑے بھی شہری بھی دیہاتی بھی سب شریک ہیں اور وہ علم قلیل ہے تھوڑا علم قرار دیا گیا پھر قلیل علم کے ساتھ ساتھ غلط فہمی بھی لگی ہوئی ہے کہ کسی نے پوچھا کچھ اور جناب سمجھے ہے کچھ، یہ کہنا چاہتے ہے کچھ اور وہ اس کا منشا سمجھ رہے ہے کچھ جیسے ایک ماں نے اپنے بیٹے سے پوچھا کہ بیٹا الماری میں دو بسکٹ رکھے تھے تو ایک کیسے رہ گیا تو ماں کا منشا یہ تھا کہ تم نے ایک غائب کیا کیوں؟ ایسی حرکت کیوں کی، تو بچہ جواب میں کہتا ہے کہ اندھیرے کی وجہ سے مجھے دوسرا نظر نہیں آیا، تو ماں کا منشا تو یہ تھا کہ تم نے ایک بسکٹ

کھا کیوں لیا ایک کیسے رہا اور وہ حضرت یہ فرمار ہے ہے کہ اندھیرے کی وجہ سے دوسرا نظر نہیں آیا اگر دوسرے کو دیکھ لیتا تو وہ بھی صاف ہو جاتا لہذا شکر کرو کہ ایک تو باقی رہ گیا، تو بچہ ایک اور انداز سے بات کہنا چاہ رہا تھا اور ماں کا منشا کچھ اور ہے تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے، تو انسان عدیم العلم ہے اول بھی اور آخر بھی دونوں حالتوں میں علم نہیں ہے اور بیچ میں قلیل العلم ہے اور پھر اس میں بھی غلط فہمی ساتھ لگی ہوئی ہے معلوم ہوا کہ اس کا علم بیمار بھی ہے، تو شروع میں وہ لاعلم ہے ابتدائی حالت، بعد میں لاعلم ہے وہ انتہائی حالت ہے، درمیان میں تھوڑا اور قلیل العلم ہے اور اس کے ساتھ غلط فہمی لگی ہوئی ہے، تو اس کا علم بیمار بھی ہے، اب آپ بتائیے کہ جو شروع میں جاہل ہو اور اخیر میں جاہل ہو اور درمیان میں علم رکھتا ہو تو تھوڑا رکھتا ہو اور وہ بھی بیمار قسم کا علم رکھتا ہو ایسے انسان کے لئے فخر کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ اپنے علم پر ناز کرے اور اپنے کو ''اعلم،، کہے اسی لئے جو شخص اپنے علم پہ ناز کرتا ہے اس سے بڑا کوئی جاہل نہیں اس لئے کہ حقیقی علم اللہ تعالی کے لئے ہے اور انسان کی تو ساری چیزیں محدود ہے۔

علماء قانون داں ہے، قانون ساز نہیں

دھولیہ میں میرے پاس کچھ پروفیسر آئے اور آنے کے بعد انہوں نے کچھ اشکالات کئے اور مقصد اشکال حل کرنا نہیں تھا مجھے ناپنا تھا کہ دیکھے یہ کتنے پانی میں ہے وہ مجھے جانچنا اور ناپنا چاہتے تھے تو سب سے پہلے تو میں نے ان سے یہ کہا کہ آپ جو حکمت پوچھنا چاہتے ہیں کہ یہ مسئلہ ایسا کیوں ہے اور یہ مسئلہ ایسا کیوں ہے اس سوال کا آپ کو کوئی حق نہیں ہے اور پھر میں نے ان کو ایک مثال دی، میں نے کہا دیکھو! ایک ہے قانون کا جاننے والا اس کو قانون داں کہتے ہے اور ایک ہے قانون کا بنانے والا وہ قانون ساز کہلاتا ہے مثال کے طور پر کوئی حکومت کا آدمی کسی آدمی کو کسی بات پر پکڑے اور یہ

کہے کہ تم نے یہ غلط کام کیا ہے یہ حکومت کے قانون کے خلاف ہے، اب وہ آدمی اس فوجدار یا حوالدار یا معاملات دار سے پوچھے کہ آپ یہ کہہ رہے ہے کہ یہ قانون کے خلاف ہے تو یہ قانون کیوں بنا ہے، تو وہ اس سے یہی کہے گا کہ یہ قانون کیوں بنا ہے وہ پارلیمینٹ میں بیٹھنے والے دماغ سے پوچھو اس کا ذمہ دار میں نہیں ہوں، میں تو قانون جانتا ہوں قانون بتانا میرا کام ہے، میں نے ان سے پوچھا یہ بات آپ مانتے ہیں کہ نہیں، تو وہ کہنے لگے کہ آپ کی بات بالکل صحیح ہے، تو میں نے کہا ایک ہے قانون داں یعنی قانون کا جاننے والا جو قانون بتاتا ہے اور ایک ہے قانون ساز یعنی قانون بنانے والا جو قانون تیار کرتا ہے، تو میں نے کہا بنیادی غلطی آپ کی یہ ہے کہ قانون شرعی بنانے والے حق تعالی ہے اور نبی کریم ﷺ اس کی ترجمانی فرماتے ہیں تو قانون بنانے والے وہ اور علماء تو قانون بتلانے والے ہیں جیسے مثلاً فوجدار نے قانون بتایا پولیس نے قانون بتایا تو جو قانون بنانے والا ہے اس کا کام آپ اس سے لینا چاہتے ہو جو قانون بتانے والا ہے یہ آپ کی پہلی بنیادی غلطی ہے جسے آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا تو وہ ذرا سنبھل کر بیٹھے۔

انسانی علم کی حقیقت ایک مثال کے ذریعہ سے

اسکے بعد پھر میں نے ان کو مثال دے کر سمجھایا، میں نے کہا دیکھو یہ ہے انسانی حقیقت دیکھئے آپ کا وجود ہے یہ آپ میرے سامنے کھڑے ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ چھ طرف سے نہیں ہے اور بیچ میں ہے کہنے لگے کیسے، میں نے کہا ایسے جیسے یہ قلم ہے میں نے ان کو قلم دکھلا کر کہا اس کے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ چھ طرف سے نہیں ہے اور درمیان میں ہے میں نے کہا یہ بات آپ مانتے ہیں یا نہیں، کہنے لگے ہاں مانتے ہیں ان کی سمجھ میں بات آ گئی، تو میں نے کہا جب انسان کا اور مخلوق کا یہ حال ہے کہ اس کا جو موصوف ہے وہ چھ طرف سے نہیں اور بیچ میں ہے تو اسکی صفت کا بھی یہی حال

ہے (مجالس خطیب الامت ج۱ص۱۷۱) مثلاً آپ سائنس کے پچاس مسئلے جانتے ہیں اب اکیاونواں (۵۱) مسئلہ کوئی آپ سے پوچھے تو آپ کہیں گے آئی ڈونٹ نو تو منے چونٹ نو یعنی میرے پیچھے مت پڑو مجھے پریشان مت کرو، تو غرض یہ کہ یہ کیفیت ہے یا مثلاً کوئی اور چیز ہے تو آپ کا علم ایک حد تک چلے گا اس کے بعد کسی نے کوئی سوال کیا جو آپ کی لیمیڈ سے باہر ہے تو آپ کہیں گے میں اس کو نہیں جانتا، تو معلوم ہوا کہ محدود دائرہ ہے اور شریعت اس ذات عالی کی طرف سے چلی ہے جس کے علوم کی کوئی انتہا نہیں ہے تو اس کو کیسے پاسکیں گے، آج اسی پر اکتفاء کریں مزید کچھ باتیں ان شاء اللہ کل عرض کریں گے، دعا کیجئے اللہ تعالی توفیقِ عمل دیں۔ آمین۔

۞ ۞ ۞ ۞ ۞

درس نمبر ۲۹ سے حاصل ہونے والی سات اہم ہدایات

(۱) عوام کا شعور عجیب ہوتا ہے جتنا نیا اور جتنا عجیب ہو اس کو وہ بہت پہنچا ہوا سمجھتے ہیں حالانکہ اصل معیار اتباعِ سنت ہے۔

مپندار سعدی کہ رہ صفا توان یافت جز بر پئے مصطفے
خلاف پیمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

نقشِ قدم نبی کے ہیں جنت کے راستے
اللہ سے ملاتے ہیں سنت کے راستے

(۲) حروف مقطعات کے باب میں جہاں یہ لکھا ہوا ہو کہ اسکے معانی کو اللہ تعالی کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور جہاں یہ لکھا ہوا مل جائے کہ اس کے یہ یہ معانی ہے تو جہاں انکار اور نفی ہے وہاں یہ کہ فکس طور پر متعین طور پر اسکے معانی اللہ تعالی کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جہاں بیان کئے گئے وہ لطائف اور اشارات کی بنیاد پر ہے۔

(۳)حروف مقطعات میں دنیائے معلمین کے لئے ایک سبق ہے کہ معلم جب تعلیم دے تو پہلے حروف تہجی سے ابتداء کرے اور اسکے بعد پھر اس کو جوڑے۔

پہلے الف اسکے بعد با پھر تا اور پھر ثا یہ بے، تے، ثے کی بجائے صحیح جو ہے با او رتا اور ثا ہے، یہ یاد رکھنے کی بات ہے۔

(۴)حروف مقطعات کے کلمات بندوں کے سامنے حق تعالی کی تعریف اور اس کی معرفت کا سامان ہے کہ رب العلمین کی معرفت پیدا کی جائے کہ حق تعالی وہ ایک ایسی ذات ہے جس میں فلاں فلاں صفت کمال ہے۔

(۵)''لا اعلم،، بھی علم ہے۔ مگر آج اس کا اقرار کرنا اور یہ جملہ زبان سے کہنا اسکو آدمی اپنے لئے معیوب سمجھتا ہے۔ اس سوچ سے باہر آنے کی ضرورت ہے۔

(٦) انسان کی حقیقت لاعلمی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس بات کی حقیقت سے بھی بہت سے لوگ ناواقف ہے۔

(۷) علماء قانون داں ہے، قانون ساز نہیں۔ افسوس کہ آج بہت سے لوگ قانون داں سے قانون ساز کا کام لینا چاہتے ہیں، معلوم ہوا یہ ان کی پہلے درجہ کی حماقت ہے۔